# زمین کا نوحہ

(ایٹمی جنگ کے خطرے اور تباہ کاری کے حوالے سے ادبی انتخاب)

مرتبہ:
ضمیر نیازی

# زمین کا نوحہ

ایٹمی جنگ کے خطرے اور تباہ کاری کے

حوالے سے ادبی انتخاب

مرتّبہ

ضمیر نیازی

# ترتیب

## حصہٴ اوّل
## جوہرِ اندیشہ



## حصہ دوئم
## ہیروشیما سے پہلے ہیروشیما کے بعد

## حصہ سوئم

# پوکھرن اور چاغی

# حصہ اوّل

# جوہرِ اندیشہ

اسد محمد خان

# مناجات

یا دافع الاشرار!
ہمیں کافروں کے شر سے محفوظ رکھ
کسی بھی مشرک، ملحد، زندیق، غیر مقلد، غیر کفو کے روبہ رو خجل نہ ہونے دے
ہمیں سرخروئی عطا فرما۔
مولا! اب تو کچھ ایسا ہو کہ ایک فزی سست ہماری ہی صفوں سے اٹھے جو کھڑے ہو کر
سلام پڑھتا ہو۔
کہ جیبوں میں ڈھیلے لے کر چلتا ہو۔
جو اسٹاکہوم کے چورستوں میں قینچیاں مارے
کہ مشرکینِ بیرونی اور کفّارِ مقامی کا پتا پانی ہووے۔

بار الٰہا!
کچھ ایسا ہو کہ فلاں فلاں ملک کی مثال ہم پٹرول سے اور بے شمار معدنیات سے مونہا
منھ بھر جائیں۔
تا کہ ہم روزناموں کی شہ سرخیوں میں
تا کہ ٹیلی وژن کی اسکرینوں پر
تا کہ یونی ورسٹیوں میں
تا کہ چورستوں، ہوائی اڈوں پر

تاکہ ڈاک کے ٹکٹوں پر
ہم آرام سے تیرے نام کا بھنگڑا ڈال سکیں
اور ملحدوں کافروں مشرکوں کی بستیوں کی جانب منھ پر کلائیاں رکھ کر آرام سے بکرا
بُلا سکیں۔

یا نافع الانعام!
ہمارے بکرے جوع البقر سے
ہماری گائیں گھوڑوں سے
ہمارے گھوڑے اصطبلوں سے
ہماری اصطبل کتابوں سے معمور رہیں
اور اس معمورے میں ہماری بڑھکوں کے سوا کان پڑی آواز نہ سنائی دے، آمین۔
(اور اگر یہ سب مناسب نہ ہو تو)
اے صاحب الکلام!
وہ ترے نام کا زرمبادلہ بلند کرنے اپنے گھروں سے نکلے ہیں......
اپنی نصرت بھیج
ہمارے قوالوں کے حلق کشادہ کر
ہمارے ڈوم ڈھاڑیوں کو زمین پر پھیل جانے کا اذن دے۔

یا صاحب الجنود! یا فاتح الہنود والیہود!
ہمارے کھلاڑیوں ہی کو ہر نوع کی سربلندی عطا کر
کہ اب تو وہی ہمارا اثاث البیت ہیں
اور اے مالک الجندل!
ہمارے دشمنوں کو اب اندر سے سنگسار فرما



ان کی میانیوں میں برف باری کر، دھماکے فرما

اور ہاں اے مالک الملک!
ہونہ ہو یہ شخص ام خ دل آزار آدمی ہے
کہ برابر لکھ لکھ کے دل آزاری کا ارتکاب کیے جاتا ہے
پس اے لایزال، اے لامکان، اے لازمان
الامان! الامان! الامان!

ضمیر نیازی

# اگر ذرّے کا دل چیریں

کولہو اور جوہری توانائی: راجستھان کے صحرائے تھر کے ایک نیم کچے گھر میں ایک کولہو ہے، جہاں تل، رائی، بنولے اور سرسوں کا تیل ضرورت کے مطابق پیلا جاتا ہے۔ چند ہزار نفوس پر مشتمل آبادی والے اس علاقے میں تیل کا غالباً یہ واحد ''کارخانہ'' ہے، جسے ایک بیل سینکڑوں میلوں کی مسافت طے کر کے آس پاس کی آبادی کے لیے مہیا کرتا ہے۔ (۱)

سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی اس ''کارخانے'' میں زندگی کے آثار نمودار ہونے لگتے ہیں۔ صفائی اور ستھرائی کے بعد، جو کولہو کے مالک عبدالشکور کی بیوی اور دو بیٹیاں انجام دیتی ہیں، باہر سے بیل کو ہانک کر لایا جاتا ہے اور پھر اس کی آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھ دی جاتی ہے۔ انسان بھی کیا خودغرض جانور ہے۔ اپنی مطلب براری کے لیے کیا کیا سوانگ رچاتا ہے اور کیسے کیسے شعبدے کرتا ہے۔ یہ اور اس جیسے ہزاروں، بلکہ لاکھوں بیل ہندوستان کے چپے چپے پر لاکھوں میل کی مسافت روزانہ طے کرتے ہیں اور شام ڈھلے جونہی پٹی کھلتی ہے اپنے آپ کو اسی مقام پر پاتے ہیں۔ اس پر یاد آیا، ۱۹ مارچ ۱۹۹۹ء کا دن خاموشی سے گزر گیا۔ اس دن کی اہمیت اگر ساری دنیا کے لیے نہ سہی تو کم از کم دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہندومت کے ماننے والوں کے لیے تو ضرور ہے۔ ہندو کلینڈر کی رو سے اُس دن باون ویں صدی کا آغاز ہوا اور کانوں کان خبر بھی نہ ہوئی۔ اس کی یاد دہانی دہلی ٹیلی فون نے کرائی اس طرح کہ ۱۸ مارچ کو بارہ بجے بعد دہلی کے جس باسی نے فون کا چونگا اٹھایا، تو پہلی آواز یہ سنائی دی: ''جے ہند، نئی شتابدلی مبارک۔''(۲)

پچاس صدیوں سے بھی زائد عرصہ گزر گیا کہ کولہو کے یہ بیل لاکھوں بلکہ کروڑوں میل کا



سفر طے کر چکے ہیں اور اختتام سفر پر وہیں پائے جاتے ہیں جہاں سے سفر کا آغاز کیا تھا۔ اس دیہات کے آس پاس میلوں تک چلے جائیے، آپ کو پختہ سڑک کی ایک پٹی بھی نظر نہیں آئے گی اور نہ بجلی کا ایک کھمبا۔ آدم برداری اور مال برداری کے صرف دو وسائل ہیں: اونٹ اور رتھ۔ اس خاموش اور پرسکون، بلکہ یوں کہا جائے کہ ۱۶ ویں، ۱۷ ویں صدی میں منجمد ان طویل و عریض علاقوں کو ۱۱ اور ۱۳ مئی ۱۹۹۸ء کو چھ ہولناک دھماکوں نے دور دور تک ہلا دیا۔ دیواروں میں دڑاڑیں پڑ گئیں تو کچے اور نیم پختہ گھروندوں کا کیا حال ہوا ہوگا۔ دھماکوں کے ساتھ ہی آن واحد میں گھنے دھوئیں کے طوفانی بادل چاروں اور پھیل گئے۔ اور یوں محسوس ہوا کہ نہ صرف مکانات کی دیواروں میں شگاف پڑ گئے، بلکہ وہ زمین جس پر وہ مکانات کھڑے تھے، اس کی چولیں تک ہل گئی ہیں۔ (۳)

یہ واقعہ عبدالشکور کے گھروندے سے صرف بیس میل کے فاصلے پر پیش آیا۔ اس کے چند چھنڈوں بعد بھارت ورش کے پردھان منتری، اٹل بہاری واجپائی، جنہوں نے ۱۹۵۰ء کی دہائی میں اپنی سیاسی زندگی کا آغاز کٹر ہندو فرقہ پرست اور احیا پسند جماعت راشٹریہ سیوم سنگھ میں شمولیت سے کیا تھا اور اسی جماعت کی حمایت سے پردھان منتری نواس تک پہنچے تھے، ریڈیو اور ٹی وی سے اپنے بھاشن میں قوم کو یہ ''خوش خبری'' سنائی کہ اب ان کا ملک چھٹی عالمی جوہری طاقت کے طور پر ابھرا ہے۔ ابھی واجپائی کی تقریر ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ ملک کے طول و عرض میں لوگ دیوانہ وار سڑکوں پر نکل آئے۔ ہر محلے اور گلی کوچے میں مٹھائی کی دکانیں خالی ہو گئیں، پٹاخوں کے دھماکے کانوں کے پردے پھاڑ رہے تھے، پورا ملک موت کا کنواں بن چکا تھا جہاں چند لاکھ کو چھوڑ کر پوری قوم مستقبل کے مرگِ انبوہ پر جشن منا رہی تھی۔ اس کے برعکس ممتاز ہندوستانی سائنسداں، ڈاکٹر ونود موبائی (Dr Vinod Mubayi) نے خدا لگتی بات کہی۔ انہوں نے کہا:

''آر ایس ایس نے گاندھی جی کا قتل دو مرتبہ کیا۔ جسمانی طور پر ۱۹۴۷ء میں، اور پچاس سال بعد اُن کی میراث کو۔''(۴)

جین مت کے بانی مہاویر اور اہنسا، گوتم بدھ اور اہنسا اور آخر کار گاندھی جی اور اہنسا۔

تینوں کے فلسفۂ حیات میں اہنسا (عدم تشدد) قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے۔ گزشتہ نصف صدی سے شعوری طور پر اس کی دھجیاں ملک کے طول وعرض میں بکھیری جا رہی ہیں۔ پوکھرن کی سرزمین کو گوتم بدھ کی تذلیل کے لیے بطور خاص استعمال کیا جا رہا ہے۔ وہیں پہلا جوہری دھماکا ۱۹۷۴ء میں شری متی اندرا گاندھی کے دورِ حکومت میں کیا گیا۔ وقتِ مقررہ پر وزیر اعظم صاحبہ اپنے دفتر میں بڑی بے چینی سے ٹہل رہی تھیں۔ ان کی نگاہیں اور کان اپنے خصوصی ٹیلی فون پر لگے ہوئے تھے۔ جونہی گھنٹی بجی، لپک کر انہوں نے فون اٹھایا۔ دوسری جانب سے کامیاب تجربے کی اطلاع ان الفاظ میں دی گئی: ''Lord Buddah Was Smiling''، ''بھگوان بدھ مسکرا رہے تھے۔'' (۵)

نئے دھماکوں کی گونج ہندوستان تک محدود نہ رہی۔ قدرتی طور پر پہلے تو پڑوسی ممالک میں ہلچل اور کھلبلی مچی۔ ساتھ ہی ساری دنیا میں بھی اس کے خلاف سخت ردِعمل کا اظہار کیا گیا۔ پاکستان میں چند ہزار نفوس کو چھوڑ کر پوری قوم ایک آواز ہو کر اس وقت کے وزیر اعظم نواز شریف سے جارحانہ انداز میں یہ مطالبہ کرنے لگی کہ اینٹ کا جواب پتھر سے نہ دیا تو ساری قوم نواز شریف کے خلاف اٹھ کھڑی ہوگی۔ تمام اُردو اخبارات یک زبان ہو کر میدان میں اتر آئے۔ صرف دو کالم نگاروں، زاہدہ حنا اور مجیب الرحمٰن شامی نے ایٹمی تجربات کی مخالفت میں متعدد کالم لکھے۔ انگریزی اخبارات میں ''دی نیشن'' نے اردو پریس کی پیروی کی جبکہ ''ڈان'' اور ''دی نیوز'' نے مخالفین و موافقین دونوں کی آرا شائع کیں۔ ''ڈان'' میں اس تجربے کے مخالفین کا پلڑا بھاری رہا۔ ملک کے طول وعرض میں مخالف سیاسی و مذہبی جماعتوں کے رہنما دن بھر میں درجنوں جلسوں کو مخاطب کرنے لگے۔ مئی کے آخری ہفتہ میں ایک جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے محترمہ بے نظیر بھٹو، جو وقتاً فوقتاً اپنے سیاسی نظریوں میں تبدیلی کو جز و ایمان سمجھتی ہیں، جوش میں آکر اس قدر بے قابو ہوگئیں کہ اپنے دونوں ہاتھوں کی چوڑیاں اتاریں اور نواز شریف کو للکارتے ہوئے کہا کہ وہ ''یہ چوڑیاں پہن کر لاہور اپنے گھر چلے جائیں۔'' (۶) یہ اور بات ہے کہ اب وہ امریکی صدر بل کلنٹن کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے سی ٹی بی ٹی (Comprehensive Test Ban Treaty) کا نغمہ الاپ رہی ہیں اور اپنے حیدر آباد میں



منعقدہ ناٹک سے انکار کر رہی ہیں۔ (۷) اس ہیجان انگیز دور میں راقم الحروف نے ایک با اثر صحافی سے، جو شاہ اور شاہ کے کاسہ لیسوں سے قرب کا شرف رکھتے تھے، اس سلسلے میں اسلام آباد کی سوچ کے بارے میں دریافت کیا تو بقول ان کے سوائے نواز شریف کے، ان کے تمام وزیر، مشیر، سفیر، دفتری، سیاسی اور مذہبی جماعتوں کے رہنما، مختلف مکاتیب فکر کے علمائے کرام اور دانشور اِن محترم کی مختلف ٹولیاں جن میں اخبار نویس بھی شامل تھے، فوری دھماکے کے حق میں تھے۔ انہیں مختلف ٹولیوں میں طلب کیا جاتا۔ ہر ایک کی زبان پر ایک ہی سہ لفظی جملہ تھا Tit for tat: ۔ اینٹ کا جواب پتھر۔ ان محترم کرم فرما کے بموجب ایوان وزیر اعظم میں ایک انتہائی مختصر اجتماع میں ایک نامور بزرگ صحافی کے غصہ اور جوش وخروش کا یہ عالم تھا کہ ''اگر اُن کا بس چلتا تو وہ ایوانِ وزیر اعظم سے کھوٹہ جاتے، گولا حاصل کرتے اور اسے جیب میں رکھ کر دہلی کا رُخ کرتے۔''

اِدھر ہندوستان کے تمام فرقہ پرست واحیا پرست نام نہاد سیاسی رہنما اور دانشور روزانہ بیانات پر بیانات داغے چلے جا رہے تھے۔ لال کرشن اڈوانی، جنہوں نے بابری مسجد کے انہدام کے لیے ہندوستان بھر میں فضا ہموار کرنے کے لیے نام نہاد ''رتھ یاترا'' کے نام سے فرقہ پرستی، تنگ نظری اور تعصّب کے شعلوں کو ہوا دی تھی، دھماکوں کے فوراً بعد ہمسایہ ملک کو للکار کر کہنے لگے کہ ''پاکستان کو یہ بات ذہن نشین کرنی ہوگی کہ اب جنوبی ایشیا کی ماحولیاتی حکمت عملی میں تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں اور ان تبدیلیوں کو اسے محسوس کرنا چاہیے۔'' اس جنگ جویانہ وطن پرستی اور مجنونانہ حکمتِ عملی کی فضا میں واجپائی نے اپنے چہرے پر سے میانہ روی کی نقاب نوچ کر اتار پھینکی اور کھل کر آزاد کشمیر پر بزور طاقت قبضہ کر لینے کی دھمکی نے اسلام آباد میں مٹھی بھر امن پسندوں کے حوصلے بھی پست کر دیئے۔ اُدھر مغربی ممالک کا ردِعمل بھی پاکستان کے ساتھ کچھ زیادہ ہمدردانہ نہیں تھا۔ بس یہ اطلاعات ملتی رہتی تھیں کہ صدر کلنٹن نواز شریف سے برابر رابطہ کیے ہوئے ہیں اور دھماکے نہ کرنے کی ہدایت جاری کرتے رہتے ہیں۔ یہی روّیہ بقیہ بڑی طاقتوں کا تھا۔ ان تمام حالات کا جو قدرتی نتیجہ نکلنا چاہیے۔ تھا۔ وہ نکلا۔ ۱۱/ اور ۱۳/ مئی کو پوکھرن میں چھ اور ۲۷/ اور ۲۹/ مئی کو چاغی (بلوچستان) میں پاکستان نے سات جوہری دھماکے

کیے۔ جوہری حب الوطنی (Nuclear patriotism) کے ان مظاہروں کے بعد دہلی اور اسلام آباد اس خوش فہمی میں مبتلا ہوگئے کہ اب پانچ کی بجائے سات عالمی قوتیں وجود میں آ گئی ہیں۔

چاغی صنعت و حرفت تو رہی ایک طرف، معاشی و معاشرتی اعتبار سے پوکھرن سے کچھ زیادہ ہی پسماندہ علاقہ ہے۔ آبادی کا بیشتر حصہ چرواہوں پر مشتمل ہے یا اسمگلروں پر۔ یہاں دور ونزدیک جو کنویں نظر آرہے ہیں (۸)، وہ دولت مند عربوں کی دین ہیں، جو اکثر شکار و سیر و تفریح کے لیے آتے رہتے ہیں۔ ستم ظریفی ملاحظہ فرمائیے کہ آج (۲۴ اپریل) جبکہ یہ سطور لکھی جا رہی ہیں، انگریزی روزنامہ دی نیوز ''چاغی میں تباہی'' The Chagi disaster کے عنوان سے اداریہ میں کہا گیا ہے کہ ''چاغی اور اس کے آس پاس کے دیہاتوں میں بسنے والے پانی کی شدید قلت کے پیش نظر نقل مکانی پر مجبور ہوگئے ہیں، چاغی جو پاکستان کی تکنیکی ترقی کے میدان میں نشان امتیاز اور تفاخر کا درجہ حاصل کر چکا ہے، وہاں کے پندرہ ہزار باسی پانی کے قطرہ قطرہ کو ترس رہے ہیں۔ یہ خبر ہماری قومی غیرت و حمیّت کا تمسخر اڑا رہی ہے۔''(۹) اس وقت چاغی کی طرح پوکھرن میں بھی پانی کی شدید قلت کا وہی عالم ہے۔ دونوں جگہ لوگ پانی کی بوند بوند کو ترس رہے ہیں۔ دھماکے کی جگہ حکمراں جماعت کا کٹر فرقہ پرست ٹولہ ''شکتی مندر'' تعمیر کرنا چاہتے تھا، وہی علاقہ دو سال سے سوکھے کی لپیٹ میں ہے۔ راجستھان کے عوام اسے جوہری دھماکوں سے منسلک کر رہے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ ''ان دھماکوں نے نہ صرف ہماری زمین کو بانجھ کر دیا ہے، بلکہ ہمارے آسمان کو بھی جلا ڈالا ہے۔'' (دی نیوز، ۳۰ اپریل ۲۰۰۰)

گزشتہ نصف صدی سے یہ سنتے چلے آرہے ہیں دنیا کے سب سے بڑی جمہوری ملک کا نام ہندوستان ہے جہاں ساٹھ لاکھ سے کچھ زائد رائے دہندگان ہیں۔ دہلی اور اس کے غیر ملکی دوست ممالک کے ڈھنڈورچی اس بات کو اتنی بار اور اتنی شد و مد سے دُہرا رہے ہیں کہ صاف اور بے لاگ حقائق نظروں سے اوجھل ہوجاتے ہیں۔ اب حقیقت حال ملاحظہ فرمائیے، دونوں ممالک میں امارت و افلاس، علم و جہالت، فلک بوس عمارتیں اور کچے گھروندے، آواز سے تیز رفتار مواصلاتی نظام اور بیل گاڑیاں، جو موئنجو دڑو کے دور کے رتھوں سے مماثلت رکھتی ہیں، تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ دونوں ممالک میں پائی جاتی ہیں۔



بیل کی طاقت اور جوہری توانائی کے شانہ بہ شانہ دونوں ممالک میں معاشی و معاشرتی بدحالی کا یہ عالم ہے کہ دنیا کے سب سے بڑے جمہوری ملک کی دو تہائی سے بھی زیادہ آبادی غربت و فلاکت، بے روزگاری و بے گھری، بیماری، جہالت اور پس ماندگی کا شکار ہے۔ دوسرے لفظوں میں دنیا بھر میں سب سے زیادہ غریب، بے گھر، بے روزگار، بیمار و بے کس افراد بھی ہندوستان میں بستے ہیں، افریقہ کے بعض انتہائی پس ماندہ ممالک بھی اعداد و شمار کے اعتبار سے ہندوستان کی فلاکت اور بے بسی اور بے کسی کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ Human Development in South Asia (۱۹۹۸ء) کی رپورٹ (۱۰) کے بموجب، ہندوستان میں نصف سے زائد آبادی کی روزانہ فی کس آمدنی ایک ڈالر اور بعض علاقوں میں اس سے بھی کم ہے، جب کہ نصف آبادی ناخواندہ ہے۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق پاکستان میں ۳۵ فیصد خواندہ اشخاص ہیں، غیر سرکاری تخمینہ ۱۵ تا ۲۰ فیصد ہے۔ مذکورہ رپورٹ کے مطابق دونوں ممالک میں ۳۳۰ ملین ناخواندہ اشخاص ہیں، جب کہ ۴۵ ملین بچے ابتدائی تعلیم سے بھی محروم ہیں۔ ۲۰۰ ملین افراد طبّی سہولتوں اور ۳۰۰ ملین پینے کے صاف پانی سے محروم ہیں۔ ۷۴۰ ملین افراد کو رفع حاجت کے لیے کھیتوں یا میدانوں کا رُخ کرنا پڑتا ہے۔ ستم ظریفی ملاحظہ کیجیے کہ ہندوستان کے دو متمول شہر بمبئی اور کلکتہ کے ۴۰ تا ۴۵ فیصد باشندے جھگیوں اور فٹ پاتوں کے مکین ہیں۔ بمبئی شہر کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ جزیرہ نما بمبئی کے تین اطراف ساحل سمندر ہے۔ تقسیم سے قبل ان علاقوں میں واقع مکانات کی قیمتیں اور کرایہ اندرون شہر کے مقابلہ میں خاصے زائد ہوا کرتے تھے۔ امراء و سفراء کی عالی شان رہائش گاہیں ہوا کرتی تھیں۔ اب سنا ہے انہیں مکانات کے مکینوں نے ساحل سمندر پر کھلنے والی کھڑکیوں کی جگہ دیواریں چنوا دی ہیں کہ آس پاس کے فٹ پاتھوں کے باسی اسی ساحل کو رفع حاجت کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ کم و بیش یہی صورتِ حال کلکتہ کی ہے۔ ان دونوں شہروں کو (Dying Cities) لبِ مرگ شہر کہا جاتا ہے۔(۱۱)

مذکورہ رپورٹ کے بموجب ۱۹۹۰ء تا ۱۹۹۶ء تک دونوں ممالک ستر بلین ڈالر دفاع پر خرچ کر چکے ہیں جس میں جوہری بم پر جو اربوں ڈالر صرف کیے گئے ہیں وہ شامل نہیں ہیں(۱۲) ہندوستان نے سال رواں کے دفاعی بجٹ میں ۲۷ فیصد اضافہ کا اعلان کیا ہے، جو

آزادی کے بعد ایک ریکارڈ رقم ہے (۱۳)۔ سیاچن کا تنازعہ ۱۹۸۲ء میں اٹھ کھڑا ہوا۔ وہاں دفاعی اخراجات کی رقم ناقابل یقین حد تک پہنچ چکی ہے۔ بعض ذرائع کے مطابق پاکستان ان بلند و بالا برف پوش پہاڑوں کے تحفظ کے لیے روزانہ ایک ملین ڈالر صرف کرتا ہے۔ کم وبیش اتنی ہی رقم ہندوستان کو بھی صرف کرنی پڑتی ہے۔ (۱۴)

آزادی کے بعد دونوں پس ماندہ ممالک کی اوّلین ترجیح دفاع اور قومی سلامتی کے امور کو حاصل رہی ہے۔ گزشتہ نصف صدی میں اس مد میں کتنی رقم خرچ کی گئی ہے، اس کے صحیح اعداد و شمار تک پہنچنا ناممکن ہے۔ ایک اندازے کے مطابق پچھلی دو دہائیوں میں پاکستان نے جوہری توانائی کے حصول پر تین سو تا چار سو ملین ڈالر سالانہ صرف کر چکا ہے۔ (۱۵)

**عوام کا ردِ عمل:** دھماکوں کے فوراً بعد دونوں ملکوں کے عوام بڑے پیمانے پر جشن منانے سڑکوں پر نکل آئے۔ دونوں ممالک میں مٹھائی کی دکانوں کا چند گھنٹوں میں صفایا ہوگیا۔ یہی گل فروشوں کی دکانوں اور ٹھیوں کا ہوا۔ چار دیواری کے اندر جو جشن منائے گئے ان میں دخترِ انگور کی بوتلوں کے کاک اڑا کر فتح و نصرت کے نغمے گائے گئے۔ لیکن یہ خوشیاں اور گہما گہمی عارضی ثابت ہوئیں۔ جب جشن اور رقص و سرور سے فراغت حاصل ہوئی تو پتہ چلا کہ عالمی طاقت بن جانے سے روٹی، روزی کے مسائل حل نہیں ہوا کرتے۔ نومبر ۹۸ء میں ہندوستان کی چار ریاستوں میں جہاں بی جے پی کی حکومت تھی، انتخابات ہوئے اور چاروں ریاستوں میں باجپائی جی کی حکومت کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ جون ۹۸ء سے ہندوستان بھر میں پیاز کی قلت پیدا ہوگئی اور نومبر میں انتخابات کے آتے آتے اتنی شدید ہوگئی کہ انگریزی اخبارات نے بعض انتہائی مضحکہ خیز سرخیاں لگائیں۔ جن میں سے ایک خاصی پسند کی گئی: (۱۶)

Onion Vs. the bomb

''پیاز بمقابلہ جوہری بم''۔ اور جب نتائج کا اعلان کیا گیا تو ایک اخبار نے سرخی لگائی (۱۷):

IT IS THE ONION : THE BOMB DOWN A DRAIN

(پیاز کی فتح: بم (ایٹم) نالی میں)

ہندوستان کے کثیر الاشاعت رسالے ''انڈیا ٹو دے'' (India Today) نے انتخابات



کے بعد ملک گیر پیمانے پر ایک سروے کروایا جس کے نتیجے میں عوام کی بڑی بھاری اکثریت نے جن دو اہم ترین مسائل کی نشان دہی کی، وہ ہیں: افراطِ زر اور بے روزگاری۔ سروے کے سوالنامہ میں ایٹم بم کے بارے میں بھی رائے طلب کی گئی تھی۔ اس سلسلہ میں جو اعداد و شمار شائع کیے گئے، وہ حکومتِ ہند کے لیے خاصے سبق آموز اور عبرت ناک ہیں: صرف ۲۲ فیصد نے بم کی حمایت کی، ۴۰ نے مخالفت اور ۳۸ نے نہ تو حق میں اور نہ مخالفت میں رائے دی۔ (۱۹)

اِدھر پاکستان میں گزشتہ سال مئی کے آخری ہفتہ سرکاری اور غیر سرکاری طور پر جو جشن منایا گیا اور سارے ملک میں چاغی کی پہاڑی، غازی اور غوری (دور مار میزائل) کے یادگاری مجسمے بنائے گئے اور ٹی وی سے جو پروگرام نشر کیے گئے، ان کے بارے میں کیا کہا جائے! آج دنیا کی ''ساتویں بڑی قوت'' کے بارے میں اقوام عالم کیا رائے رکھتی ہیں، روزانہ اخبارات کی زینت بننے والی یہ خبریں شرمناک بھی ہیں اور عبرت ناک بھی۔ پاکستان کے دھماکوں کے بعد آسٹریلیا کے وزیر اعظم جان ہارورڈ (John Howard) نے انتہائی جارحانہ انداز میں کہا:

''یہ بڑی دیوانگی کی بات ہے اور ناقابل یقین بھی کہ پاکستان جیسا انتہائی فلاکت زدہ ملک سفارتی جوڑ توڑ یا حکمتِ عملی کی سطح پر اس خیال سے اٹکھیلیاں کرے کہ وہ کسی طور پر جوہری صلاحیت حاصل کر کے عزت و احترام کے بلند ترین مقام پر فائز ہو جائے گا۔'' (۱۸)

★ ★ ★

سب پہ جس بار نے گرانی کی
اس کو یہ ناتواں اٹھا لایا

(میر)

**ذرّہ اور آدم خاکی:** یہ کائناتِ رنگ و بو و خیر و شر کب وجود میں آئی، کن کن مراحل سے اسے گزرنا پڑا، کن یا عظیم دھماکے Big Bang کی صدا کب گونجی، زندگی اس کرۂ ارض پر کب نمودار ہوئی، ان سوالات کے جوابات حاصل کرنے کے لیے انسان سر توڑ کوششوں میں مصروف ہے۔ اس وقت تو اُسے یہ معلوم ہے کہ نہ ابتداء کی خبر ہے، نہ انتہا معلوم۔ بہ الفاظِ دیگر

معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد۔

سائنسدانوں کا خیال ہے (لفظ خیال ذہن میں رہے) کہ یہ کرۂ ارض غالباً کوئی پندرہ بلین سال قبل وجود میں آئی ہوگی۔ اور کوئی ذی روح یعنی آثارِ حیات تین ہزار ملین سال پہلے وجود میں آئے ہوں گے(۱۹) اور اس طرح ارتقا کا پہیا گھومنے لگا تا آنکہ سوچنے سمجھنے والا دو پایہ وجود میں آیا۔ باقی ذی روح اشیا سے ممیز و ممتاز و منفرد رکھنے کے لیے اسے قوتِ گویائی، قوتِ فکر اور قوتِ عمل کی صلاحیتیں عطا کر کے اُسے بزم ہستی کا صدر نشین مقرر کیا گیا۔

بس اس کے بعد انسان نے کبھی تیز روی اور کبھی سست روی سے اپنی نت نئی ایجادات و دریافتوں اور خیر و شر کی قوتوں کو روئے زمین پر پھیلا دیا۔ سمندر کی بپھری ہوئی موجوں کو پابجولاں کیا اور اس کا سینہ چیر کر اس سے خزانے نکال لایا، تو دوسری طرف زمین کی کوکھ میں پوشیدہ خزانوں کو اپنے دست تصرف میں لے آیا۔ ترقی کی اس تیز رفتار دوڑ میں اکثر اوقات ٹھوکریں بھی کھائیں اور منھ کے بل گرا بھی۔ ترقی اور تباہی کی دوڑ بیک وقت جاری ہے۔ گزشتہ نصف صدی میں اس نے ایسی حیرت انگیز اور ناقابل یقین ایجادات کی ہیں اور ان کا سلسلہ بدستور جاری ہے بلکہ کل کے مفروضے آج کی حقیقت ثابت ہوئے۔ محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہوجائے گی۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ انسان نے بے پناہ ترقی کے ساتھ ہی لامتناہی تباہی کے سامان بھی فراہم کرچکا ہے۔ آج وہ اس مقام تک پہنچ چکا ہے کہ صرف مٹھی بھر افراد یا فردِ واحد اپنی دیوانگی کی انتہا کو پہنچ کرۂ ارض کو جہنم کا نمونہ بنا سکتا ہے۔ آئندہ صفحات میں ہیروشیما اور ناگاساکی پر سیکنڈوں میں مسلط کردہ قیامت صغریٰ کا ذکر ہوگا۔ یہ کام تو صرف دو بموں نے انجام دیا تھا۔ اس وقت جو بم ہندوستان اور پاکستان کی تحویل میں ہیں، وہ ان بموں سے کئی گنا زیادہ طاقت ور ہیں جو ہیروشیما اور ناگاساکی پر گرائے گئے۔

یہ خوفناک بم کیا ہے؟ اس کی داستان کچھ یوں ہے کہ موجودہ دور جوہری توانائی کا دور ہے انسان کے کمال (زوال؟) کا دور ہے۔ اس نے سینہ گیتی ہی کو چاک نہیں کیا بلکہ ذرّے کا دل بھی چیر ڈالا۔ ایک طلسمی خیال اور شاعرانہ تعلّی نے حقیقت کا روپ دھار لیا۔ ایک چھوٹے سے چھوٹے ذرّے یا ایٹم کو چیر ڈالنا یا پھاڑنا Fission انسانی ذہن کا اب تک کا عظیم ترین



کارنامہ بھی ہے اور معصومانہ غلطی بھی بیسویں صدی کی شاید یہ سب سے بڑی ایجاد کہی جاسکتی ہے جس نے بہت سی نئی ایجادات کے دروازے کھول دیے۔

ایک سادہ ایٹم سے جوہری یا نیوکلیائی توانائی تک کا سفر بڑا ہی طویل، اور انتہائی پیچیدہ ہے۔ اس سفر کا آغاز ڈھائی ہزار قبل ملک یونان سے ہوتا ہے(۳۰) حضرت عیسیٰ مسیحؑ سے پانچ سو سال قبل یونان علم و فلسفہ کا مرکز تھا۔ ارسطو، سقراط اور افلاطون اس عہد کی پیداوار ہیں جن کی تعلیمات نے انسانی فکر کا نقشہ ہی بدل دیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی تعظیم، تحریم و تکریم میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ اس دور میں ان میں دیمقراطیس نامی ایک اور بھی فلسفی تھا(۲۱)۔ اس نے مختلف موضوعات پر تفصیل سے اپنے خیالات قلم بند کیے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ اپنے استاد لیوسی پس (Leuccipus) جو ابتدائی جوہری نظریہ کا موجد تھا، اس پر مزید تحقیق کر کے اس نتیجہ پر پہنچا کہ ہر قسم کا مادہ انتہائی چھوٹے چھوٹے ذرّات سے مل کر تشکیل پاتا ہے(۲۲)۔ ان ذرّات کا نام اس نے ایٹم (Atom) رکھا(۲۳)۔ اس یونانی لفظ کے معنی ہیں ''ناقابل تقسیم''۔ دیمقراطیس کو ''مفکرِ خنداں'' (Laughing philospher) کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے(۲۴)۔ ایٹم کے سینے سے نکلنے والے تباہی کے طوفان پر کیا وہ ہنس رہا ہوگا؟

اس کے بعد زمانے نے بہت سی کروٹیں لیں اور اٹھارویں صدی کے آغاز میں ایک انگریز سائنسدان جان ڈالٹن (John Dalton) نے اس خیال کو باقاعدہ نظریہ کی شکل میں پیش کیا(۲۵)۔ لیکن ایٹمی تقسیم کا تصوّر ابھی تک دور کی بات تھی۔ ۱۸۹۷ء میں جے۔ جے تھامسن (J.J. Thomson) نے ایک قسم کے ذرات الیکٹران کی دریافت کی جو اس کے خیال کے مطابق ایک کیک کے پستے بادام کی طرح ایٹم کے اندر موجود تھے(۲۶)۔ جے، جے تھامسن، میکائیکل فیراڈے (Michal Faraday 1791-1867) اور دوسرے سائنسدانوں کی معلومات کی روشنی میں یہ کہا جانے لگا کہ ایٹم برقی ساخت کا حامل ہے(۲۷)۔ برطانیہ کے ایک اور سائنسداں ارنسٹ روتھرفورڈ (Sir Earnest Rutherford 1871-1937) نے قدرت کے نہاں خانے سے ایک ایسا سربستہ راز فاش کر دیا کہ مستقبل کے سائنسدانوں کے لیے نہ صرف راہ ہموار کی بلکہ ان کی راہ میں بچھے ہوئے کانٹے بھی چنے اور ساری رکاوٹوں کو دور

کیا(۲۸)۔ رتھر فورڈ ذرّے کا دل تو نہ چیر سکا البتہ اس نے ایٹم کے اندر ایک مرکزہ یا قلب (Nucleus) کی دریافت ضرور کر ڈالی جس میں مثبت (+) بار کا بھی پتہ چلا لیا۔ اس طرح ایٹمی نظریہ ترقی پاتا چلا گیا۔ اس انقلابی دریافت پر روتھر فورڈ کو ۱۹۰۵ء میں نوبل انعام سے نوازا گیا۔ (۲۹) ہر ایٹم کے تین بنیادی ذرّات (Fundamental particles) (۳۰) (الیکٹرون، پروٹون، نیوٹرون) کے بعد سائنسدانوں کے ذہن ایٹمی مرکز Nucleus کی طرف مرکوز ہوگئے۔ اس طرح آدم خاکی اس عالم بیکراں کے رازہائے پنہاں کو بے نقاب کرنے میں ہمہ تن مشغول ہوگیا۔

بیسویں صدی کو سائنس کی صدی کے نام سے موسوم کیا گیا ہے اور اس کا ممتاز ترین سائنسداں البرٹ آئن سٹائن (1879-1955) کو تسلیم کرلیا گیا ہے۔ اس کی چھاپ اس دور کی ہر ایجاد پر ثبت ہے۔ اس کے نظریے کے مزید اطلاق سے حاصل ہونے والے اہم انکشافات کے نام ہیں: (الف) جوہری بم کا نظریہ (ب) عظیم دھماکا (Big Bang) کا نظریہ (ج) مقادیری طبعیات (Quantum physics) (د) الیکٹرانک ایجادات۔ (۳۱) ۱۹۱۶ء میں آئن اسٹائن نے ایک انقلابی نظریہ بنام نظریہ اضافیت (Theory of Relalivity) یعنی (E=mc2) پیش کیا۔ یہ بھی فطرت کی معجز نمائیاں ہیں کہ جس کو بچپن میں ایک غبی اور کند ذہن سمجھا جاتا تھا وہ اپنی صدی کا ذہین ترین سائنسداں تسلیم کیا گیا۔ آئن سٹائن کے نظریہ پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالنے سے قبل مذکورہ مخففات کی تعریف کچھ یوں ہے :E (Energy) توانائی، M (Mass) مادہ، حجم، C (Speed of Light)، روشنی کی رفتار۔ اس نظریہ کے مطابق مادّہ اور توانائی ایک ہی شے کی دو مختلف حالتیں اور شکلیں ہیں اور وہ ایک دوسرے کی حالت میں تبدیل بھی ہوسکتے ہیں۔ یہ آئن سٹائن کا بڑا انقلابی نظریہ تسلیم کیا گیا جس کے اثرات بڑے دور رس ہوسکتے ہیں اور ہوئے بھی۔ لیکن یہ تعمیر و تخریب دونوں صورتوں میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اس نظریہ کے اصول پر لامحدود توانائی پیدا کی جاسکتی ہے۔ اگر تخریبی عمل کے لیے استعمال میں لایا گیا تو یہ دنیا کی بربادی اور تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہوسکتا ہے اور یہ ہوا بھی ہے۔ یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ قیامت کا خالق خود یہ آدم خاکی ہوگا۔



اب ہم جنگ عظیم دوم کے دور میں پیچھے کی طرف نظر کرتے ہیں جب اس نظریہ کو عملی شکل میں لانے کے لیے مختلف ممالک کے سائنسداں سرگرم عمل نظر آتے ہیں۔ (۳۳) مغرب کے سائنسدانوں اور مدبروں کے ذہنوں میں یہ خیال پرورش پا رہا تھا کہ اگر کسی طرح ایٹم کو چیرا جاسکے تو اس کے نتیجہ میں ایک زنجیری عمل (Chain Reaction) ہونے کا احتمال ہے۔ اس کے بعد ہی ایک ایسا دھماکا عمل میں آسکتا ہے کہ جس کا مشاہدہ دنیا نے کبھی نہیں کیا ہوگا اور جس کے ذریعہ لامحدود توانائی حاصل ہوسکتی ہے۔ ایسے جوہری بم (Atomic Bomb) بنانے کا تصور ابھی صرف تصور ہی تھا۔ ایک تابکار دھات یورینیم ۲۳۵ (Uranium-235) جس کی ایجاد ہوچکی تھی۔ اس تجربہ کے لیے ضروری تھی۔ (۳۴) یہ بات کانٹا بنی ہوئی تھی کہ کیا وہ اتنی مناسب مقدار میں مہیا کی جاسکتی ہے۔ کیا زنجیری عمل بغیر کسی رکاوٹ کے شروع ہوسکے گا؟ ان کی یہ کوشش کتنی جلد بارآور ہوں گی، یہ سوالات سائنسدانوں کے لیے ایک چیلنج کی شکل اختیار کرچکے تھے۔ اس دوران جرمنی اور یورپ سے آئے ہوئے پناہ گزین سائنسدانوں نے یہ پریشان کن کہانیاں بھی سنائیں کہ نازی جرمنی اس قسم کی دوڑ میں شریک ہے (۳۵)۔ آئن سٹائن نے امریکی صدر فرینکلن روز ویلٹ (۱۸۸۲-۱۹۴۵ء) کو اس خطرے کے پیش نظر ایک اہم بلکہ تاریخ ساز خط لکھا (۳۶) جس کے نتیجہ میں صدر امریکا نے فوراً (فروری ۱۹۴۰ء) ایٹمی توانائی تحقیق کے لیے ایک معتدبہ رقم مختص کردی۔ تحقیق کا عمل تیز کردیا گیا اور مالی امداد بھی بڑھا دی گئی۔ اُدھر جاپان کے سائنسدان بھی اس دوڑ میں برابر کے شریک تھے۔ جاپان کی نشی نا تجربہ گاہ (Nishina's Lab) اس وقت سب سے بڑی تجربہ گاہ تھی (۳۷) جہاں جاپان کے بہترین دماغ جمع تھے اور جوہری توانائی پر مصروف عمل تھے۔ ان کو یہ یقین ہوچلا تھا کہ نیوکلیائی انشقاق (Nuclear Fission) سے بڑی مقدار میں وہ توانائی پیدا کرسکتے ہیں جس کو بڑے پیمانے پر تباہی کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ یورینیم ۲۳۵ کے حصول کے لیے جرمنی کی رسائی یورپ کے جملہ یورینیم کے مراکز تک ہوچکی تھی (۳۷)۔ یہ آسانی ابھی امریکہ کو حاصل نہیں ہوئی تھی۔ لیکن امریکہ کے پاس بہترین سائنسی دماغ موجود تھے۔ خاص طور سے جو غیر ملکوں سے نقل وطن کرکے آئے تھے۔ یورینیم کی کمی کے مسئلے کو اس طرح حل کیا گیا کہ اس کے بجائے پلوٹینیم دھات

کو استعمال کیا جائے، جو کہ نیوکلیائی ری ایکٹر (Nuclear Reactor) سے حاصل کی جاسکتی ہے۔(۳۸)

یہ ایک آسان اور سستا طریقہ تھا۔ اس کے بعد اس دھات کے ذریعہ مطلوبہ ایٹم بم تیار کیا جاسکتا ہے جو جنگ کا نقشہ پلٹ سکتا ہے۔ خیال تھا کہ اس سارے منصوبے کے لیے ایک ملین ڈالر درکار ہوں گے۔ امریکیوں نے یہ بھی سوچا کہ اگر جرمن اس منزل تک ہم سے پہلے پہنچ جاتے ہیں تو وہ ہمارے ہاتھ سے فتح کو چھین سکتے ہیں۔ اتنے میں حالات و واقعات نے ناگہانی نیا رخ اختیار کرلیا۔ ہوایوں کہ جاپان نے ۷ دسمبر ۱۹۴۱ء کو پرل ہاربر پر ساڑھے تین سو ہوائی جہازوں کا ایک بیڑا لے کر حملہ کر دیا۔ اور اس کے نتیجے میں امریکہ نے بھی جاپان کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔

اب ساری دنیا ایک آتش فشاں پہاڑ کے دھانے پر کھڑی تھی۔ ہر طرف آگ، خون، تباہی و بربادی کی گرم بازاری تھی۔ آخر کار آئن سٹائن کے اعلان شدہ نظریہ 'اضافیت کا عملی مظاہرہ ایک بھیانک اور تہلکہ خیز جوہری بم کی شکل میں ۶ راگست ۱۹۴۵ء ہوا جس نے ہیروشیما کے بنسے بستے شہر کو آنِ واحد میں خاک بسر کر دیا۔

یہ ایٹمی توانائی کا ایک انتہائی بھیانک اور خوفناک پہلو ہے۔ اگر اسی توانائی کو انسان تعمیری کاموں کے لیے استعمال کرنا چاہے تو بہت جلد اس دنیا سے غربت و فلاکت کی لعنتوں سے چھٹکارا پایا جاسکتا ہے۔ اس وقت تو استرا بندروں کے ہاتھ لگ گیا ہے۔ بس پانی پت والے مولانا پر کس گھڑی یہ مصرعہ وارد ہوا تھا کہ ایک صدی سے زائد عرصہ گزر جانے کے بعد بھی قدم قدم پر کانوں میں گونجتا رہتا ہے۔

اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقتِ دعا ہے

★ ★ ★

ایک دھماکہ، چار نسلیں: ہیروشیما، ۶/اگست ۱۹۴۵ء وقت: ۸ بجکر ۱۶ منٹ، مقامی۔
ایک لرزہ خیز دھماکا، آندھی، دھویں کے گھنے بادل، گھپ اندھیرا پھر چاروں طرف آگ کے شعلے جو آن واحد میں آسمان سے بھی پرے اٹھنے کے لیے مچل رہے تھے۔ چاروں اور لاشیں ہی



لاشیں اور جو زندہ بچ گئے تھے ان کے جسم پر کپڑوں کے چیھڑے یا مادر زاد ننگے اور بدن کوئلہ، جو کھال سے عاری تھا(۲۴)۔ اس قیامت صغریٰ کو ابھی تیسرا ہی دن تھا کہ یہی حال ایک اور شہر کا ہوا۔ پہلا شہر ہیروشیما تھا تو دوسرے کا نام ناگاساکی۔ پہلے ہلہ میں ایک لاکھ بیس ہزار اور دوسرے میں پچھتر ہزار افراد اسی دن مارے گئے(۲۵)۔ یہ واقعی خوش قسمت لوگ تھے۔ انہیں پتہ بھی نہ چلا کہ زندہ بچ جانے والوں پر کیا بیتی۔ وہ لوگ بھی خوش نصیب تھے جو چند دنوں، ہفتوں یا مہینوں میں اس جہان گزراں سے گزر گئے۔ بدقسمت ترین تو وہ لوگ ہیں جو خود نہ تو زندوں میں شمار کیے جاتے ہیں اور نہ مردوں میں۔ وہ تو بس بے بسی کے ساتھ اب چوتھی نسل کو زندہ درگور دیکھنے کے لیے سانس لینے کا ڈھکوسلا رچائے ہوئے ہیں۔(۲۶)

ربع صدی کی طویل مدت گزر جانے کے بعد (۱۹۷۰ء) The Pacific War Society نے اس قیامت خیز دن کے پسماندگان سے ان اپنے تجربات جاننا چاہے۔ تو اس وقت بھی وہ لوگ اس قدر خوف زدہ تھے کہ ان میں لب کشائی کی جرأت نہیں تھی۔ خوف و دہشت اور وحشت کی اس فضا میں جن افراد نے جرأت کا مظاہرہ بھی کیا تو یہی کہا: (۲۷)

''۶ اگست کے دن جو ہم پہ گزری، سو گزری، ربع صدی گزر جانے کے باوجود ہم جس درد اور کرب میں مبتلا ہیں اس کی شدت اُس قیامت خیز دن سے کچھ زیادہ ہی ہے۔ اگر آپ ہماری داستان رقم کرنا چاہتے ہیں تو صرف ایک التجا ہے، سچ کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔''

یہ رپورٹ ''آدمی کا روزِ شکست'' (THE DAY MAN LOST) کے عنوان سے ۱۹۷۲ء میں اوٹاوہ سے شائع ہوئی۔

ہیروشیما اور ناگاساکی کی تباہی کے فوراً بعد جب امریکی صدر ہیری ٹرومین Harry Truman کو اس کی اطلاع دی گئی۔ تو انہوں نے اظہارِ مسرت کرتے ہوئے کہا ''ہم نے عظیم ترین سائنسی جوے میں فتح حاصل کر لی۔'' (۲۸)

اس ''عظیم ترین سائنسی جیت'' نے ہیروشیما اور ناگاساکی کی کیا گت بنائی اس کی تفصیل کچھ یوں ہے بم گرانے کے لیے جس علاقے کا تعین کیا گیا تھا وہ ہیروشیما کا وسطی رہائشی علاقہ تھا۔ شہر کی کل آبادی تین لاکھ تینتالیس ہزار افراد پر مشتمل تھی۔ جنگ سے قبل اس شہر کی آبادی دو

لاکھ سے بھی کم تھی۔ جاپان کے کم و بیش تمام شہر بمباری کی زد میں آتے رہے تھے اور چونکہ یہ شہر نسبتاً پرسکون تھا اس لیے اس کی آبادی میں دوران جنگ ہی اضافہ ہوا تھا(۲۹)۔ بم گرتے ہی چار میل کا علاقہ آن واحد میں تہہ و بالا ہوگیا۔ چھیاسٹھ ہزار افراد چند منٹوں میں ہلاک ہوگئے اور ستر ہزار شدید زخمی، ستر فیصدی مکانات اور کاروباری مراکز ملبے میں تبدیل ہوگئے۔ تین دن بعد ناگاساکی میں فوری ہلاک ہونے والوں کی تعداد انچاس ہزار اور زخمیوں کی پچیس ہزار تھی جبکہ چالیس فیصد مکانات بازار اور کاروباری ادارے منہدم ہوگئے(۳۰)۔

بم سے متاثرہ جاپانیوں کے ردعمل سے قبل بم بنانے والوں اور ان بارہ امریکنوں کا ردِعمل معلوم کیا جائے جو ۱۶ اگست کو بی ۲۹ ہوائی جہاز پر سوار تھے۔ جوہری بم کا پہلا تجربہ دو ماہ قبل ۱۶ جولائی کو امریکا کے چوٹی کے جوہری سائنس دانوں نے کیا، جن میں امریکی بم کے موجد جنہیں ''بابائے بم'' (Father of the Bomb) جے رابرٹ اوپن ہائیمر (J.Robert Oppenheimer (1904-1967) (۳۱) موجود تھے۔ تجربہ کی کامیابی سے تمام عملے اور سائنسدانوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ تجربہ گاہ کے ڈائریکٹر کینتھ بینبرج (Kenneth Bainbridge) نے کہا کہ ''جس نے آج کا نظارہ دیکھا، وہ اُسے زندگی بھر بھلا نہیں سکتا۔ کس قدر تعجب انگیز اور گھناؤنا تھا۔'' اس کے بعد وہ فرداً فرداً وہ حاضرین سائنسدانوں کو مبارک دیتے ہوئے اپنے گرو اوپن ہائیمر کے پاس پہنچا اور اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا، ''ہم سب کتیا کی اولاد ہیں۔'' اس وقت تو اوپن ہائیمر خاموش رہا لیکن بعد میں اپنی بیٹی سے کہا کہ ''موزوں ترین تبصرہ بینبرج کا تھا۔'' (۳۳)

بی ۲۹ ہوائی جہاز کے کپتان پال ٹیبٹس (Paul Tibbets) نے تیس ہزار فٹ بلندی محو پرواز عملے کو خطاب کرتے ہوئے کہا (۳۴): ''آپ جاپان کی سرزمین پر ایسا ہلاکت خیز بم گرانے والے ہیں جو بنی نوع انسان کے وجود میں آنے کے بعد کبھی استعمال نہیں کیا گیا۔ صرف ایک بم کی تخریبی صلاحیت اس قدر ہے کہ یہ جہاں گرایا جائے گا اس کے تین تا چار میل کے علاقے میں بسنے والا ہر ذی روح، تمام عمارات اور دیگر اشیاء نیست و نابود ہوجائیں گی۔''
اور یہی ہوا۔



جس وقت ہوائی جہاز پر جوہری بم لادا جا رہا تھا ہوائی مستقر کے کسی کارکن نے بم پر یہ جملہ گھسیٹ دیا تھا۔ ''شہنشاہ جاپان کے لیے تہنیت و تسلیمات کے ساتھ'' (۳۵)۔ بم گرنے کے بعد جہاز کے کپتان ٹیبٹس کے بیان کے مطابق ''جب اس نے اپنی آنکھوں سے سیاہ چشمے اتارے تو اسے کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ بلکہ تھوڑی دیر کے لیے اسے محسوس ہوا کہ وہ اپنی بینائی کھو بیٹھا ہے۔'' وہ مزید کہتا ہے کہ ''جونہی اس نے سیاہ چشمہ لگایا ہوائی جہاز سرخ و تیز روشنی سے منور ہوگیا اور عملے پر خوف طاری ہوگیا۔ واضح رہے کہ ہمارا جہاز جائے وقوعہ سے ساڑھے گیارہ میل دور نکل چکا تھا اور پورے جہاز میں دراڑیں اور شکنیں پڑ چکی تھیں۔ جیسے ہم کسی گن بیٹری (Gun battrey) کی زد میں آ گئے ہیں۔'' (۳۶) جہاز کے سرے پر جو بندوقچی (Gunner) بیٹھا ہوا تھا اس نے سرخ آندھی کی لہر اٹھتے ہوئے اور اسے جہاز سے ٹکراتے ہوئے دیکھا تھا۔ جب دوسری لہر اٹھی تو خوفزدہ ہوکر اس نے عملے کو خبردار کیا۔ اس کے چند منٹوں بعد ہوائی جہاز پر سوار درجن بھر لوگوں نے مڑ کر دیکھا تو سب کے سب حواس باختہ ہوگئے۔ (۳۷) شہر تو غائب تھا۔ البتہ سیاہ اور گھنے بادلوں کے مہیب مرغولے آسمان کو جلد از جلد چھو لینے کی دوڑ میں لگے ہوئے تھے۔ دوسری جانب آگ کے شعلے بلند ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔ طیارہ میں موت کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی جہاز کے کپتان کے بموجب ''کچھ دیر بعد میرے ایک ساتھی نے میرے کندھوں کو زور زور سے ٹھوکے دیتے ہوئے کہا، ''اس طرف دیکھو...... اس طرف دیکھو...... اس طرف دیکھو......'' وہ خوف زدہ ہو رہا تھا۔ ''یہ جوہری تابکاری ہماری مردانگی کو متاثر تو نہیں کرے گی۔'' دوسرے نے کہا کہ وہ اپنی زبان پر جوہری انشقاق Fission کا ذائقہ محسوس کر رہا ہے (۳۸)۔ جنگ کے خاتمہ کے بعد ہوائی جہاز کے عملے کے ایک رکن نے نیو یارک ٹائمس کے ایک نمائندے سے کہا: ''میں نہیں سمجھتا کہ اس سے قبل کسی نے ایسا بھیانک اور گھناؤنا منظر دیکھا ہوگا۔ صرف دو منٹ قبل ہم نے ایک ہنستا بستا شہر دیکھا تھا۔ جاپان کے کئی بڑے تجارتی شہروں میں ہیروشیما واحد شہر تھا جس پر جنگ کے دوران ایک بار بھی ہوائی حملہ نہیں ہوا تھا۔ باقی ماندہ شہروں میں سے کوئی شہر بھی ایسا نہیں تھا جو ہوائی حملوں سے بچ گیا ہو۔ اس لیے جنگ کے باوجود وہاں روزمرہ کی زندگی معمول کے مطابق جاری تھی۔ اور پھر دو منٹوں کے

بعد جب نیچے نگاہ دوڑائی تو کیا دیکھتے ہیں کہ چاروں اور دھویں کے سیاہ بادلوں کی ایک گہری تہہ دار چادر ہے جس نے شہر کو اپنے اندر ڈھانپ رکھا ہے۔ اور ان گنت مقامات پر اس چادر سے آگ کے سرخ شعلے آسمان کو خاکستر کر دینے کی دوڑ میں لگے ہوئے ہیں۔ شہر اور شہر کے باسی کہاں روپوش ہو گئے تھے، کچھ پتا ہی چل نہیں رہا تھا۔ اگر میں سو سال بھی زندہ رہا تب بھی ۶ اگست کی صبح کے وہ چند لمحے میرے حافظہ سے محو نہیں ہو سکتے" (۳۹)۔ اس کے برعکس کپتان تتھیس کے لیے یہ سارا واقعہ "غیر شخصی (Impersonal)" رہا (۴۰)۔

۶ اگست، انسانیت کی تاریخ کی تاریک ترین دن۔ ہیروشیما میں لوگ معمول کے مطابق اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ ملازمت پیشہ لوگ اور طالب علم عام طور پر آٹھ بجے اپنے اپنے دفاتر اور درس گاہوں میں پہنچ چکے تھے۔ کچھ لوگ جن کے دفاتر یا دکانیں شام دیر گئے تک کھلی رہتی ہیں، وہ اپنے گھروں میں روزانہ کے معمولات میں مشغول تھے۔ شہر کے ایک متوسط علاقے میں سات افراد پر مشتمل ایک کنبہ تین کمروں کے ایک فلیٹ میں مقیم تھا۔ آٹھ بجے تک اس کنبہ میں صرف خاتونِ خانہ مسز ہزوے مصروفِ کار تھیں۔ وہ ابھی میز سے ناشتے کے برتن سمیٹ ہی رہی تھیں کہ اچانک ایک زوردار دھماکہ ہوا اور بس...... پھر انہیں کچھ پتہ نہیں۔ نہ معلوم کب ہوش و حواس بحال ہوئے، پہلے تو آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ پھر ان کی آنکھوں کی پتلیوں میں سوئی کی چبھن کے ساتھ ان کے سارے بدن میں ناقابل برداشت برقی رو دوڑ گئی جیسے انہوں نے ننگے برقی تار کو چھو لیا ہو۔ ساتھ ہی انہیں ہولے ہولے ریت گرنے جیسی آواز سنائی دی۔ پلک جھپکتے ہی جسم میں پھیلی ہوئی رو نے شدید تپش کی صورت اختیار کر لی۔ یہ تپش اس قدر بڑھی کہ معلوم ہونے لگا کہ جسم بھن رہا ہے اور سر کے بال گر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ بھنویں اور پپوٹے بھی جھڑ گئے جب جلن اور تپش ناقابل برداشت ہوئی تو وہ باتھ روم دوڑیں۔ لیکن نلکے میں پانی کہاں تھا۔ بلکہ اس کی دیوار ڈھے چکی تھی۔ اور وہ گھسٹتے ہوئے گھر سے باہر نکل آئیں۔ یہ سب عمل کل سات منٹ میں انجام پایا۔ نہ صرف وہ بالوں سے محروم ہو چکی تھیں بلکہ ان کا لباس بھی تار تار ہو چکا تھا۔ ساتھ ہی انہیں یہ بھی محسوس ہوا کہ لباس کے ساتھ جسم کی کھال سے بھی وہ محروم ہو رہی ہیں۔ چاروں طرف دھواں اور گرتی ہوئی عمارتوں کے



ملبے، دھواں ایک تو دھماکے نے پیدا کیا۔ دوسرا ریت کا جو گرتی عمارتوں نے پھیلایا تھا (۴۲)۔

گرمی اور لو کی شدت کا یہ عالم تھا کہ قدرت کے تخلیق کردہ سورج کی تپش اور حدت، انسانی ہاتھوں کے بنے ہوئے عجوبہ بم کے مقابلے میں ہیچ تھی۔ لو کی رفتار بارہ سو فٹ فی سیکنڈ تک پہنچ چکی تھی۔ وہ جو سنا تھا کہ روز حشر سورج کی اونچائی سوا نیزے تک پہنچ جائے گی تو اس دن ہیروشیما میں اسی قیامت کا سماں تھا۔ بم جس جگہ گرا تھا اس کے آس پاس کے تین ہزار گز کے رقبہ (Radius) میں درجۂ حرارت پانچ ہزار تین سو ڈگری فیرنہائٹ پہنچ چکا تھا۔ اس کا نتیجہ انتہائی ہلاکت خیز ثابت ہوا۔ امریکی اور جاپانی ڈاکٹروں کی یہ متفقہ رائے ہے کہ اس مصنوعی گرمی نے جلد میں زخم پیدا کیے۔ جنہیں سائنسدانوں نے Primary atomic bomb thermal injury کا نام عطا کیا۔ یہ زخم وقوعہ سے دو میل دور تک کے رقبہ میں بسنے والوں کے جسم کو کوئلہ کر گئے۔ ڈاکٹروں کے بیان کے بموجب عام طور پر جو لوگ جل کر زخمی ہو جاتے ہیں ان کے زخم تھرمل زخم (Thermal Injury) سے خاصے مختلف ہوتے ہیں اور نوعیت کے اعتبار سے شدید تر اور گھناؤنے بھی۔ ان زخموں کو مختلف اقسام میں تقسیم کیا گیا یعنی جہاں بم گرا تھا۔ وہاں ہزاروں لوگ نہ صرف جسم کی چمڑی سے محروم ہو گئے۔ بلکہ ننگا گوشت بھی جھلس کر کوئلہ ہو گیا۔ اسی طرح جو لوگ وقوعہ سے جتنے دور تھے ان کے زخموں کی شدت اسی قدر کم تھی۔ یہ تو بم کی زد کے براہ راست شکار تھے۔ تابکاری سے متاثرہ افراد کی حالت نہ صرف اس وقت ناگفتہ بہ تھی۔ بلکہ تین نسلوں نے اس کا بھگتان بھی ادا کیا۔ وہ اس طرح کہ پچھلی نصف صدی میں تابکاری سے متاثرہ افراد کی اولاد در اولاد بدہیئت اور جسمانی طور پر مسخ شدہ حالت میں جنم لے رہی ہے۔ گزشتہ سال انہی دنوں ہیروشیما و ناگاساکی کے متاثرہ افراد کے پوتوں اور نواسوں کے ایک وفد نے پاکستان اور ہندوستان کا دورہ کیا تھا۔ گزشتہ ماہ کی اطلاع کی بموجب تیسری جوان مسخ شدہ نسل کے ہاں بھی ایسے ہی بچے جنم لے رہے ہیں (۴۴)۔ یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا۔ یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

آج سے چودہ سال قبل ۲۶ اپریل ۱۹۸۶ء کو یوکرین (سابق سویت یونین) کے چرنوبل جوہری پلانٹ میں دھماکے کی چودھویں سالگرہ کے موقع پر دو باتوں کا انکشاف ہوا ہے۔ اوّل یہ

کہ دھماکے کے وقت کہا گیا تھا کہ حادثہ میں ۳۱ افراد ہلاک ہوئے۔ غیر سرکاری اعداد و شمار اس سے کہیں زیادہ بتائے جاتے ہیں جو پندرہ ہزار تک پہنچ چکے تھے۔ روسی خبر رساں ایجنسی اتار۔ تاس نے انکشاف کیا ہے کہ تابکاری اور زہریلے اثرات سے پچھلے پندرہ سال میں تین لاکھ اموات ہو چکی ہیں (۴۵)۔

دوسری خبر آج (۲۸ اپریل) واشنگٹن سے جاری کی گئی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ امریکہ میں سترہ جوہری مراکز میں سے پانچ دو سال قبل بند کر دیئے گئے تھے۔ نیویارک میں قائم کردہ تابکاری اور صحت عامہ کے منصوبے (Radiation & Public Health Project) کی تحقیقات کے ذریعہ یہ انکشاف ہوا ہے کہ ان مراکز سے تابکار مادّہ خارج ہوتا تھا جس کا شکار عموماً کم سن بچے ہوا کرتے تھے۔ اموات زیادہ تر پانچ یا پانچ سال سے کم عمر کے بچوں میں واقع ہو رہی تھیں۔ رپورٹ میں یہ بھی انکشاف کیا گیا ہے کہ بعض بچے پیدائشی اپاہج ہیں اور بعض کے اعضا مسخ شدہ۔ ان میں کینسر کا موذی مرض پھیلتا جا رہا تھا۔ جن مراکز کو بند کیا گیا ہے وہاں حالات میں بہتری کے آثار نمایاں ہو رہے ہیں، یعنی بچوں کی اموات کی شرح میں پندرہ تا بیس فیصد کمی واقع ہوئی ہے (۴۷)۔

رپورٹ میں مزید کہا گیا ہے کہ تابکاری کے اثرات پچاس میل کے رقبہ تک ہوا کے ذریعے پھیل سکتے ہیں۔ اس وقت امریکہ میں جوہری توانائی کے سترہ مراکز ہیں جو ملک کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک سو تین جوہری ری ایکٹر ہیں۔ ان تمام جوہری اداروں کی وجہ سے براہ راست یا بالواسطہ بیالیس ملین لوگ تابکاری کی زد میں ہیں۔ ایک اور مسئلہ تباہ کار جوہری فضلہ (Nuclear Waste) کی نکاسی کا ہے جو ظاہر ہے اسی کرۂ ارض اور اس کے سمندروں میں پھینکا جاتا ہے۔ اس طرح سمندر کی آلودگی میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ دس سال قبل جب دنیا کی دوسری بڑی طاقت کا اچانک ''حرکت قلب'' بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا، اس وقت اس کے پاس دس ہزار ایٹم بم تھے جو اس کی حفاظت نہ کر سکے۔ یورپ کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور خوش حال ملک جرمنی ہے، یہی حال ایشیا میں جاپان کا ہے۔ دونوں ممالک کے پاس نہ تو جوہری بم ہے اور نہ وہ اقوام متحدہ کی حفاظتی کونسل کے رکن ہیں اور



نہ پانچ (نہیں، نہیں، سات) عالمی طاقتوں کے کلب (لفظ کلب قابل توجہ ہے) کے رکن ہیں۔

ہیروشیما اور ناگاساکی پر جو بم گرائے گئے تھے، وہ ابتدائی نوعیت کے تھے۔ اس کے باوجود جو تباہی مچی اس کا احوال آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ گزشتہ نصف صدی میں جوہری توانائی نے کئی گنا ترقی کر لی ہے۔ اسی مناسبت سے جوہری بموں کے ساتھ بھی تابکاری ماڈے کے مُہلک اثرات میں بھی اسی مناسب سے اضافہ ہوا ہے۔ اس وقت غیر سرکاری اعداد و شمار کے مطابق مختلف ممالک میں ۳۰ تا ۳۵ ہزار جوہری بموں کا انبار لگا ہوا ہے جن کی تخریبی قوت ہمارے کرۂ ارض تو کیا، ایسی پچاسوں دُنیاؤں کو چند منٹوں میں صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر سکتے ہیں (۴۸)۔ یہ ہلاکت خیز قوت انسان کو کہاں لے جائے گی؟ کل کیا ہوگا؟ جنگ ہوگی؟ تو فاتح اور مفتوح کون ہوگا؟ اسی طرح کا ایک سوال اس صدی کی عظیم ترین شخصیت البرٹ آئن سٹائن سے کیا گیا۔ اس کا جواب تھا:

''یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ تیسری جنگ کا کیا نتیجہ نکلے گا۔ ہاں، یہ یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ چوتھی جنگ لاٹھیوں اور پتھروں سے لڑی جائے گی۔''

اب ہمارے سامنے سوال یہ ہے کہ ہندوستان پاکستان، دونوں ممالک جنھوں نے اسی مہلک جوہری ہتھیار کے حصول کے لیے ناقابل فہم سرمایہ لگا دیا، وہ اپنی اگلی اور پھر اس سے اگلی جنگ کن ہتھیاروں سے لڑیں گے؟

یکم مئی ۲۰۰۰ء

## ماخذات

۱۔ پوکھرن اور چاغی میں دھماکوں کے فوراً بعد دنیا بھر کے صحافیوں نے برصغیر کی جانب رخ کیا اور خاص کر دونوں ملکوں کے ایٹمی دھماکوں میں کیے گئے علاقے اور آس پاس کے دیہاتوں کے لوگوں کے تاثرات حاصل کر کے اپنے اپنے اخبارات میں شائع کیے۔ نامہ نگار کینتھ جے کوپر کا سلسلہ وار مضمون پشاور کے فرنٹیئر پوسٹ ۳ جنوری ۱۹۹۹ء میں شائع ہوا۔ اس مضمون کا ابتدائی حصہ انھی مضامین پر مشتمل ہے۔

۲۔ روز نامہ دی نیشن لاہور ۲۰ مارچ ۱۹۹۹ء

۳۔ فرنٹیئر پوسٹ، پشاور ۳ جنوری ۱۹۹۹ء

۴۔ ڈان۔ کراچی۔ یکم جون ۱۹۹۸ء از اقبال احمد When mountain dies

۵۔ ماہنامہ ہمال، کھٹمنڈو، جولائی ۱۹۹۸ء

۶۔ ڈان ۲۱ مئی ۱۹۹۸ء

۷۔ ڈان ۱۲ نومبر ۱۹۹۸ء

۸۔ فرنٹیئر پوسٹ، ۳ جنوری ۱۹۹۹ء

۹۔ دی نیوز ۲۴ اپریل ۲۰۰۰ء

۱۰۔ Human Development in S:Asia, P-37-38, Dr Mahbubul Haq Oxford University Press, Karachi 1997.

۱۱۔ ہفتہ وار سنڈے، کلکتہ ۷ جولائی ۱۹۹۲ء

۱۲۔ ڈاکٹر محبوب الحق، ۹۰۔۱۰۱

۱۳۔ دی نیشن ۱۶ اپریل ۲۰۰۰ء

۱۴۔ ایضاً

۱۵۔ دی نیوز ۱۸ اپریل ۲۰۰۰ء

۱۶۔ انڈیا ٹوڈے، دہلی ۱۰۔۱۵ اکتوبر ۱۹۹۸ء

۱۷۔ رونامہ ایشین ایج، دہلی، ۱۵ دسمبر ۱۹۹۸ء

۱۸۔ ایضاً

۱۹۔ The Making of the Atomic Bomb P-173, Richard Rhodes, published by Simon & Schuster, New York, 1986

۲۰۔ The Making of the Atomic Bomb P-210-15. P180, F.S. Dalton, John Willy & Sons, 1978

۲۱۔ The Maker of A. Bomb P29; Oxford Reference Dictionary



P-381, edifed by Judy Pearsall & Prill Trumbled, Oxford University Pres, 1995; The Encyclopaedia Britannica Vol-6 p-625, Chicago, 1988

۲۲۔۲۳۔ ایضاً۔ Scientists in Power P-29, Spener R. Weart, New York.1982

۲۴۔ Oxford Ref. Dictionary-381

۲۵۔ Scientists in Power-19; Oxford R. Dictionery-p 381

۲۶۔ India: the Maker of A.Bomb p.124-29

۲۷۔ Scientists in Power-p-130; The Makers of A.bomb-p-572

۲۸۔ Are Scientists different? M. Lewis Terman- P-290 Washington, 1955

۲۹۔ Perspective in Modern Physics, P-45-51 Stanislaw Ulam, MIT Press 1971

۳۰۔۳۱۔۳۲۔ TIME magazine: Person of the Century 31, Dec. 1999; Albert Einsten: Creator & Rebel, Bancsh Hoffman, New American Library, New York; The 100; A Ranking of the Most Influential Persons in History, pp-82-9, Michael H.Hart, N.Y.,1978

۳۳۔ The Makers of A.Bomb-p-257 Creator and Rebel-pp 43-54

۳۴۔ Scientists in Power-p-120; The Makers of the A.Bomb p-570-9

۳۵۔ The Makers of A.bomb p-275-9

۳۶۔ Ibib-P-629-31

۳۷۔ Ibib-P-521-2

Einstein : Creator and Rebel- P 207; Einstein: A Centenary Volume pp7-24, edited by A.P. French, Harvard University Press, Cambridge, USA, 1997.

۳۸۔ The Makers of A.bomb p-288-9

۳۹۔ The Day Man Lost-p-45-51; The Makers of the A.bomb-p-505

۴۰۔ ڈان ۔۱۲۔۶۔اگست ۱۹۹۸ء۔ The Day The Man Lost-p-120

۴۱۔ The Makers of A.bomb p-615

۴۲۔ Chronicle of the 20th Century, p628, Longman Chronicle, Paris, 1988

۴۳۔ The Makers of A.bomb pp-617-8

۴۴۔ Ibid-585

۴۵۔ The Makers of A.Bomb p-710-21

۴۶۔ Ibid

۴۷۔ The Day The Man Lost pp 231-5

۴۸۔ Ibid

۴۹۔ دی نیوز کراچی ۲۷ اپریل ۲۰۰۰ء

۵۰۔ ڈان ۲۸ اپریل ۲۰۰۰ء



# اَے نوعِ بشر جاگ!

پہلے بھی بہت سے ہوچکے ہیں آدم
یہ آدمِ بوالبشر تو اب تھا

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے یہ شعر خواجہ میر دردؔ کا ہے۔ حقیقی فنکار (خصوصاً شاعر و ادیب) اور دانشور بہ قول غالبؔ ''رگِ سنگ'' میں ''رقصِ بتاں'' اور صحرا کے راستوں اور پگڈنڈیوں کو ''تن صحرا'' میں ''نبض تپاں'' کی صورت دیکھ لیتے ہیں اور بہ قول اقبالؔ ان کی نگاہِ تیز دلِ وجود کو چیر جاتی ہے۔ اُن کی نظر ازل اور ابد کے درمیان، پیچھے اور آگے دونوں سمتوں میں، تخیل اور وجدان کے سہارے دور دور تک پہنچ جاتی ہے۔ چنانچہ یہ شعر یا تو خواجہ میر دردؔ کی دلِ وجود کو چیر جانے والی نگاہ اور اُس نظر کا انکشاف ہے جو ازل اور ابد کے درمیان دور دور تک سفر کرتی ہے یا اُس حدیث کو پڑھنے کے بعد القا ہوا ہے جس میں ایک صحابی رسولِ اکرمؐ سے پوچھتے ہیں کہ آدم سے پہلے کون تھا، تو آپؐ جواب دیتے ہیں آدم۔ وہ پوچھتے ہیں اُن سے پہلے تو آپؐ فرماتے ہیں آدم۔ اِسی طرح تین چار بار پوچھنے پر ہر بار آپؐ کا جواب آدم ہوتا ہے۔ بہرحال، یہ شعر ہمیں بتاتا ہے کہ اُس آدم کے ظہور سے قبل، جس کی ذُرّیت ہم لوگ ہیں، کائنات میں بے شمار ذی روح مخلوقات نمودار ہوکر فنا کے گھاٹ اُتر چکی ہیں۔ کیا ہمارا حشر بھی اُنہی جیسا ہوگا؟ ایسا ہوسکتا ہے۔ مگر یہ حشر فطرت یا قدرت کے ہاتھوں ہو، جس نے ہمیں تخلیق کیا ہے، تو اتنا افسوسناک اور گھمبیر نہیں ہوگا جتنا اُس صورت میں کہ یہ ہمارے اپنے ہاتھوں عمل

میں آئے۔ اس خلجان کو دور کرنے میں دو باتیں ہمیں سہارا دیتی ہیں۔ ایک تو ہماری یعنی موجودہ نوعِ بشر کی اپنے کو باقی رکھنے کی جبلت، دوسرے اِس کی ذہنی ارتقا کا احوال جو اِس اُمید پرور امکان کو تقویت بخشتا ہے کہ ہماری نوع کو شاید بقائے دوام نصیب ہوجائے۔ ایک زمانہ تھا کہ غار ہمارا مسکن تھے اور آج ہم خلاؤں میں گشت کررہے ہیں۔ اقبال نے کہا تھا۔

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

اور جوشؔ یوں گویا ہوتے تھے۔

آدمی کی خاک میں پیغمبری
اک فقط پیغمبری کیا، داوری

آدمی یا بشر خلاق پیدا ہوا ہے، اور یہی خلاقی اُس کی بقا کی ضامن نظر آتی ہے۔ لیکن وہ جو کسی شاعر نے کہا ہے۔

تجھ کو خبر نہیں ہے کہ ہیں کتنے ہفت خواں
جامِ شرابِ ناب و لبِ مے گسار میں

تو ذہنِ بشر کے اس بے نظیر ارتقا کی راہ میں متعدد ہفت خوان آتے اور گزر جاتے ہیں، مگر ایک ہفت خوان ایسا ہے جو انسانی تہذیب کے ابتدائی دور سے آج تک نوعِ بشر کی ہمہ جہتی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنا ہوا ہے۔ یہ ہفت خوان طبقاتی سماج کی صورت میں نوعِ بشر کی ایک چھوٹی اقلیت کو بہت بڑی اکثریت پر مسلط کیے ہوئے ہیں۔ اِس چھوٹی سی اقلیت یا یوں کہیے کہ صاحبانِ اقتدار اور اُن کے گماشتوں کی ہوس کا اور چھور نہیں ہے۔ انہوں نے زندگی کی ہر آسائش کو اپنے قبضۂ قدرت میں رکھنے کے لیے شاطرانہ چالوں اور عیارانہ ہتھکنڈوں سے کام لے کر ایسی فضا قائم کر دی ہے کہ مفلس و نادار عظم اکثریت یعنی عوام، جو اپنی ان تھک محنت سے یہ آسائشیں فراہم کرتے ہیں، لاعلمی اور بے خبری کی دلدل میں دھنسے رہیں اور اپنی ہلاکت خیز محرومیوں اور نامرادیوں کو اپنا مقدر سمجھ کر خوابِ غفلت میں پڑے رہیں۔ گزشتہ اور رواں صدیوں یعنی انیسویں اور بیسویں صدی میں صنعتی عہد کے جڑیں پکڑ لینے اور ذرائع ترسیل و



ابلاغ کی ترقی اور پھیلاؤ کے باعث عوام کے ایک حصے کو اپنے حقوق کا قرار واقعی شعور پیدا ہو چلا اور انہوں نے صاحبانِ اقتدار اور ان کے گماشتوں کی بالادستی کے خلاف موثر احتجاج اور جدوجہد کے دوران بے دریغ قربانیاں دے کر بہت کچھ حاصل کرلیا۔ مگر ابھی بہت کچھ کا حصول باقی ہے۔ سب کچھ حاصل کرنے کے لیے، جو اُن کا پیدائشی حق ہے، پوری نوعِ بشر کا بیدار ہونا ضروری ہے جبکہ غالب اکثریت ابھی تک خوابِ غفلت کا شکار ہے۔ ساری نوعِ بشر جاگ جائے تو وحدتِ انسانی کا خواب حقیقت کا رنگ پکڑے۔ اس خواب کے حقیقت بنے بغیر اُس منزل تک پہنچنا ممکن نہیں جہاں انسان کی حقیقی عظمت کا آفتاب طلوع ہوگا۔ لیکن صاحبانِ اقتدار وحدتِ انسانی کو پارہ پارہ کرنے پر تلے بیٹھے ہیں۔ ایک طرف مختلف ممالک کے مقتدر حضرات اپنے مقبوضہ ملکوں کے تحفظ کے لیے، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اپنے اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے اور دائمی بنانے کی غرض سے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی فکر میں لگے رہتے ہیں، اور دوسری طرف اپنے گماشتوں کے ذریعے انہوں نے مذہب، رنگ و نسل، قومیت، زبان وغیرہ کے اختلافات کو ہوا دے کر مفلسی ناداری اور لاعلمی اور بے خبری میں غوطے کھانے والے عوام کو دست و گریباں کر رکھا ہے۔ حالانکہ یہ اختلافات حیاتِ انسانی کی بوقلموں اور رنگا رنگی کے مظاہر ہونے کے علاوہ کثرت میں وحدت کے حسن کو دوبالا کرتے ہیں۔

اپنی مطلب برآری کے لیے اربابِ اقتدار مختلف النوع بحران پیدا کرتے رہتے ہیں۔ دوسری جنگِ عظیم کے آخر دنوں میں اُنہوں نے ایک ایسے عالمی بحران کی نیو رکھی جو پچپن سال بعد آج بھی جاری ہے اور نہ جانے کب تک جاری رہے گا۔ یہ بحران یا تو نوعِ بشر کو فنا کے گھاٹ اُتار کر یا اُس کی بقا کا سامنا فراہم کرکے ہی ختم ہوگا۔ ہوا یہ کہ ۶ اگست ۱۹۴۵ء کو امریکی صدر ٹرومین کے حکم پر جاپان کے شہر ہیروشیما کو دُنیا کے پہلے ایٹم بم کا نشانہ بنایا گیا۔ آنِ واحد میں لاکھوں کی آبادی کا یہ شہر راکھ کا ڈھیر بن گیا۔ جو تھوڑے بہت لوگ بچے وہ بے شمار گھاؤ کھا کر ذہنی اور جسمانی طور پر مسخ اور زندہ درگور ہوکر رہ گئے۔ تین دن بعد یہی عمل جاپان کے ایک اور شہر ناگاساکی کے ساتھ دوہرایا گیا۔ ایٹمی توانائی کا انکشاف صاحبانِ اقتدار کے لیے بندر کے ہاتھ کی ادرک بن گیا۔ اسے کلیتاً انسانی فلاح و بہبود کے لیے استعمال کرنے کے بجائے بیشتر

ہتھیاروں کی تیاری کے کام میں لایا گیا۔ اِس سلسلے میں مختلف ایٹمی تجربات کے جو ذہن کو چکرا دینے والے اخراجات آتے ہیں انہیں صرف چوٹی کے چند ترقی یافتہ ممالک ہی برداشت کر سکتے ہیں، لہٰذا نام نہاد ایٹمی کلب صرف امریکا، روس، چین، فرانس اور برطانیہ پر مشتمل تھا۔ ایٹمی اسلحے نے دنیا کو مکمل تباہی و بربادی کے جس خطرے سے دوچار کر دیا ہے اُس پر بعض سوجھ بوجھ رکھنے والوں کے احساس دلانے پر اربابِ اقتدار اوپری دل سے ایٹمی تجربات پر پابندی لگانے اور ایٹمی ہتھیاروں کے انبار میں کمی کرنے کی بات کرنے لگے ہیں، مگر یہ خطرہ اُس وقت تک نہیں ٹل سکتا جب تک ایٹمی ہتھیاروں کو تمام و کمال ختم نہ کر دیا جائے۔ ایٹمی ہتھیاروں پر جو لاگت آتی ہے اُس کا عشر عشیر بھی انسانی فلاح و بہبود پر خرچ کیا جاتا تو دنیا سے غربت کا خاتمہ ہو جاتا اور تعلیم، علاج معالجے اور روزگار کے مواقع یکساں طور پر ہر فرد بشر کو حاصل ہوتے۔

اس عالمی تناظر میں اب آئیے اپنے خطۂ ارض کی طرف۔ جنوبی ایشیا، جو کبھی ایک ملک ہندوستان کہلاتا تھا اور اب بھارت، پاکستان اور بنگلہ دیش نامی تین ملکوں پر مشتمل ہے، دنیا کا غالباً واحد علاقہ ہے جہاں کے لوگ لنگوٹی پر پھاگ کھیلنے کو اپنا طرہ امتیاز سمجھتے ہیں۔ چنانچہ بھارت نے، جس کی ایٹمی ہتھیار بنانے کی صلاحیت ۱۹۷۴ء ہی میں دُنیا کے سامنے آ گئی تھی، گیارہ مئی ۱۹۹۸ء کو راجستھان کے ایک دور افتادہ مقام پوکھرن میں، جو پاکستان کی سرحد کے قریب واقع ہے، پانچ ایٹمی دھماکے کیے۔ بھارت اور پاکستان ایک ہی دھرتی کی کوکھ سے پیدا ہونے والے اوپر تلے کے بھائی ہیں اور دیکھا یہ گیا ہے کہ اوپر تلے کے بھائی بہنوں کا لڑکپن نفاق پرور ہوا کرتا ہے اور آپس میں وہ لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔ (بالغ اور سمجھ دار ہونے کے بعد یہ صورتِ حال نہیں رہتی۔) چنانچہ بھارت اور پاکستان کے درمیان شروع ہی سے نفاق انگیز فضا قائم ہو گئی تھی اور دونوں ایک دوسرے کو اپنا دشمن سمجھنے لگے تھے۔ اس دشمنی کا عملی مظاہرہ تین جنگوں اور اور پاکستانی حکمرانوں کے مشرقی پاکستان کو اپنی کالونی سمجھنے نیز بھارت کی فوجی مداخلت کے باعث بنگلہ دیش کے قیام کی صورت میں ہوا۔ بھارت اور پاکستان کی ایٹمی ہتھیار بنانے کی کوششیں بھی بڑی حد تک اس دشمنی کا شاخسانہ تھیں۔ اب بڑے بھائی نے پوکھرن میں پانچ ایٹمی دھماکے کیے تو چھوٹا بھائی پیچھے کیسے رہ سکتا تھا۔ پاکستان نے، جو ایک عرصے سے ایٹمی



اسلحہ سازی کی صلاحیت حاصل کرنے کی کوششوں میں لگا ہوا تھا، بھارتی دھماکوں کے ٹھیک سترہ دن بعد بلوچستان کے ایک مقام چاغی میں چھے ایٹمی دھماکے کر کے اپنی سبقت کا سکہ بٹھا دیا۔ ایٹمی کلب میں پانچ انتہائی ترقی یافتہ ممالک کے اتھ دو ننگے بھوکے ملکوں کا اضافہ ہو گیا۔

انسانی صورتحال سنگین ہو تو نوع بشر کو اس سے نکالنے کے لیے دانشوروں کے علاوہ فن کاروں خصوصاً شاعروں اور ادیبوں پر سب سے زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ یہ ذمہ داری بہ منزلۂ فرض ہوتی ہے کیونکہ یہ لوگ، روحِ انسانی کے معمار ہوتے ہیں۔ اِس فرض کو پورا کیسے کیا جائے؟ اقبالؔ کہتے ہیں۔

برہنہ حرف نہ گفتن کمال گویائی
حدیث خلوتیاں جذبہ رمز و ایمانیست

یعنی اعلیٰ پائے کا فن ابہام لطیف کا متقاضی ہے۔ گفتگو کا کمال یہ ہے کہ حرفِ برہنہ کی صورت میں یعنی دو اور دو چار کے انداز میں کھل کر صاف صاف نہ کی جائے، اس لیے کہ خلوتیوں (یعنی خواص) سے رمز و ایما میں باتیں کرنا ہی مزا دیتا ہے۔ لیکن خلوتیوں کے ساتھ جلوتیوں (یعنی عوام سے) بھی تخاطب ہو تو فن کا تقاضا بدل جاتا ہے اور تکنیکی و فنّی لوازم کے ساتھ اکثر و بیشتر حرف برہنہ کا سہارا لینا پڑتا ہے، یعنی کھلی کھلی صاف صاف باتیں کرنا پڑتی ہیں۔ اس ضمن میں اقبالؔ کہتے ہیں۔

مردِ فقیر آتش است، میری و خسروی خس است
فال و فرِ ملوک را حرفِ برہنہ ای بس است

مطلب یہ کہ عوام آگ ہیں اور اربابِ اقتدار خس و خاشاک، اور اربابِ اقتدار کی شان و شوکت اور دبدبے کے خاتمے کے لیے اک حرفِ برہنہ یعنی کھل کر صاف صاف الفاظ میں دھڑے کے ساتھ ایک للکار بہت کافی ہے۔ اس پس منظر کو ذہن میں رکھیے تو آپ دیکھیں گے کہ ہیروشیما پر پہلا ایٹم بم گرائے جانے کے بعد دُنیا بھر میں سوجھ بوجھ رکھنے والے درد مند دانشوروں اور فن کاروں نے اُس عالمی بحران کے عوامل میں موثر احتجاجی آواز بلند کی۔ اربابِ اقتدار نے، جنہیں اقتدار کی بے پایاں ہوس نے اندھا کر دیا، مختلف ہتھکنڈوں سے اِن

آوازوں کو دبانے کی کوشش کی لیکن، جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، مجبور ہو کر اُوپری دِل سے اب وہ ایٹمی تجربات پر پابندی اور ایٹمی اسلحہ کے انبار میں کمی کی باتیں کرنے لگے ہیں۔

ہمارے خطہ ارض میں ہیروشیما اور ناگاساکی کے المیے سے متاثر ہو کر ایٹمی توانائی کو جارحانہ مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے خلاف اُردو کے جن ادیبوں اور شاعروں نے آواز بلند کی، اُن میں پہلی موثر آواز احمد ندیم قاسمی کی تھی (افسانہ ''ہیروشیما سے پہلے، ہیروشیما کے بعد'') قاسمی کے بعد سعادت حسن منٹو (چچا سام کے نام پانچواں خط)، کرشن چندر (ڈرامہ، ''ہائیڈروجن بم کے بعد'') ڈاکٹر حسن منظر (افسانہ، ''زمین کا نوحہ'') اور محمد سلیم الرحمٰن (افسانہ، ''راکھ'') کی آوازوں میں بڑی کشش ہے۔ ان سب کی بلند پایہ تخلیقات میں احمد ندیم قاسمی کا افسانہ ''ہیروشیما سے پہلے، ہیروشیما کے بعد'' اپنی اوّلیت کے لحاظ سے ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ اس حقیقت افروز افسانے میں، جو خوش اسلوبی سے سارے فنی لوازمات پورے کرتا ہے، حرفِ برہنہ سے کام لے کر یعنی صاف صاف الفاظ میں کھل کر بات کرنے کا ڈھنگ اپنا کر حقائق کی عکاسی بڑی جامعیت کے ساتھ کی گئی ہے۔ ہیروشیما کے المیے سے متعلق ہندی کے جو چند فن پارے میری نظر سے گزرے ہیں ان میں اگیئے (Ageyeya) کی نظم ''ہیروشیما'' نے مجھے بہت متاثر کیا۔ یہ بڑی دِلدوز نظم ہے جو حساس آدمی کو ہلا کر رکھ دیتی ہے۔ ''ہیروشیما'' ہی کے عنوان سے شیخ ایاز کی سندھی نظم بھی خاصی موثر ہے جس کا اردو ترجمہ فہمیدہ ریاض نے کیا ہے۔ اس سلسلے میں جنوبی ایشیا کی ساری اہم زبانوں میں اچھا خاصا ادب تخلیق ہوا ہے۔

اب سے دو سال قبل ۱۱ مئی ۱۹۹۸ء کو بھارت نے اور ۲۸ مئی ۱۹۹۸ء کو پاکستان نے جو ایٹمی دھماکے کیے تو دونوں ملکوں کے ارباب اختیار جانتے تھے کہ اُن کی نظر میں جو دانشور اور فنکار سرپھرے واقع ہوئے ہیں، وہ یقیناً صدائے احتجاج بلند کریں گے۔ لہٰذا اس آواز کو دبانے اور اپنے سادہ لوح عوام کو، جن کی نصف سے زیادہ آبادی کو دو وقت کی روٹی اور پینے کا صاف پانی تک میسر نہیں ہے، بے وقوف بنانے کے لیے دھماکوں کے فوراً بعد دونوں ملکوں کے ارباب اقتدار نے اپنے اپنے ملکوں کے ایٹمی طاقتیں بن جانے پر خوشی کے شادیانے بجائے۔ پاکستان میں سرکاری سطح پر زبردست جشن منایا گیا۔ ۲۸ مئی ۱۹۹۸ء کو پاکستان کی اب تک کی تاریخ کا اہم



ترین اور عہد ساز دن قرار دیا گیا۔ سرکاری اور سرکار کے حاشیہ بردار ذرائع ابلاغ نے پاکستان کے ایٹمی طاقت بن جانے کا وہ ڈھول پیٹا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دے۔ پاکستان کے مسند نشینوں کو یہ زعم کہ کلکتہ تک ان کے ایٹمی اسلحہ کی زد میں ہے اور بھارت کے راج سنگھاسن پر براجمان ہونے والوں کی یہ پرتگیا کہ اگرچہ پورا پاکستان اُن کے ایٹمی ہتھیاروں کی زد میں ہے لیکن انہیں پاکستان کے کسی بھی شہر کو نشانہ بنانے کی ضرورت نہیں۔ وہ صرف سیاچن گلیشیر پر ایک ایٹم بم گرا دیں گے تو گلیشیر کی برف کے پگھلنے سے جو سیلاب آئے گا وہ سارے پاکستان کو غرقاب کر کے بحر عرب میں جا کر دم لے گا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ خدانخواستہ بھارت اور پاکستان کے درمیان، پاگل پن کی رو میں بہہ کر، ایٹمی جنگ چھڑ گئی تو دونوں ممالک کی تباہی و بربادی لازمی اور یقینی ہے۔ ایٹمی دھماکے کر کے بھارت اور پاکستان نے درحقیقت باہمی خودکشی کے ممکنہ اقدام کی جانب قدم اٹھایا ہے۔

بہر حال، بھارت اور پاکستان دونوں ملکوں کے سماجی شعور رکھنے والے دردمند دانشوروں اور فن کاروں نے اِن دھماکوں کے خلاف احتجاجی آوازیں بلند کیں۔ بھارت میں بلند ہونے والی متعدد آوازوں میں سب سے زیادہ بلند آہنگ آواز اروندھتی رائے کی تھی۔ اُن کا مضمون بھارت ہی نہیں، بہت سے ممالک میں بڑی توجہ کے ساتھ پڑھا گیا۔ پاکستان میں جن دانشوروں اور فن کاروں نے اپنی پرخلوص تخلیقات کی صورت میں موثر احتجاجی آوازیں بلند کیں، ان میں انتظار (میرے اور کہانی کے بیچ، ''مورنامہ'')، آصف فرخی (افسانہ، ''خواب میں سفر'')، ضیا جالندھری (نظم، ''عرضداشت'')، انور احسن صدیقی (نظم، ''چاغی اور پوکھرن'')، گوہر ملک (افسانہ، ''اور بلوچ نے مجھے دھکا دیا'')، جمال نقوی (نظم، ''خودکشی'')، کشور ناہید (نظم، ''کس سے پیمانِ وفا'')، شاہ محمد پیرزادہ (سندھی نظم اور اُردو ترجمہ، ''ایٹمی دھماکے کا جشن'') کی آوازوں میں بڑا سوز اور درد ہے۔ ایٹمی توانائی کے جارحانہ استعمال کے خلاف شعرو ادب میں احتجاجی آوازوں کی اس کھیپ میں، دو فن پاروں یعنی انتظار حسین کے ''مورنامہ'' اور ضیا جالندھری کی ''عرض داشت'' کو وہی امتیازی حیثیت حاصل ہے جو ہیروشیما کے المیے کے بعد سنائی دینے والی پہلی کھیپ کی آوازوں میں احمد ندیم قاسمی کے افسانے ''ہیروشیما سے پہلے،

ہیروشیما کے بعد'' کی ہے۔

سرکاری پروپیگنڈے کے ڈھول تاشوں کے شور وشر میں یہ ہوشمندانہ آوازیں پوری طرح سنی نہیں جا سکی ہیں۔ کچھ ایسا بندوبست ہونا چاہیے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اِن آوازوں کو سن کر اُس خطرے سے کماحقہٗ آگاہ ہوسکیں جو آج نوع بشر کی بقا کو درپیش ہے۔ ضرورت امر کی ہے کہ اس سلسلے میں انگریزی اور اردو سمیت دنیا کی اہم زبانوں میں جو بلند پایہ ادب تخلیق ہو رہا ہے اسے ترجموں کے ذریعے دنیا بھر کے لوگوں تک پہنچانے کی تدابیر اختیار کی جائیں تاکہ نوعِ بشر کے بچاؤ کی عالمی جدوجہد زور پکڑے اور زقندیں بھرنے لگے۔

آج کل نیویارک میں اقوامِ متحدہ کے زیرِ اہتمام ایک کانفرنس ہو رہی ہے جو ایک مہینے تک جاری رہے گی۔ اس میں دُنیا کے ایک سو ستاسی ممالک کے مندوبین شرکت کر رہے ہیں۔ اس کانفرنس کا مقصد ایٹمی اسلحہ سازی کے رجحان کا جائزہ لینے اور اس کے پھیلاؤ کو روکنے کی تدابیر پر غور وخوض کرنا ہے۔ ۲۳ اپریل ۲۰۰۰ء کو اس کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل کوفی انان نے کہا کہ عالمی ایٹمی جنگ کا خوفناک امکان انسانیت کو درپیش ایک حقیقی خطرہ ہے۔ انہوں نے بھارت اور پاکستان کے ایٹمی دھماکوں کو امن عالم کی کوششوں میں ایک تشویش ناک رُکاوٹ قرار دیا۔

کبھی کبھی انسانی زندگی میں ایسے مقامات آجاتے ہیں کہ سماجی شعور اور دردمندی رکھنے والے دانشوروں اور فن کاروں کو سچائی کا اظہار گھما پھرا کر نہیں بلکہ حرفِ برہنہ کو کام میں لا کر کھلے ڈلے الفاظ میں کرنا ضروری ہوجاتا ہے۔ آج صرف پاکستان اور بھارت ہی کے لوگ نہیں، ساری نوعِ بشر ایک ایسے مقام پر کھڑی ہے، جہاں سے آگے بڑھنے کے صرف دو راستے ہیں۔ ایک فنا کی طرف جاتا ہے اور دوسرا بقا کی جانب۔ فنا کا راستہ مسدود کرنے کے لیے ہوشمند دانشوروں اور فن کاروں پر لازم آتا ہے کہ وہ نوعِ بشر کو پوری طرح بیدار کرنے کا فرض جوش کے دیے ہوئے اِس نعرے کو اپنا نصب العین بنا کر ادا کریں کہ

اے نوعِ بشر، نوعِ بشر جاگ، نوعِ بشر جاگ،
اے نوعِ بشر جاگ!



# زمین اظہار چاہتی ہے

ایک واقعہ بہت سے اندیشوں کو جنم دیتا ہے: ۲۸ مئی ۱۹۹۸ء بلوچستان کے ضلع چاغی میں کامیاب جوہری دھماکے کے بعد پاکستان دنیا کے ان طاقت ور ممالک میں شامل ہوگیا جو جوہری توانائی کو مہلک ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کی استطاعت رکھتے ہیں۔ یہ دن اور یہ مقام Ominous معلوم ہوتے ہیں۔ ایسے دنوں کو عام طور پر تاریخ ساز کہا جاتا ہے لیکن یہ دن اور اس کے مضمرات، تاریخ کے امکان ہی کو معدوم کر سکتے تھے۔ ایسے تمام اندیشوں سے بالاتر اور جشن کی کیفیت سے سرشار ہو کر سرکاری ذرائع ابلاغ نے اس کو ''پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد سب سے زیادہ اہم دن'' قرار دیا۔ اس دن کا خصوصی نام تجویز کرنے والے کے لیے نقد انعام کے اعلان کے ساتھ ساتھ جیسے بلند آہنگ قومی وملّی نغموں کا سیلاب آگیا۔ جذبے ایسے اولوالعزم تھے کہ ان کے لیے قبائے ساز والفاظ تنگ پڑی جا رہی تھی۔ اور جیسا کہ قومی جشن کے مواقع پر ہوتا ہے، ریڈیو اور ٹیلی وژن سے مشاعرے نشر کیے گئے جن میں بہت سے نامور ومستند شعرائے کرام نے شرکت کی اور اس دن کے لیے خاص طور پر لکھے جانے والے کلام سے نوازا۔ یوں اس دھماکے کے فوری تباہ کن مضمرات زبان وادب کے میدان میں ظاہر ہوئے۔ زبان کا گھاؤ پھیل کر دہانِ زخم بھی بن جاتا ہے۔ کچھ سخن وروں نے یہ راستہ بھی اختیار کیا۔ جشن کی اس کیفیت میں، کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی مگر اس نقار خانے میں چند ایک آوازیں دبی دبی سہی، کچھ مختلف روّیوں کا اظہار بھی کر رہی تھیں۔

یہ آوازیں نشریاتی اداروں اور ابلاغ عام کے دوسرے ذرائع سے الگ تھلگ رہنے کی وجہ سے بکھر کر رہ گئی تھیں۔ چنانچہ رائے عامہ پر ان کا خاطر خواہ اثر پڑنا تو دور کی بات ہے، بہت

سے لوگوں کو یہ اندازہ ہی نہیں ہوا کہ اس نہج اور اس انداز کا ادبی اظہار بھی سامنے آیا ہے۔ زیرِ نظر انتخاب میں، مترادف روّیے کی حامل ان آوازوں کو یک جا کرنے کی کوشش کی گئی ہے جن کا بنیادی حوالہ ادب ہے۔

آج کے خطروں سے آگاہ ان تحریوں کا سلسلہ بعض نسبتاً پرانی تحریروں سے جڑ جاتا ہے۔ ایٹم بم اور اس کی فقید المثال تباہ کاری کا ذکر اردو ادب میں دوسری جنگِ عظیم کے انجام کے فوراً بعد ہی ظہور پذیر ہوا۔ اسی زمانے میں احمد ندیم قاسمی نے ''ہیروشیما سے پہلے، ہیروشیما کے بعد'' لکھا۔ میدان جنگ کی غارت گری سے دور، پنجاب کے ایک چھوٹے سے گاؤں کا غریب گھرانا بھی اس طرح زد میں آجاتا ہے کہ ان کی زندگیاں بھی اجڑ کر رہ جاتی ہیں اور افسانے کا خاتمہ جنگ کی لائی ہوئی بربادی کے الم ناک احساس پر ہوتا ہے۔ کرۂ زمین کے مختلف حصوں پر موجود لوگوں کے ایک دوسرے سے وابستہ ہونے اور ایک جگہ کی تباہی سے عالمگیر تباہی کا امکان نمودار ہونے کا یہ احساس ہی اس افسانے کی کامیابی ہے۔ یہ احساس ایک افسانے سے ہی قائم ہوسکتا تھا، کسی دستاویزی رپورٹ سے نہیں۔ ایذرا پاؤنڈ نے ادب کو وہ خبر قرار دیا تھا جس کی تازگی برقرار رہتی ہے۔ یعنی وہ خبر، جو خبر بنی رہتی ہے۔ اس افسانے کی معنویت جیسے ان دنوں ایک بار پھر نمایاں ہوگئی ہے۔ یہ کہانی اب ہیروشیما سے چل کر ہماری رگ جاں سے قریب تر آ گئی ہے۔

جس دھماکے نے ہیروشیما کو شہر سوختہ بنا ڈالا، اس کا کچھ نہ کچھ اثر اُردو ادب میں سامنے آتا رہا۔ ابن سعید کے افسانے ''ہیروشیما'' کی بازیافت کی ضرورت ہے۔ ساحر لدھیانوی کی نظم ''پرچھائیاں'' میں جنگ اور عالم گیر خطرے کا اظہار بہت واشگاف انداز میں ہوا ہے۔ کرشن چندر نے لوک کہانی کے انداز کو علامتی طور پر اجاگر کرکے ''ہوا کے بیٹے'' اور ایک مختصر ڈرامائی اسکیچ ''ہائیڈروجن بم کے بعد'' لکھا۔ واقعیت اور جذباتیت کے اسی رجحان کو اپنا کر کئی افسانے لکھے گئے اور یہ انداز اب بھی کسی حد تک کارگر ہے۔ ان افسانوں میں سے ایک مثال محمود واجد کے افسانے ''امن کے ہاتھ'' کی ہے جو ایک معصوم بچّی سے ایک سپاہی کی محبت کو بربادی سے نفرت اور زندگی کے عمل کو جاری و ساری رکھنے کا اثبات کرتا ہے۔ جنگ کی ہولناکی کا گہرا تاثر جسمانی معذوری کے حوالے سے فہیم اعظمی نے اپنے افسانے ''شایان'' میں



قائم کیا ہے، جس کا حوالہ اگر دیکھا جائے تو کوئی ایک جنگ نہیں، ساری جنگیں ہیں:

> ''جولیا نے اپنی جینز کے بٹن کھولے اور اسے گھٹنوں تک کھسکا دیا۔ میں نے جو منظر دیکھا اس کو بیان کرنا میرے لیے بڑا تکلیف دہ ہے۔ ناف سے رانوں کے جوڑ تک مختلف قسم کے دھبے تھے اور کھال پر پپڑی جمی ہوئی تھی۔ سارا حصہ بالوں سے مبرّا تھا اور جس جگہ جولیا کا جنسی عضو ہونا چاہیے تھا وہاں ایک چھوٹا سا سوراخ تھا جو شاید آپریشن کے ذریعے رفعِ حاجت کے لیے بنایا گیا تھا۔ میں نے اپنا منھ دوسری طرف کرلیا۔ میری نگاہوں کے سامنے جولیا جیسے مظلوموں کی بہت سی کہانیاں فلم کی ریل کی طرح تیزی سے گزرنے لگیں۔ پرل ہاربر کی کہانی۔ ہیروشیما کی کہانی۔ ویت نام کی کہانی۔ سوویٹو کی کہانی۔ پاکستان اور ہندوستان کے پارٹیشن کی کہانی۔''

یوں ایک کہانی بہت سی کہانیوں کا حصہ بن جاتی ہے۔ ایٹم کا حوالہ غلام عباس کے طویل افسانے ''دھنک'' میں بھی شامل ہے مگر یہاں ہولناکی کے بجائے طنز کی زہرناکی کا رنگ قائم ہوا ہے۔ پاکستان کی ممکنہ تسخیرِ قمر پر کٹر مذہب پرستوں کی جانب سے جس ردِعمل کو افسانے میں بیان کیا گیا ہے، اس کی ساری جدلیات آج بھی جاری زور خطابت سے مل جاتی ہیں:

> ''ایک پمفلٹ میں جس کا عنوان ''برچھی سے ایٹم بم تک'' تھا، مضمون نگار نے موجودہ زمانے کے تقاضوں پر یوں روشنی ڈالی:
>
> ''حضور سرور کائنات کے زمانے میں تیر اندازی، شمشیر زنی اور شہسواری کی مہارت مسلمانوں کے لیے ایک مقدس فریضے کی حیثیت رکھتی تھی۔ کیونکہ اس سے دین حق کی حفاظت مقصود تھی۔ اگر آنحضرت صلعم موجودہ زمانے میں ہوتے اور دیکھتے کہ کس طرح باطل کی قوتیں چاروں طرف سے اسلام کو اپنے نرغے میں لینا چاہتی ہیں تو وہ اُن سے نبرد آزما ہونے کے لیے ٹینک اور ہوائی جہاز تو کیا راکٹ، میزائل بلکہ ایٹم بم تک کے استعمال کو ہر مومن کے ایمان کا جزو قرار دیتے......''
>
> مگر ملاؤں کی تحریک اب اس قدر زور پکڑ چکی تھی کہ محض بیانات سے اس کا

مداوئی ہونا مشکل تھا۔

ہولناکی کا بیان اور طنز کی دھار، افسانے میں یہ دو رجحانات واضح ہیں۔ شاعری میں ایٹم بم اور ہیروشیما کا ذکر برابر ہوتا رہا ہے (بلکہ یہاں تک کہ اسے اُس زمانے کے رواں فقروں، استعاروں میں سے ایک سمجھا جاسکتا ہے) لیکن بہت سی جگہوں پر یہ ذکر برائے بیت ہے اور کسی گہرے تاثر کا حامل نہیں۔ عزیز حامد مدنی کے نظامِ فکر میں ایٹم اور اس کی مزید تقسیم کا ذکر کئی بار آیا ہے۔ خاص طور پر آئن اسٹائن کو خراجِ تحسین کے حوالے سے۔

چچا سام سے ایٹم بم کا تحفہ مانگنے کی منٹو کی بظاہر طفلانہ مگر گہرے طنز کی حامل فرمائش سے لے کر محمد سلیم الرحمٰن کے گھمبیر اور باریک باریک گندھے ہوئے افسانے تک، جس میں روزمرہ زندگی کا معمولی پن ایٹمی جنگ کو بھی اپنے اندر سمولیتا ہے، تحریروں کا پورا ایک سلسلہ ہے جو ایٹمی تباہ کاری کو زندگی کے دوسرے مظاہر کی بُنت میں شامل کرکے نہ صرف ہماری آج کے قومی ابتلاء کو اجاگر کررہا ہے، بلکہ اس کے لیے ایک تخلیقی استعارہ بھی فراہم کررہا ہے۔ چاغی سے پہلے چاغی کے بعد، پیچھے سے آنے والی یہ روشنی ان نظموں اور افسانوں کو نمایاں کرتی ہے جو حالیہ دھماکوں کے حوالے سے لکھے گئے ہیں۔ ان تحریروں کا ادبی انتخاب اس مجموعے کے دوسرے حصے میں شامل ہے۔ اردو کے ساتھ پاکستان کی دوسری زبانوں سے تراجم رویوں کے ادبی اظہار کی اس تصویر کو مکمل کرتے ہیں۔

ادبی ماحول بہت سی انفرادی کوششوں سے مل کر بنتا ہے۔ ہمارے جیسے معاشرے میں ادب خاموش تماشائی نہیں بنا رہ سکتا اور اس کشمکش اور تناؤ کا اظہار کرتا ہے جن سے کوئی بھی قوم گزر رہی ہے۔ جوہری تباہی کے امکان کے حوالے سے، جو خبر ہمارے ملک کے دھماکے سے پہلے شہ سرخی بنی وہ روس میں چرنوبل کے ایٹمی ری ایکٹر کی خرابی تھی۔ اس وقت کے مشرقی جرمنی کی معروف ناول نگار کرسٹا ولف نے اس حادثے کا حوالہ اپنے ناول میں دیا جسے نقادوں نے اس عہد کے اہم ترین نثری ادب میں شمار کیا جاتا ہے۔ کرسٹا ولف کا ناول صرف ''جوہری تباہی'' کے ''بارے میں'' نہیں ہے۔ اور اس کی اہمیت کسی چیز یا واقعے ''کے بارے میں'' ہونے سے زیادہ ہے۔ لیکن جوہری تاب کاری کی ہولناکی کا احساس اس ناول کی معنویت کا لازمی جزو



ہے۔ اسی حادثے کی تفتیش اور خبر رسائی پر مامور روسی صحافی ولادی میر گباریف (GUBARYEV) کو یہ تجربہ اس قدر ہولناک معلوم ہوا کہ اس کے اظہار کے لیے سنجیدہ نثر نامناسب معلوم ہوئی جس میں اخباری صفحات تحریر کیے جاتے ہیں۔ اسے اندازہ ہوا کہ اس بھیانک موضوع پر اپنے جذبات اور خیالات کو جس ذریعے سے ظاہر کرسکتا ہے، وہ ڈرامہ ہے چناں چہ اس نے صحافتی دستاویز کے بجائے ایک ڈرامہ لکھا جو انگریزی میں SARCOPHAGUS کے نام سے ترجمہ ہوا۔ اس ڈرامے کے مترجم مائیکل گلینی کے بقول یہ ڈرامہ جوہری توانائی کے شہری استعمال کے خلاف "Polemic" نہیں ہے۔ یہ ضرور ہے کہ جذباتی شدت اس کی تحریر کا سبب بنی ہے لیکن وہ مخالفت یا موافقت میں Partisan بننے کے بجائے محض اس خطرے پر زور دے رہا ہے جو اس کے اندازے کے مطابق توانائی کے اس ذریعے کا انتظام کرنے والوں نے نظرانداز کیے ہوئے ہیں اور شہریوں کو اس آگاہی سے دور رکھا ہوا ہے۔ گلینی کے مطابق، ''حقائق یہ ہیں، وہ کہہ رہا ہے۔ ان کو نظرانداز کرنے کا مطلب خطرہ مول لینا ہے۔ ان حقائق سے لیس ہوکر پھر یہ کام سیاست دانوں، سائنس دانوں، انتظامیہ کے اہل کاروں اور آخرکار عوام کا ہے کہ اس پر بحث مباحثہ کریں اور ان وسیع تر سوالات کے بارے میں نتیجے تک پہنچیں جو اس ڈرامے نے اٹھائے ہیں۔''

امید ہے کہ اس مجموعے کی اشاعت سے ایسا ہی مکالمہ قائم ہوسکے گا۔ یہ مکالمہ قائم کرنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس کی روشنی میں ہمیں اپنی بقاء و سلامتی کا راستہ ڈھونڈنا ہے، وہ بقا جس پر سوالیہ نشان اب جوہری جل کھمبی (مشروم) کی شکل اختیار کرگیا ہے۔ ایٹمی دھماکوں کے بعد جنوبی ایشیا میں بننے والی صورتِ حال کو بین الاقوامی تعلقات یا فوجی حکمتِ عملی کے جن زاویوں سے بھی پرکھا اور سمجھا جائے، یہ ایک گھمبیر اخلاقی بحران ہے، ایسا بحران جس کی نظیر ہماری طوفان آشنا تاریخ میں اس سے پہلے نہیں ملتی۔ ان سنگین مضمرات کا اثر ادب پر بھی مرتب ہوتا ہے۔ دور کیوں جائیے، ہمارے پڑوسی اور ''جوہر شریک'' ملک ہندوستان کی بے حد خلاق ناول نگار ارون دھتی رائے نے کانٹے کا مضمون لکھا ہے (جس کا اُردو میں ترجمہ ''تخیل کی موت'' کے نام سے ہوچکا ہے) جو خیال اور عمل کو ایک نئی مہمیز دے سکتا ہے۔ اسی طرح دونوں ملکوں

کے مختلف لوگوں کے ردِّعمل اور تاثرات کو امیتاو گھوش نے ایک طویل تجزیے کا موضوع بنایا ہے جسے صحافت اور ادب کی سادہ سی تقسیم میں کسی ایک طرف نہیں رکھا جاسکتا۔ ان تحریروں کے اُردو میں ترجمے بھی ہوئے ہیں لیکن شاید ہم ترجموں کو ایک اقلیت کی پسند تک محدود کر کے اپنے لیے کنج عافیت میں سیٹ ریزرو کرائے رکھنا چاہتے ہیں۔ چند ایک کہانیوں کی بازگشت سُنی بھی گئی تو دور کی ایک مدھم آواز کے طور پر۔ ایٹمی جنگ کی امکانی تباہ کاری موضوع بن کر سامنے آئی تو اس پر جس انداز سے ادبی حلقوں میں بحث ہوئی، اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہمارے ادیب اور ہمارا ادبی ماحول بڑے سے بڑے موضوع کو کلیشے کا پابند یا غیر متعلق ضمنی باتوں میں trivialize کرنے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس کی عبرت ناک مثال انور سجاد ہیں۔ ''استعارے'' جیسی کتاب کے مصنف سے توقع ہوسکتی تھی کہ وہ افسانے میں تازہ کاری اور عصری آگہی کے امتزاج سے تخلیق کا کوئی نیا انداز وضع کریں گے۔ جس طرح فرانسیسی فلم Hiroshima-Mon Amour کو مانا جاتا ہے۔ اس کا متن کتابی صورت میں شائع بھی ہوا ہے اور فرانس کے ۱۹۶۰ء کی دہائی والے ''نئے ناول'' سے براہ راست تعلق بھی ہے۔ مگر وہ بس ایک سپاٹ مضمون لکھ کر رہ گئے جس میں شمس الرحمٰن فاروقی کو ''وہی لہجے سنائی دیے جوستی نعرہ بازی کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔''

عذرِ گناہ بدتر از گناہ، انور سجاد نے جواب میں انتظار حسین سے اپنی پرانی شکایات کو ایک نئی کھونٹی پر ٹانگ دیا۔ اس سلسلے میں انتظار حسین کے دو کالم اس انتخاب میں خاص طور پر شامل کیے گئے ہیں۔ اپنے ایک جوابی حملے میں انتظار حسین نے لکھا:

''خدا غفور الرحیم ہے۔ وہ ہمارے گناہ معاف کرسکتا ہے۔ مگر ادب کی عدالت ظالم اور بے رحم ہے۔ وہاں ہمیں ایک ایک تحریر کا حساب دینا ہے۔ اور جتنا خراب لکھا ہے اس کی سزا بھگتنی ہے۔ ارے، یہ سزا کیا کم ہے کہ ہمیں دوستوں کی خراب تحریروں کو بھی پڑھنا پڑتا ہے۔ اپنی خراب تحریروں کا عذاب کم تھا کہ یاروں کی خراب تحریروں کا بھی عذاب اب سہتے ہیں۔'' یہ خط اس ''بحث'' میں شامل ہیں جو ''نیوکلیائی دھماکے اور ہمارے ادیب'' کے عنوان کے تحت ''شب خون'' کے اگست ۱۹۹۹ء کے شمارے میں شائع ہوئی۔ (جوابی خطوط کا سلسلہ ''آئندہ''



کراچی سے شروع ہوا جہاں یہ مضامین پہلے چھپے تھے) اس پوری بحث کو دیدۂ عبرت نگاہ سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ ارون دھتی رائے کو مژدہ ہو کہ ہمارے بہت سے ادیبوں کے ''تخیل کی موت'' واقع ہوچکی ہے۔ اب انہیں دھماکوں سے زیادہ صورِ اسرافیل کی احتیاج ہے۔

ارون دھتی رائے تو اس عہد کی CASSANDRA ہیں ورنہ ایٹم بم سے ادب کے لیے سناؤنی کا بڑا واشگاف اعلان ولیم فاکنر نے کیا تھا۔ برسوں پہلے فاکنر نے اپنے نوبل خطبے میں کہا تھا کہ ایٹم بم کے بعد انسانیت کے سامنے روحانی مسائل نہیں بلکہ بس ایک جسمانی مسئلہ رہ گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ نسل انسان زندہ رہتی ہے یا نہیں۔ فاکنر کے اس بیان پر محمد حسن عسکری نے کہیں استہزاء کا انداز اختیار کیا اور کہیں اسے انسان کے لیے ایک نئے تخلیقی تصور کو پیدا کرنے کی ضرورت کے ثبوت کے طور پر پیش کیا۔ انہوں نے لکھا: ''روحانی مسائل اتنے عریاں اور ہیبت ناک شکل میں انسان کے سامنے پہلے کبھی نہیں آئے تھے، اور پوری نسل انسانی کے وجود کا دارومدار چند روحانی مسائل کے تصفیے پر اس حد تک کبھی نہیں رہا تھا۔ ایٹم بم نے روحانی مسئلوں کو ختم نہیں کیا ہے، بلکہ پہاڑ بنا دیا ہے۔''

عسکری صاحب نے جب یہ تجزیہ لکھا تو ان کے بدترین وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ ایک دن یہ پہاڑ ہمارے سروں پر معلق ہوجائے گا اور اس پہاڑ کا رنگ بھی سفید پڑتا جائے گا۔ یہ بات گمان سے دور سہی، رائے زنی کی زد میں آسکتی ہے۔ فتوے صادر کرنے کی ہماری عادت تو راسخ ہی ہے۔ اس طلسمی پہاڑ کی طرف ایک ٹھوکر مار کر آج کے ایک بقراط نے ایک کتاب کی سفارش کرتے ہوئے اس کو ''جنگ اور ایٹم بم سے نفرت کے محدود پیغام'' سے زیادہ اہمیت کا حامل بتایا۔ ناطقہ سربگریباں ہے کہ اسے کیا کہیے۔ ایسے روّیوں پر اس وقت اور زیادہ حیرت ہوتی ہے جب ہم ان کو اس بحران کے سامنے رکھ کر دیکھتے ہیں جو کروڑوں انسانوں کو چشم زدن میں محض اس لیے موت کے گھاٹ اتار سکتا ہے کہ چند اربابِ سیاست یہ ہدف حاصل کرنا چاہتے ہیں، اور یہ تباہ کن امکان یا اس کے حصول کے لیے ہتھیاروں کی دوڑ تہذیبی عمل کے تسلسل، بلکہ کارل سیگن (CARL SAGAN) جیسے سائنس دان کے بقول، پوری بنی نوعِ انسان کے وجود کے لیے خطرہ ہے۔ ایسی صورتِ حال میں ادب کی ذمہ داری فزوں تر ہوجاتی ہے اور ادب

اس ذمہ داری سے پہلو تہی نہیں کرسکتا۔ (مشاعروں کے گوشۂ عافیت اور قوم پرستی کے دھمال کی سہولت کے باوجود)۔ اس لحاظ سے اگر جائزہ لیا جائے تو ایک عجیب انداز کی گدلی گدلی، بھد میلی سی صورت حال ہمارے ادب میں نظر آتی ہے۔ انگریزی صحافیوں کے تجزیے سے موازنہ کرتے ہوئے ممتاز ہندی ادیب راجندر یادو نے ''ہندی کے ان پڑھ صحافیوں کی قصباتی، بچکانہ کلکاریوں'' کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ یہ روّیہ ہمارے ہاں بھی اردو اور انگریزی کے اسی تفاوت کے ساتھ موجود ہے۔ بچکانہ کلکاریوں کے لیے مشاعرے اور ادبی حلقوں کے پنگوڑے وافر تعداد میں مہیا ہیں، جو چاہے سوجی بہلائے خود بھی جھولے، پڑھنے والوں کو بھی جھلائے۔ ٹی وی کی منھ دکھائی کے ساتھ حبِ وطن کی سند سونے پر سُہاگا۔ اسلحے کی اس فصل کو وہی لوگ کاٹ رہے ہیں جنھوں نے ''اژدھے کے دانت'' بیج کے طور پر بوئے تھے۔ یعنی وہی ذبح کرے ہے، وہی لے ثواب اُلٹا۔ خدا معلوم یہ کسی طرح کی جذباتی بلیک میل ہے یا خود فریبی کی بے انت صلاحیت کہ ہمارا ایک عجیب وغریب قومی وطیرہ بن گیا ہے کہ جن سنگین بحرانوں یا مسئلوں پر غور و خوض کی ضرورت ہوتی ہے ہم ان پر بلند بانگ قومی نعروں اور دعووں سے اپنی اور باقی ساری دُنیا کی سماعت بند کرلیتے ہیں، یہ سراسر فراموش کر ڈالتے ہیں کہ گریبان میں منھ ڈال کر اپنا جائزہ لینا اور خود انتقادی کی عادت، حب الوطنی کی لازمی ضد نہیں ہیں۔ بہت پہلے، ڈاکٹر سیموئیل جونسن نے کہہ دیا تھا Patriotism is the last refuge of a scoundrel یہ آج ہم پر کس قدر صادق آتا ہے۔ واماندگی شوق کی تراشی ہوئی پناہ گاہ ہی نہیں، اس نغمہ سرائی کا محرک ہمارا مشہور و معروف ''نظریۂ ضرورت'' بھی ہے۔ ہندوستان مبصر وصحافی سدانند مینن نے کشمیر کی حالیہ چپقلش پر بعض ہندوستانی موسیقاروں کی سستی جذبات پرستی پر شدید تنقید کرتے ہوئے اپنے مضمون ''جنگ کے دوران فن'' میں شکایت کی ہے کہ "supply-side aesthetics" کے اس دور میں ہمارے فن کار اپنی subversive edge بھلا بیٹھے ہیں۔ شہریوں کی آنکھوں میں جذباتی نمی اس کی بصیرت کو دھندلا کرنے کا بہترین طریقہ ہے، یہ کہہ کہ وہ شکایت کرتا ہے کہ ہندوستان کے بہت سے فنکار اسی مقصد کے تابع ہو کر جنگی جنون کے شعلوں کو ہوا دے رہے ہیں جبکہ سچا فنکارانہ مزاج جنگ کے مصائب کا مخالف ہونا ہے اور جنگ کے دنوں میں سچا



فن پارہ مزاحمت اور امید کی علامت ہوتا ہے۔ ''ایک دیوانے حاشیے کے علاوہ، جنگ کسی کے لیے بھی تخلیقی محرک نہیں بن سکتی۔ اس لیے کہ جنگ سن کر دیتی ہے، مردہ کر دیتی ہے، مفلوج کر دیتی ہے۔ یہ تخلیقی عمل کی بالکل اُلٹ ہے۔ ایسے مقصد کے تابع تحریریں، جو فن کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہیں، اپنے کھوکھلے پن کو چھپا نہیں سکتیں۔'' وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ جو فن جنگی آئیڈیالوجی کی توثیق کرتا ہے، وہ اپنا دائرہ محدود کر کے اپنے آپ کو KITSCH کا آلۂ کار بنا لیتا ہے۔ مینن کے دلائل اور ان سے اخذ کردہ نتیجے شاید ہمیں بالکل سامنے کی بات معلوم ہوں لیکن ہم ''کِیچ'' (KITSCH) کو اس کے صحیح و مناسب نام سے پکارنے سے کتراتے رہے ہیں۔ میں یہاں یہ واضح کردوں کہ مجھے اعتراض قومی و ملی نغموں پر نہیں ہے بلکہ ان مقاصد پر ہے جس کو پورا کرنے کے لیے یہ راہ ہموار کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ زمین کی محبت کے اس ترانے میں اس کے لوگوں کے دکھ درد کیوں نہیں سما سکتے؟

چلیے، قومی نغموں کا یہ سیلاب برداشت کیا جاسکتا ہے، اگر اسے ایک چٹکی بھر نمک کے ساتھ لیا جائے۔ پھر اس دھماکے نے قومی اقبال کو سر بلند کرنے کے کئی مواقع فراہم کیے ہیں۔ خالد علیگ کی ایک حالیہ نظم کے بقول:

دھماکا کر دیا تم نے، دھماکا کر دیا ہم نے
بہت اچھا کیا تم نے، بہت اچھا کیا ہم نے
کئی صدیوں سے اپنے روز و شب بے نور تھے یکسر
سو ان میں روشنی کا اک جھماکا کرلیا ہم نے
ہماری بات تک سنتا نہ تھا کوئی زمانے میں
دھماکا کرکے اپنا بول بالا کرلیا ہم نے
بہت بونے بہت چھوٹے تھے ہم اقوام عالم میں
سو اپنی قدر و قیمت میں اضافہ یوں کیا ہم نے

قومی سربلندی کی زمزمہ سرائی پر کاربند شاعری بھی ایک سمت متعین کرسکتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ زمین کے اپنے تقاضے اس کے برخلاف ہوں۔ فاطمہ حسن کی ایک غزل، جو اسی

بحران کے دوران لکھی گئی، زمین سے اس کی خیریت پوچھتی ہوئی معلوم ہوتی ہے:

وفا کا اقرار چاہتی ہے

زمیں اظہار چاہتی ہے

مگر زمین کو کسی طرح اظہار کی صورت تو ملے۔ انفرادی و اجتماعی بحران کو ''پیغام'' سمجھ کر اس سے الرجک ہونے والے دانشور ہوں یا پھر موقع بے موقع ایک ہی راگ الاپے چلے جانے والے خود ساختہ ملّی نغمہ گر، ان کے روّیے ایک ہی سکے کے دو رُخ نظر آتے ہیں کہ وہ پوری صورتِ حال کی تخفیف کر کے اسے دو ایک موٹے موٹے کلیشے بنا کر رکھ دیتے ہیں۔ اس سے شمیم احمد مرحوم کے الفاظ میں جبلّتوں کی جنگ میں کلیۃً بازی تو ہو سکتی ہے، دید و دریافت کا وہ مرحلہ پورا نہیں ہو سکتا جو انسانی صورتِ حال کے حوالے سے ادب کا مرکزِ توجہ ہے۔

ایٹمی جنگ کی تباہ کاری کا سامنا ہو تو ادب کیا رُخ اختیار کر سکتا ہے اور جنگ سے نفرت کا پیغام کس قدر اہم اور وسیع تر مفاہیم کا حامل ہو سکتا ہے، اس کا اندازہ لگانا ہو تو معاصر جاپانی ادب کا حوالہ سود مند ہوگا۔ یہ دود، آشیاں کے پاس سے اٹھا ہے۔ ہمارے بقراطوں کی تخفیف پسندی، ان گھڑکی زیٹ معلوم ہونے لگتی ہے اگر ناول نگار کینزابرو اوئے (OE) کا وہ مختصر مضمون دیکھا جائے جو اس نے ہیروشیما اور ناگاساکی کے بارے میں افسانوں کے انتخاب ''چنگاریوں سے آگ'' کے دیباچے کے طور پر لکھا ہے۔ ''ناقابلِ فہم مستقبل کی جانب'' نامی یہ مضمون ہمیں ادب کے اس تناظر کو سمجھنے اور پرکھنے کا طریقہ فراہم کرتا ہے جو کسی پیغام کا مرہونِ منت نہیں۔ وہ ان ادیبوں کا ذکر کرتا ہے جنھوں نے ایٹمی بمباری کا تجربہ جھیلا اور اس کے بعد اس سوال سے نبرد آزما رہے کہ اب کس طرح جیئیں اور کس طرح ادیب کے طور پر اپنا اظہار کر سکیں۔ جس ادیب میں ہمارے دانشور کو ''پیغام'' کی آدم بو آئی تھی، اس کی کہانی کو...... جس میں ایٹم سے برباد ہو جانے والے شہر میں ایک پھول اگ آتا ہے...... اپنے انتخاب میں شامل کرتے ہوئے اوئے نے لکھا ہے:

''ایبو سے یقیناً ان ادیبوں کی حاصل کردہ ادبی مہارت کی بہترین مثال ہے جنھوں نے اپنی پوری زندگی ایٹمی جنگ کے غیر معمولی کرب کا سامنا کرنے کی ہمت کی ہے۔''



ہم عصر جاپانی ادب کے اس موضوعی مطالعے کو اس باکمال افسانہ نگار نے اپنے انتخاب کے حوالے سے ختم کیا ہے اور یہ مقام ہمارے لیے خاص طور پر معنی خیز ہے:

''ان کہانیوں کا انتخاب کرتے ہوئے مجھے ازسرنو یہ احساس ہوا کہ اس میں شامل یہ کہانیاں محض ادبی اظہار نہیں ہیں جو ماضی میں جھانک کر تخلیق کیا گیا ہے کہ ہیروشیما اور ناگاساکی میں ۱۹۴۵ء کے موسم گرما میں کیا ہوا تھا۔ یہ اس ہم عصر دُنیا کے بارے میں سوچنے کے معنی خیز وسیلے ہیں جس کے اوپر تیزی سے بڑھتے ہوئے جوہری اسلحے کے ذخیرے کا خطرہ لٹکا ہوا ہے۔ یعنی کہ یہ ہماری قوتِ متخیلہ میں لرزش پیدا کرنے کے ذرائع ہیں کہ وہ انسانی وجود کی بنیادی شرائط کا جائزہ لے، یہ آج کے لیے اور آنے والے کل کے لیے تمام حرکات کے لیے برمحل ہیں...... خودکشی سے پہلے ہارا تامی کی نے خبردار کیا تھا کہ ہماری تہذیب نیستی یا اس خطرے سے نجات کے دوراہے پر پہنچی ہوئی ہے اس لیے ہمیں ''ناقابلِ فہم'' مستقبل کا سامنا کرنے سے مفر نہیں۔ زندگی کی بنیادی شرط لہٰذا یہ ہے کہ ایک خوف ہم پر چھایا جا رہا ہے اور ہماری گھات میں ہے اور دوسری طرف امید کی تعمیرِ نو کی ضرورت ہمیں بلا رہی ہے، جو مشکل سہی، اس خوف کے سامنے ڈٹی ہوئی ہے۔ یہ وہ بنیادی مسائل ہیں جو اس انتخاب میں شامل افسانوں کی تہہ میں موجود ہیں۔''

ہم نے اپنے اس انتخاب میں جو نظمیں اور کہانیاں جمع کی ہیں، ظاہر ہے کہ اُن کے بارے میں ادبی طور پر اور نہ فکری طور پر اس طرح کی کوئی بات کہی جاسکتی ہے۔ ہمیں ابھی اس خطرے کا سامنا کرنا سیکھنا ہے جو ہمارے حکمرانوں نے مول لیا ہے اور اس خطرے کا ادبی اظہار بھی ممکن بنانا ہے۔ فاکنر نے جب ایٹم سے ہتھیار بند دُنیا میں انسان کے مسائل کا ذکر کیا تھا تو یہ بات ہمارے بہت سے لوگوں کو بعید از کار اور دور از فہم معلوم ہوئی ہوگی۔ لیکن اب اس کی آنچ گھر آنگن تک آ گئی ہے۔ یہ جلتی ہوئی پرچھائیاں ہمارے کچے مکان کی دیواروں پر ناچ رہی ہیں۔ ہم اپنے جشن و رقص کی لے جس قدر بھی تیز کر لیں، سرسراتے ہوئے خوف کی اس چاپ کو دبا نہیں سکتے۔ اب ہمیں اس غم آگہی کا سامنا ہے جو انسان نے اپنے ہی ہاتھوں اپنی بربادی کا بندوبست کر کے حاصل کی ہے۔ ہمارے ساتھ ہمارے ادب کو بھی اسی آشوبِ آگہی سے

نبرد آزما ہوتا ہے۔ اسی لیے بقولِ غالب:

ڈھونڈے ہے اس مغنّیِ آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے

مگر اس سے پہلے 'صبحِ وطن ہے خندۂ دنداں نما مجھے'۔ دھماکے کے جشن میں بعض
مفروضے جو ہم نے اپنے اوپر طاری کر لیے ہیں، ان کی تنگ دامانی کا احساس ہو جائے تو اچھا۔
اس مخصوص بحران کے حوالے سے ادب کو سیاست اور اس سے بھی بڑھ کر IDEOLOGY
OF POWER کی زبان میں بولنے پر اکسایا جاتا رہا ہے، اب اس سے گزر کر نفسیاتی و
اخلاقی نقطۂ نظر اختیار کرنے پر اصرار کرنا ہوگا۔ اس تناظر کا خاکہ میرے ذہن میں The Long
Darkness نامی کتاب پڑھ کر بننا شروع ہوا، جس کا ذیلی عنوان ہے: ''نیوکلیائی موسمِ سرما
کے بارے میں نفسیاتی اور اخلاقی تناظر'' اور جس میں مختلف شعبوں کے ماہرین نے سیاست،
ماحولیات، فلسفہ، حالاتِ حاضرہ، نفسیات، حیاتیات اور دوسرے علوم کے زاویے سے عالم گیر
پیمانے کی تباہی کی اس طویل مدت کا جائزہ لیا ہے جو ایٹمی جنگ کے نتیجے میں برپا ہوگی اور جسے
نیوکلیائی موسمِ سرما کا نام دیا گیا ہے۔ کیسا موسم ہوگا جس کی آمد کی خبر سے ہی پورے جسم میں
جھرجھری دوڑ جاتی ہے، جان ای میک (John E.Mack) نے جوہری ہتھیاروں کی دوڑ میں
طاقت کے استعمال پر سے قومی دفاع کے واہمے (the shibboleth of national
security) اور دشمنی کی نظریاتی اساس (Ideologies of enimity) پر امریکا و روس کی سرد
جنگ کے حوالے سے دلیل قائم کی ہے لیکن بحث کے اس جدلیاتی رُخ کو ہمارے لیے بنیادی
اہمیت جے لفٹن (ROBERT JAY LIFTON) نے nuclearism یا ''جوہر پسندی''
کی اصطلاح سے دی ہے اُس نے یہ اصلاح ان معنوں میں استعمال کی ہے کہ ہتھیاروں کی تکریم
روحانیت کی حدوں کو چھو لے، جوہری ہتھیاروں پر انحصار کی پرستش بن جائے۔ ان
ہتھیاروں کو دفاع و حفاظت کے نام پر حاصل کریں اور انہیں کاروبار زندگی کا ذریعہ سمجھنے لگیں۔
یہ اصطلاح ہمارے لیے کس قدر معنی خیز ہے۔ نیوکلیائی انجام کی مختلف امیجز کا نفسیاتی جائزہ لیتے
ہوئے انواعِ حیات کے اختتام (Biological Extinction) پھر حالیہ تاریخ کے مخصوص



''خارجی'' واقعات جیسے ہیروشیما اور دُنیا کی تباہی کی قدیم امیجری کو سلسلہ وار دیکھتے ہوئے اس
نے نتیجہ اخذ کیا ہے: ''معاصر ہتھیاروں کا خارجی خطرہ دیوانگی (Schizophrenia) کی
سرزمین تک جا پہنچتا ہے۔'' موروں کے ختم ہو جانے کا امکان، انتظار حسین کو حالیہ تاریخ کی تباہ
کاری اور داستان ہائے پاستان تک لے جاتا ہے۔ اور اس سے بھی بڑھ کر، ایٹمی دھماکے کے
بعد وجودِ زن سے عاری دُنیا کے بے رنگ تصویر بن جانے کا نقشہ حسن منظر نے کھینچا ہے جو
ایک فرد کی نفسیات کو ابنارمل حالت میں ڈھلتے ہوئے دکھاتے ہیں۔ دنیا کے خاتمے کا تصور کرنے
کی صلاحیت کو انسانی ذہن کی آخری حدوں کی پیداوار قرار دیتے ہوئے، لفٹن اس صلاحیت کو
بنیادی صلاحیت قرار دیتا ہے اور اسے مارٹن بوبر کے الفاظ میں ''اصل کا تصور'' (Imagining
the Real) کا نام دیتا ہے۔ وہ غلام عباس کا ''دھنک'' ہو یا ن م دانش کی ''ایک نظم کی موت''
ہمیں اسی کا تصور کرنا ہے جو ''تخیلی'' بعد میں ہے، حقیقی اس سے پہلے۔

اب ہم اس مقام پر پہنچ چکے ہیں کہ چشم تصور ہی ہمارے لیے چشم نگراں ہے۔ لیکن یہ
تصور، یہ تخیل کب تک اور بعد ازاں، پس چہ باید کرد؟ لفٹن نیوکلیائی سرما کو تخیل کے لیے مہمیز
سمجھتا ہے:

''نیوکلیائی سرما ان تخیلی کوششوں میں ہمارے لیے بہت کارآمد رہتا ہے اس لیے کہ
نیوکلیائی انجام کے تصور کو ٹھوس بنا کر وہ ہماری وجودی صورتِ حال کو واضح کرتا ہے اور ہمیں اپنے
آپ کو واہمے رمفروضے (Illusion) سے آزاد کرانے میں مددگار ہوتا ہے۔ نیوکلیائی موسمِ سرما
ہمیں واضح اور دوٹوک الفاظ میں بتا دیتا ہے کہ امید کس سمت پر واقع ہے: حفاظت گاہوں، فرار
کے منصوبوں اور کھنڈروں کی تعمیرِ نو میں نہیں بلکہ صرف اور صرف اس سب کی روک تھام میں۔''

''جوہر پسندی'' کی نظریاتی اساس کے خطروں سے آگاہ ہو کر ہمیں ان مترادفات کی جستجو
ہے جو زندگی کی فروغ اور بقا کا سامان فراہم کر سکیں۔ نظریاتی چھتریوں کی چھاؤں میں سے نکل
آنے کا یہ عمل کچھ ایسا آسان بھی نہیں مگر اسی سے شعور اور عملی کوشش کا راستہ نکلتا ہے۔ ''لمبی
اندھیاری'' کا مرتب لیسٹر گرن اسپون (Grinspoon) اپنے دیباچے میں کہتا ہے:

''جوہری خطرے کے شعور کو جو شخص بھی پوری طرح جذب کر لے اس کے لیے مشکل یہ

ہے کہ پھر ہم پر لازم آجاتا ہے کہ اپنے افکار کا رُخ موڑیں اور بعض طریقوں سے اپنی زندگی میں تبدیلی لے کر آئیں...... یہ مطالبہ ایسا ہے کہ بہت سے لوگ اس سے گریز کو ترجیح دیتے ہیں اور ہم اس بات کو سمجھ سکتے ہیں۔'' اس نے ایچ جی ویلز کا یہ حوالہ دیتے ہوئے کہ انسانی تاریخ، تعلیم اور تباہی کے درمیان ایک دوڑ بن گئی ہے، لکھا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری تعلیم اسی تباہی سے ہو۔ اُردو کے جاپانی طالب علم کا رپورتاژ پڑھیے اور اپنے آپ سے سوال کیجیے کہ ہمیں مزید ایسے اور کتنے مضمون درکار ہوں گے۔ شاید اسی کے پیشِ نظر دیباچہ نگار نے شروع میں ہی انتباہ کر دیا تھا:

''ایسے الفاظ دہرانا آسان ہے اور یہ الفاظ اتنی بار ادا کیے گئے ہیں کہ اب ہم انہیں سنتے بھی نہیں، مشکل بات تو یہ ہے کہ جو کچھ ہم جانتے ہیں اسے اپنے آپ کو محسوس کروائیں اور اسی سے اپنے عمل کا تعین کریں۔''

ہماری زندگی کے اسی کڑوے سچ کا حامل ہونا ہے ہمارے ادب کو۔ ہمارا آئندہ ادب، یعنی اگر ہمارے لیے اب بھی کوئی آئندہ ہے، جس کے کچھ مبہم، کچھ واضح آثار آج جھلکنے شروع ہوئے تو ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ ادب چٹھی رساں کبوتر نہیں ہوتا اور اپنے اعتقاد کو اظہار کا رنگ روپ دے کر نمایاں کرتا ہے۔ پہلی جنگِ عظیم کے دوران آسٹریا کے طناز دانش مند کارل کراؤس کا (جس نے انسانیت کی تباہی کو ڈرامائی پیمانے پر لکھنے کا بیڑا اٹھایا تھا) یہ جملہ یاد آتا ہے جو مذکورہ کتاب کے دیباچے میں نقل ہوا ہے اور بہت سارے عالمانہ تجزیوں پر بھاری ہے:

''اگر ہمارے پاس قوتِ تخیل باقی ہوتی تو پھر ہم جنگ نہ لڑتے۔''

ہم لڑ کر مٹ جاتے ہیں یا بچ جاتے ہیں، یہ تو کسی کو معلوم نہیں کہ یہ ڈرامہ دکھائے گا کیا سین، پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ۔ لیکن اگر ہمارے مقدر میں لمبی اندھیاری ہی لکھی ہے تو یہاں ایک ساتھ دیکھ لیجیے کہ چشمِ تخیل میں وہ کون سے رنگ اُبھرتے تھے جنھوں نے سارے رنگوں کو بچانا چاہا تھا۔ ہمیں نہ تو یہ دعویٰ ہے کہ اس مجموعے میں شامل ساری تحریریں اس خطرے کا احاطہ کر سکی ہیں یا اس موضوع پر تخلیق کردہ ادبی و فنی شاہ کار ہیں۔ یہ کتاب بکھری ہوئی آوازوں کو سمیٹ کر مجموعی خاموشی کا طلسم توڑنے اور اس طرح زمین کی خیریت پوچھنے کی ایک کوشش ہے۔



ساحر لدھیانوی نے ''پرچھائیاں'' میں جو لکھا تھا، وہ الفاظ ایک بار پھر یاد آ رہے ہیں:

''کہو کہ آج بھی ہم سب اگر خموش رہے
تو اس دمکتے ہوئے خاکداں کی خیر نہیں
جنوں کی ڈھالی ہوئی ایٹمی بلاؤں سے
زمیں کی خیر نہیں، آسماں کی خیر نہیں.....''

''تصورات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں۔'' ہمیں امید ہے کہ یہ سلسلہ آگے بڑھتا رہے گا اور اس حوالے سے مزید تحریریں پڑھنے کو مل سکیں گی، جو اس تاثر کو مزید گہرا بھی کر سکیں اور اس عہد کے آشوب آگہی کو اظہار کی نئی سمت لے جا سکیں۔

۲۵، اپریل ۲۰۰۰ء

# ہیروشیما سے پہلے، ہیروشیما کے بعد

لوگ کہتے تھے شمشیر خان وقت سے پہلے بوڑھا ہوگیا ہے۔ اس کی طبیعت کا تقاضا یہی تھا کہ اس کا چہرہ روشن اور اس کی داڑھی سیاہ رہے لیکن کچھ دنوں سے بڑھاپا اس پر اچانک برف کی طرح گرنا شروع ہوا اور اس کے سر کے بالوں اور داڑھی مونچھوں کو کھچڑی بنا گیا۔ بڑھاپے کی یہ آسیبی سفیدی اس کے لباس پر بھی اثر انداز ہوئی۔ بنارسی پگڑیوں، ریشمی لنگیوں اور بوسکی کے کھلے اور ڈھیلے ڈھالے چولوں کی جگہ ململ کی پھنٹیوں، ٹخنوں سے بالشت بھر اونچے تہمدوں اور کھدر کی کسی کسائی بنگالی قمیضوں نے لے لی۔ چہری کی لالی نچڑ گئی اور آنکھوں کے کناروں پر مکڑیوں نے ٹانگیں پسار دیں۔ اس انقلاب کے باوجود بچوں سے لے کر بوڑھوں تک اور کنواریوں سے لے کر بیواؤں تک اس کی چھیڑ چھاڑ بدستور جاری رہی بلکہ زیادہ ہی شدت اختیار کر گئی۔ جب وہ گلی کے نکڑ پر تیزی سے گزرتے ہوئے کسی نوجوان پر پھبتی کستا۔

''ارے بھئی وہ تو پنگھٹ پر جا چکی۔'' یا چوپال کی پرلی طرف قبرستان کے ایک ویران گوشے میں کسی گھبرو کو دبکتا دیکھ کر پکار اٹھتا۔ ''آج گاڑی لیٹ معلوم ہوتی ہے۔'' تو لوگ بے اختیار ہنستے، اور خود شمشیر کے قہقہے ان سب سے بلند ہوتے۔ مگر ہر روز کوئی اس کی دکھتی رگ کو چھیڑ دیتا۔

''شمشیر چچا نہ جانے کیا بات ہے کہ پہلے تم ہنستے تھے تو یوں لگتا تھا جیسے کٹورے بج رہے ہوں، اور اب تم ہنستے ہو تو یوں لگتا ہے جیسے چٹانیں لڑھک رہی ہیں پر بت سے۔ اور پھر نہ تمہاری آنکھیں چمکتی ہیں، نہ چہرہ دمکتا ہے۔ تم ہنستے ہو تو تمہارے پپڑائے ہونٹوں سے خون رسنے لگتا ہے۔ تمہارے ماتھے کی لکیریں گہری ہو ہو جاتی ہیں۔ آخر کیا بپتا پڑی ہمارے چچا پر کہ

دنوں میں بجھ کر رہ گیا۔"

پربت کی چوٹی سے لڑھکتی ہوئی چٹانوں کا تانتا بندھ جاتا اور وہ کہتا، "یعنی مطلب یہ ہے کہ ہم بوڑھے سرے سے ہنسنا ہی چھوڑ دیں، اور یہ نعمت بھی تم نوجوانوں کو سونپ دیں۔ کیوں بھئی؟ ہم نے کیا بگاڑا ہے تمہارا؟ ہم نے تمہیں سپرد کر رکھی ہیں محبتیں، اور راتوں کی ملاقاتیں اور تنہائیوں کے گیت اور لال چہرے اور لودیتی پتلیاں۔ اب یہ ہنسی بھی چھین لو ہم سے کہ سچ مچ کے بے حیا بن کر رہ جائیں...... واہ! اور بھئی یہ ایک کان سے عطر کی پھریری نکال کر ہمیں بھی تو سنگھاؤ...... کہتے ہیں جس نے حنا کا عطر نہیں سونگھا اسے ماں نے ابھی جنا ہی نہیں......" اور چٹانوں کا ایک اور ریلا گڑگڑاتا ہوا امڈ پڑتا۔

لیکن لوگوں کا اندازہ غلط نہ تھا۔ اگرچہ وہ اس کی وجہ نہیں جانتے تھے، انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ اپنے بیٹے دلیر خاں کی شادی پر اس نے محض دکھاوے کی خاطر جو دھوم مچائی تھی اور سونے چاندی کے زیوروں کے جو انبار لگا دیے تھے، وہ درحقیقت مہاجن کی بھرپور محبت کا نتیجہ تھے۔ اور شہنائیوں اور گیتوں اور تہنیتوں کے ہنگامی کے بعد جب اس نے حالات کا جائزہ لیا تھا تو ایک رات گھبرا کر پکار اٹھا تھا۔

"دلیر خاں دیا بجھا دو بھئی، تیل خواہ مخواہ جل رہا ہے۔"

ملحقہ کمرے کے دروازے کی روشن جھریاں اچانک مٹ گئیں اور اس نے لحاف لپیٹ کر سونے کی کوشش کرنا چاہی مگر کروٹوں کے بہت سے دائرے بنانے کے بعد وہ اٹھ بیٹھا۔ اسے اندھیرے سے ہول آنے لگا۔ طاق پر سے دیا سلائی کی ڈبیا اٹھا کر اس نے چراغ جلایا تو ملحقہ کمرے سے آواز آئی۔

"کیا بات ہے ابا؟"

اور وہ جھنجھلا کر بولا،

"ارے ابھی تک جاگ رہے ہو تم لوگ؟" اور اس نے دیا بجھا کر پھر لحاف کی پناہ ڈھونڈی۔

بار بار اس کے دماغ کو اس احساس کی ان گنت سوئیاں کریدنے لگتیں کہ وہ اپنی اچھی



خاصی پونجی کو برباد کرنے کے علاوہ تین ہزار کا مقروض ہے، اور اب اس کا بیٹا نوجوان ہے۔ اس کی شادی بھی ہو چکی ہے۔ اب اس کے بچے ہونے لگیں گے۔ اخراجات بڑھتے جائیں گے اور زمینیں اجڑتی جائیں گی۔ پہلے سندھ کے پانیوں سے اس کی زمینوں پر ہر سال زندگی کی تازہ تہیں پھیل جاتی تھیں۔ ان لوگوں پر اسے بہت ترس آتا تھا۔ جن کی زمینیں دریا سے دور تھیں جو ہمیشہ کے محتاج رہتے تھے، بارشوں کے لیے مسجدوں میں دعائیں مانگتے تھے، غریبوں میں گڑ اور گھنگھنیاں بانٹتے تھے، نفل پڑھتے تھے اور پھر مایوس ہو کر گالیاں دینے لگتے تھے، لیکن اب سندھ سے ایک بہت بڑی نہر نکالی جا رہی تھی اور دریا سمٹ اور رہٹ کر بہت دور بھورے پہاڑوں کے قدموں میں رینگ رہا تھا، چٹخی ہوئی شور زمینوں پر جب وہ مٹر کا اکا دکا پودا دیکھتا، اور ڈھور ڈنگران دور دور تک بکھرے ہوئے پودوں کی تلاش میں مارے مارے پھرتے تو وہ بہت دکھی ہو جاتا۔ زمینیں روز بروز بگڑتی اور اجڑتی جا رہی تھیں اور سندھ کا پانی ان وسیع تھلوں کے صدیوں کے سوکھے سڑے معدوں میں غرق ہو رہا تھا، جن پر نوابوں اور جاگیرداروں کا قبضہ تھا اور جو ان تھلوں سے بیگانہ رہ کر بھی پہلے سے نہایت شاداب ریاستوں کے مالک تھے۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔" اس نے ایک روز ذیلدار سے کہا تھا...... "کچھ پلے نہیں پڑتا کہ ایک ہزار غریب کسانوں کی زمین کو اجاڑ کر صرف ایک زمیندار کی آسودگی کا سامان کیوں ہو رہا ہے؟ بھئی یہ بات عجیب الٹی سی ہے۔ خدا کی ان نعمتوں میں تو ہر انسان برابر کا حصہ دار ہے۔ دریا کے پانیوں پر بھی کبھی کسی کا قبضہ ہوا ہے بھئی ذیلدار۔"

ذیلدار ورثے میں پائی ہوئی نیاز مندی کا مظاہرہ کرتا۔

"شمشیر خاں، سرکار جو چاہے کرے۔ چاہے تو تھلوں میں دریا بہا دے چاہے تو ہرے بھرے کھیتوں میں آگ لگا دے۔ ایسی باتیں یوں کھل کر نہ کیا کرو۔ سرکار کو پتہ چلا تو دھر لیے جاؤ گے اور بھئی خدا اور سرکار پر کون انگلی اٹھائے۔"

"مگر دریا کے پانی پر کسی کا اجارہ تھوڑا ہے۔" وہ حیران ہو کر کہتا۔

"سرکار چاہے تو ہوا پر بھی لگان لگا دے۔" ذیلدار حسب عادت سرکار کی وکالت کرتا۔

اور پھر شمشیر خاں کے دماغ میں خوش مزاجی کی رو چلنے لگتی۔

''ہوا پر بھی لگان؟ سچ مچ بھئی اگر سرکار ہوا پر بھی لگان لگادے تو عجیب تڑک پھڑک شروع ہوجائے۔ ہر پل واویلا مچا رہے۔ ارے بھئی کیا ہوا؟ کیسا شور ہے؟ کچھ نہیں بھئی ادھر اس گھر میں ہوا ختم ہوگئی ہے۔ سارے گھر والے تڑپ رہے ہیں۔ پانسو کے نوٹ دے کر میراثی کو شہر بھجوایا ہے کہ سرکار سے ہوا کے کنستر خرید لائے...... ہائے ہائے ہائے! اور پھر ذیلدار...... ایک بات کہوں...... یہ سامنے دادا شہباز ہے نا، ہوا پر لگان لگے تو سب سے پہلے یہی دم توڑے گا بچارا۔''

''کیوں؟'' کوئی سوال کرتا۔

''ایک تو غریب ہے۔ صبح کی بگھاری ہوئی دال دوسرے دن شام تک چلتی ہے اور پھر دمہ کا مریض ہے، ادھر ہوا بند ہوئی ادھر دادا شہباز اناللہ ہوئے ...... کیوں دادا؟''

دادا شہباز پنشنر جو بڑھاپے کے آخری نقطے کو چھونے کے باوجود سچی بات اور مذاق سے باز نہ آتا تھا، پوپلے منہ کو کھجا کر کہتا۔

''ہم تو بھئی مٹکا بھر لیں گے ہوا سے، اور چھپادیں گے اسے کوڑے کے ڈھیر میں۔ جب بھی ہوا نہ ملی تو کوڑا ہٹایا، مٹکے پر سے ڈھکنا کھسکایا پھیپھڑے بھر لیے، اور پھر مٹکا بند...... تجھے ایک بوند بھی دیں تو نام بدل ڈالنا۔ کنکوار کھ دینا ہاں۔''

قہقہے پڑتے، تمباکو کے دھوئیں اڑتے کھانسیوں کے پٹاخے چھوٹتے، شمشیر ہر کسی پر پھبتی کستا۔

''ابے آرام سے کھانس...... ایسی کھانسی بھی کیا جیسے اونٹ کا گھٹنا ٹوٹے۔''

''ابے حقہ ادھر گھما، جورو کی طرح لپٹ جاتا ہے اس سے......'' ''ابے سنبھل کر بیٹھ تو نے تو دکان کھول رکھی ہے......!''

مگر جب وہ گھر آتا تو تھلتھلاتے ہوئے پیٹ والا مہاجن دوہری ٹھوڑی میں تہرے بل ڈال کر اس کے کمرے میں کسی جھری کے رستے آنکلتا اور اندھیرے میں سوکھے پنجے اس کی طرف لپکتے اور ملحقہ کمرے کی روشن جھریاں بل کھا کر سانپوں کی طرح رینگنے لگتیں۔

''دیا بجھا دو، دلیر۔'' وہ پکار اٹھتا۔ ''تیل ضائع ہورہا ہے......'' اپنی ہی آواز سن کر وہ



چونک اٹھتا۔ آدھی رات کو اٹھ کر صندوق کھولتا کہ شائد کسی کونے میں کپڑے کی کسی سلوٹ میں کوئی نوٹ اٹک کر رہ گیا ہو، اور پھر لحاف کی پناہ گاہ میں گھس جاتا...... صبح کو اٹھتا تو اس کی کنپٹیوں پر بالوں کا ایک اور گچھا بھوسلا رنگ اختیار کر چکا ہوتا۔

''یعنی ہم بوڑھے ہورہے ہیں۔'' اس نے ایک روز سوچا اور بنارسی پگڑی اتار کر پلنگ پر پٹخ دی۔ اس کے بعد ہر روز سفیدی بوقلمونی کی جگہ لیتی گئی اور لوگ حیران ہونے لگے کہ شمشیر پر بڑھاپا اچانک پہاڑ کی طرح کیوں ٹوٹ پڑا۔

ایک روز پٹواری نے چوپال پر آکر خبر دی کہ انگریز نے جرمن کے خلاف لڑائی کا اعلان کردیا ہے، کمزور قوموں کی حفاظت کے لیے۔ شمشیر کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ خلاف معمول اتنے بڑے واقعہ پر خیال آرائی نہ کی بلکہ چپ چاپ بیٹھا رہا۔ چہرے پر کئی رنگ آئے گئے اور پھر آگئے...... آخر اٹھا، لپک کر گھر آیا، اور دلیر کو الگ لے جا کر کہا۔

''لام چھڑ گئی ہے۔ تو نے تو اس روز کہا تھا کہ انگریزوں کا چھتری والا وزیر خواہ مخواہ جرمن کو راضی کرنے کی دوڑ دھوپ کررہا ہے۔ تو نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ شکر ہے تو نے مڈل تو پاس کرلیا ورنہ ہم ان پڑھ لوگ تو ساری عمر اندھیر نگری میں بسر کردیتے۔ تو بات یہ ہے دلیر بیٹا۔''

اس نے ہزار چاہا کہ اعصاب کو قابو میں رکھے۔ اس کا رنگ نہ بدلے، اس کے ہونٹ نہ کانپیں، اس کی بھویں نہ لرزیں، مگر اس وقت اس کی ذاتی غرض نے شفقت پدری کے خلاف لڑائی کا اعلان کردیا تھا۔ ایک دم رک کر وہ سیدھا ہو بیٹھا اور پھر یوں بولا جیسے اس نے ساری عبارت برسوں سے رٹ رکھی تھی!

''بات یہ ہے دلیر بیٹا کہ پچھلی لام میں جو پڑھا لکھا نوجوان فوج میں بھرتی ہوا، وہ واپس آکر تحصیلدار اور صاحب ضلع اور کپتان پولیس بنا۔ ایسے بھی کئی منصف میں نے دیکھے ہیں جو بات کرتے تھے تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے فوج کو حملہ کا حکم دے رہے ہوں...... تو اب میرے خیال میں اللہ کا نام لے اور بھرتی ہوجا۔ موت سے ڈرنا جوں مردوں کا کام نہیں۔ یہ گھڑی تو مقرر ہے۔ ٹالے ٹل نہیں سکتی۔ جنگ کے طوفان سے لاکھوں بچ کر نکل آتے ہیں اور یہاں کروڑوں کچا خربوزہ کھا کر یا چربی کا حلوہ ٹھونس کر یا ویسے ہی بیٹھے بٹھائے ہنستے کھیلتے دم توڑ

دیتے ہیں۔ چل چلاؤ تو لگا ہی رہتا ہے۔ تو پھر میرے بیٹے، میں چاہتا ہوں کہ جب تو لام سے واپس آئے تو بہت برا افسران بن کر آئے۔ لوگ تیرا نام لیں تو میں فخر سے اکڑ جاؤں۔ یقین جانو، اس طرح میرے سفید ہوتے ہوئے بال پھر سے کالے ہونے لگیں۔ دل کا اطمینان سب سے بڑا خضاب ہے۔"

دلیر خاں فوجی سپاہیوں کے کھڑ کھڑاتے ہوئے تہمد، دوگھوڑا بوسکی کی قمیض، بنارسی پگڑیاں اور پھر عطر کی پھریریاں اور انگلیوں میں ناچتا ہوا سبک سابید، کلائی پر گھڑی، اور ان سب پر مستزاد فوں فاں اور ٹخ پخ، غرض ہر بات سے متاثر تھا اور یہ تاثرات اس وقت بہت گہرے ہوجاتے تھے جب گاؤں کی ہر اٹھتی جوانی عطر کی خوشبو اور انگریزی قسم کی نسواری مٹھائیوں کے چکر میں آ کر محض فوجیوں ہی کا اجارہ بن چلی تھی۔ ساتھ ہی اسے باپ کے قبل از وقت بڑھاپے کا بھی علم تھا اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ رات کو گھر میں دیر تک چراغ جلانے کی ممانعت کیوں ہے!

مگر ابھی شاداں کے ناخنوں پر حنا کی ہلکی ہلکی لالی مٹنے نہیں پائی تھی، اگر چہ اس نے شادی کے دس روز بعد ہی سارے گھر کا کام سنبھال لیا، اور نئی نویلی سہاگنوں کے پرانے رواجوں کے برعکس گھر کی جھاڑ پونچھ کے علاوہ تالاب سے سب گھر والوں کے کپڑے تک دھولاتی تھی، لیکن آخر وہ ابھی دلہن تھی۔ اس کی چوڑیوں کے چھناکے میں ترنم تھا۔ وہ قدم اٹھاتی تھی تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے دوسرا قدم زمین پر نہیں آئے گا ہوا میں پڑے گا، اور وہ ابھر جائے گی اور ابھرتی چلی جائے گی۔ اس کی لانبی انکھوں کو سرمے کی لکیر ابھی تک نیم خوابی کا خمار بخشے جا رہی تھی۔

شرماتے وقت ابھی تک اس کا دایاں ابرو اوپر اٹھ کر کمان سا خم کھا جاتا تھا۔ اور گوری ٹھوڑی کی گولائی حباب کی طرح کپکپا اٹھتی تھی۔ دلیر خاں کے نزدیک اتنے بڑے سرمائے کو کھلا چھوڑ دینا بزدلی تھی۔ لیکن جب اعلان جنگ کے ساتھ ہی گاؤں نوجوانوں سے خالی ہونا شروع ہوا، اور چند لوگوں نے اس کی ہچکچاہٹ پر پھبتیاں بھی کسیں، تو وہ ایک صبح کو اپنے باپ سے آنسوؤں سے بھیگی ہوئی دعائیں لیتا اور شاداں کے سلگتے ہوئے لبوں کے گہرے گوشوں کا آب حیات پیتا گاؤں سے رخصت ہوگیا۔



دلیر خاں کے جاتے ہی گھر خالی خالی نظر آنے لگا۔ شاداں بھی اداس رہنے لگی۔ ہر وقت پڑی کھاٹ توڑ رہی ہے۔ برتنوں میں چڑیاں ناچ رہی ہیں۔ آنگن میں کوؤں نے اودھم مچا رکھا ہے۔ سلیقے اور سگھڑاپے کا سارا سحر ٹوٹ گیا۔ زیور اترنے لگے۔ ریشمی لہنگے کا کنارا زمین پر گھسٹتے گھسٹتے بے رنگ ہوگیا۔ آنکھوں میں بھولے سے سرمہ پڑتا بھی، تو دن ڈھلے تک بہہ جاتا۔ شمشیر اسے دلاسا دینے کی کوشش کرتا، مگر جانتا تھا کہ جوانی میں محبت، عبادت کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور پھر شاداں تو ویسے ہی مجبور ہے۔ اسے بہت زیادہ کام نہیں کرنا چاہئے لیکن یہ اداسی یہ آنسو یہ جمائیاں!

"شاداں بیٹی، یہ بُرا شگون ہے، جوانمردوں کا کوئی وطن نہیں ہوتا۔ وہ عمر بھر نکھٹو بن کر گھر پڑے نہیں رہ سکتے...... خدا کے لیے ہنس کھیل، مسکرا...... سنتی ہے شاداں بیٹی؟"

شاداں شمشیر کی طرف دیکھتی جیسے کہہ رہی ہو" ٹھیک ہے۔ ہنسنا کھیلنا بڑی اچھی باتیں ہیں مگر کس سے ہنسوں، کس کے ساتھ کھیلوں؟ بوڑھے چچا تم کیا جانو...... تم کیا جانو؟"

شمشیر سب کچھ جانتا تھا۔ وہ ہر ہفتے دلیر کے خط کا جھوٹ تراشتا۔" آج پھر خط آیا ہے۔" وہ کہتا۔" لکھتا ہے، شاداں سے کہیے کہ میرے لیے دعا کیا کرے، اداس نہ رہے۔ گرج کڑک اور دھواں دھار طوفان کے بعد مطلع صاف بھی ہوجاتا ہے، سورج بھی چمکتا ہے۔ ہری بھری گھاس بھی اگتی ہے......" شاداں کو کبھی کبھی شک گزرتا کہ چچا جھوٹ بول رہا ہے۔ آخر اس نے چھ مہینے تو دلیر کے ساتھ گزارے تھے اور وہ جانتی تھی کہ دلیر مڈل پاس سہی پر اسے ایسی باتیں قطعی نہیں آتیں۔ اسے تو ماہیے، ڈھولے، ٹپے، اور دوہے کے سوا اور کچھ نہیں معلوم۔ یہ تو بڑی دانائی کی باتیں ہیں۔

ادھر شمشیر کے ذہن میں شمشیر اور دلیر کے وزن پر کئی نام گھومنے لگے تھے۔ مگر ان سب میں شیر خاں اسے ایسا بھایا کہ وقت سے پہلے ہی گاؤں بھر میں اعلان کر دیا۔

"اور اگر لڑکی ہوئی؟" کسی نے پوچھا۔

"تو شیرنی۔" شمشیر نے جواب دیا۔

"میں کہتا ہوں کہ اگر نہ لڑکا ہوا نہ لڑکی؟" دادا شہباز پنشنر کے پوپلے منہ پر گول مول

مسکراہٹ ناچنے لگی۔

''عورتیں لڑکا لڑکی کے سوا اور بھی کچھ جنتی ہیں کیا؟''

''ہاں، ہاں''

''کیا؟''

''یہی لنگور، گیدڑ، بندر۔''

لوگ سنجیدہ ہوگئے کیونکہ موضوع عام نہیں تھا بلکہ خاص شاداں سے متعلق تھا اور شہباز حسب عادت زیادتی پر اتر آیا تھا۔ مگر شمشیر نے کہا۔

''بھئی چچا، مذاق کا کوئی رنگ روپ بھی تو ہونا چاہئے۔ یہ کیا ڈھیلا کھینچ مارا اور کہا کہ ہم مذاق کر رہے تھے۔''

''منشی جی سے پوچھ لو۔'' دادا شہباز ہار کب مانتا تھا۔ ''امرت سر میں ایک عوت نے بندر جنا ہے۔ زندہ ہے۔ ہسپتال میں ہے۔ ماں کا دودھ پیتا ہے البتہ دم ذرا چھوٹی ہے۔''

دادا شہباز کا مذاق برداشت کی حد سے باہر ہوچلا تھا، مگر شمشیر کو وہ دن نہیں بھولے تھے جب اس نے دادا شہباز کی ایک موٹی تازی شرمیلی بہو کی پیٹ کو تھپتھپا کر کہا تھا۔

''خضر کی عمر اور سکندر کا بخت پاؤ...... اب آ بھی جاؤنا۔''

اور جب بچہ پیدا ہوا تو وہ سچ مچ شیر ہی نکلا۔ بڑے بڑے ہاتھ پاؤں، موٹا سر، گول چہرہ گورا رنگ...... ''ہے دادا شہباز''۔ مارے خوشی کے اس کے گلے سے اکٹھی آٹھ دس آوازیں نکلی گئیں۔ ''سنتے ہو، شیر پیدا ہوا ہے، شیر۔''

''چچ چچ چچ۔'' دادا شہباز نے ہمدردی کی۔ ''ہائے ہائے ہائے انسان کے گھر میں حیوان تیرے کھیل نیارے ہیں رہے مولا۔ لڑکی ہی ہوتی۔ پر یہ شیر، یہ دم والا شیر، شمشیر میں تمہارے کس کام آسکتا ہوں؟''

بوڑھے کو بازو سے پکڑ کر گھر لے آیا، ننھا دکھایا اور پھر اس کے منہ میں مصری کی ڈلی ٹھونس کر بولا۔ ''سیدھی طرح مبارک دے ورنہ دوسری ڈلی سے باچھیں چیر ڈالوں گا۔''

شہباز چوکنے والا کب تھا۔ مصری کو ایک طرف کے جبڑے میں سنبھال کر بولا......



''ہم سولہ سترہ روپے کے بدلے فرانس کے میدانوں میں جانیں دینے جانکلے تھے۔ مصری کی ڈلی کے بدلے باچھیں چِر گئیں، تو وارے نیارے ہیں ہمارے۔ جانہیں دیتے مبارک ......'' اور پھر سنجیدہ ہوکر اس نے شمشیر پر مبارک بادوں کی بوچھاڑ کردی۔

دلیر ابھی جھانسی ہی میں تھا کہ اسے اپنے باپ بن جانے کی اطلاع ملی۔ فوراً ریشمی کپڑوں کی ایک گٹھڑی پارسل بھجوادی۔ ادھر شاداں کو ہنسنے کھیلنے کا بہانہ ہاتھ آگیا۔ ادھر شمشیر کے چہرے کی جھریاں مسرت کی لہروں میں بدلنے لگیں اور اس کی حس مزاح تیز ہونے لگی۔ اب اسے ہر مہینے بیٹے کی طرف سے بیس روپے مل جاتے تھے اور وہ ہر روز مہاجن کی دکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے کہتا تھا:

''بس ایک سال چاچا...... ایک ایک کوڑی چکادوں گا...... دیکھیو وہ جو تم پچاس پچاس کے پانسو اور ہزار ہزار کے دس ہزار بنا لیتے ہونا؟ وہ جادو کا کھیل مجھے نہ دکھانا۔ میں مداریوں سے نفرت کرتا ہوں۔''

مہاجن ہنستا، یہ ہنسی پہلے تو اس کی چندھی آنکھوں میں چمکتی، پھر گالوں کے انبار میں ہونٹوں کا شگاف ہوتا، اور پیٹ نیم بسمل مرغے کی طرح تڑپنے لگتا۔ پیٹ کے کافی دیر تک تڑپنے کے بعد اس کے حلق میں گڑگڑاہٹ پیدا ہوئی۔ سانسوں میں کشتیاں ہوتیں اور قہقہہ، کھانسی، چھینک اور چیخ کا ایک مرکب بن کر اس کے نتھنوں اور ہونٹوں سے ایک دھماکے کی طرح ابل پڑتا۔ اور پھر ایک زہرہ گداز ڈکار کے بعد مہاجن کہتا۔

''بڑے پاپی ہو تم۔''

شمشیر خان اکثر کہا کرتا تھا کہ مہاجن کا قہقہہ سب سے پہلے اس کے معدے میں بیدار ہوتا ہے۔ چربی کی ایک تہ سے سر نکال کر ادھر ادھر دیکھتا ہے۔ ابھرتا ہے، مگر جب ٹھوڑی تک پہنچتا ہے تو بھٹک جاتا ہے۔ ایک حصہ نتھنوں اور دوسرا منہ کے راستے باہر نکلتا ہے۔ تیسرا حصہ ٹھوڑی کی گدگدی آرام گاہ میں لیٹ جاتا ہے اور جب مہاجن ہنس چکتا ہے تو یہ بقیہ حصہ ڈکار بن جاتا ہے......!

بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ مہاجن کے قہقہے کی طرح اس کی زندگی کا ہر پہلو اور اس کی

ہر حرکت ایک طویل عمل کی عادی بن چکی تھی۔ لال لابنی پوتھیوں کے تاکروں میں سیاہ روشنی کی
ننھی ننھی بندیاں کئی گھروندوں کی تباہی کی ضامن تھیں۔ اور ہر رات کڑوے تیل کی روشنی میں
ان بندیوں میں اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ اور پھر وہ نہایت سبک سے چاقو کی کھرچنی اور وہ گھسا ہوا
موم اور ''ہرے رام ہرے رام۔''

ایک روز شمشیر خاں کو دلیر کا خط ملا کہ اگرچہ وہ ننھے شیر خاں کو دیکھنے کے لیے حد سے
زیادہ بے تاب ہے مگر سرکاری حکم کے مطابق وہ کسی نامعلوم مقام کو جانے کے لیے آج کل
کراچی میں ہے۔ وہاں سے باقاعدہ خطوط لکھتا رہے گا۔ چند روز کے بعد شمشیر کو معلوم ہوا کہ
دلیر سمندر پار کر چکا ہے اور اپنی تین چوتھائی تنخواہ اس کے نام لکھوا گیا ہے۔ شمشیر کا مقصد پورا
ہو رہا تھا لیکن وہ پٹواری سے ہٹلر کی فاتحانہ یلغاروں کے قصے ہر روز سنتا تھا اور لوگوں پر اسے
بہت رحم آتا تھا جو اس گرجتی گونجتی اور بجلی کی سی تیزی سے بڑھتی ہوئی فوج کے مقابلہ پر ڈٹے
ہوئے ہیں۔

''کچھ سنا شمشیر خاں۔'' ایک روز پٹواری نے اسے ایک خبر سنائی۔ ''دس دن ہوئے میں
نے تجھے بتایا تھا کہ جرمن دنیا کے سب سے خوبصورت شہر پیرس میں داخل ہو گئے۔ اب آج کی
خبر ہے کہ فرانس نے جرمنی کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔''

''دس دن میں سارے فرانس پر قبضہ۔'' شمشیر بولا۔ ''حلوے کی طرح نگل گیا کم بخت۔''

''فرانس ہے بھی حلوہ.....'' دادا شہباز چہکا..... ''میٹھا میٹھا، تر و تازہ، رنگ برنگا۔''

اچانک شمشیر سیدھا بیٹھ گیا۔

''یہ فرانس کہیں دور ہے نا منشی جی۔ کراچی سے کوئی جہاز اگر ۱۱ر جون کو چلے تو ۲۲ر جون
تک فرانس پہنچ سکتا ہے کیا؟''

اسے تسلی دی گئی کہ دلیر ابھی فرانس نہیں پہنچ سکا ہوگا۔ مگر اب ہر روز پٹواری اسے ایک
وحشت ناک خبر سناتا، اور اس کے چہرے پر جھرّیاں پھر سے ابھرنے لگتیں۔

''انگلستان پر ہر روز تڑا تڑ حملے ہو رہے ہیں۔ مکان جل رہے ہیں۔ عمارتیں گر رہی ہیں۔
ملبے کے نیچے عورتوں اور بوڑھوں بچوں کی لاشیں اور خون کے چھینٹے، انگریزوں کے خون کے



چھینٹے، ہمارے حاکم کے خون کے چھینٹے.....!''

''بھئی سمجھ میں نہیں آتی یہ بات۔ ایک سادہ دہقان نے حقے کے لیے تمباکو مسلتے ہوئے
کہا۔ ''انگریز بھی مرتے ہیں کیا؟''

شمشیر کو جی بہلاوے کے لیے ایک موضوع ہاتھ آ گیا۔

''نہیں..... نہیں میرے عزیز، انگریز کہاں مرتا ہے۔ انگریز تو قطب صاحب کی لاٹھ
ہے۔ ساگوان کا شہتیر ہے۔ فولاد کا ڈھانچہ ہے۔ میرے بھائی انگریز بھی تو ہم جیسا انسان ہے۔
فرق صرف اتنا ہے نا کہ وہ گورا ہے اور ہم ذرا سانولے ہیں۔ اس کے پاس جہاز ہیں ہمارے
پاس اونٹ۔ اس کے پاس بندوقیں ہیں ہمارے پاس لاٹھیاں۔ اس کے پاس کپڑے کی مشینیں
ہیں اور ہمارے پاس بوستان جولاہے کی کھڈی جس میں اس کا ننھا سا بچہ گر کر اللہ میاں کے ہاں
سدھار گیا تھا بے چارہ۔ اور پھر انگریز کے پاس چرچل ہے اور ہمارے پاس دادا شہباز، جو
آوے کا ڈھلائی موڑ کاٹتا ہے تو ایک قدم پر پندرہ بار کھانستا ہے اور جس کی بیگھہ بھر زمین میں
سے سرکاری سڑک گزرنے والی ہے۔''

اور پھر پٹواری نے ہر روز ایک تازہ پھڑکتی ہوئی خبر سنانا شروع کی۔ ''آج گاندھی جی نے
ہر انگریز سے اپیل کی ہے کہ وہ جرمنوں پر اپنا دروازہ کھلا چھوڑ دے۔ اور ان سے کسی قسم کا لین
دین نہ کرے۔ جرمن خود ہی تنگ آ کر واپس جرمنی چلے جائیں گے۔''

''واہ رے میرے ملنگ سائیں، تیری دور بلائیں۔'' شمشیر حاشیہ آرائی کرتا۔ ''دشمن کے
ایک چٹکی تک نہ لو تو پھر دشمنی کا ہے کی، دروازہ کیوں کھلا چھوڑ دو، لٹھ کیوں نہ جماؤ تالو پر کہ بھر
کس نکل جائے۔ ہائے کتنا جی چاہتا ہے کہ گاندھی جی چرخے تکلے پر سوت کاتنے کی جگہ اس
سے کسی دشمن کی آنکھ نکال لیتے.....''

''دنیا کہاں سے نکل گئی.....'' دادا شہباز نے کہا۔ ''اور ادھر سے حکم ملتا ہے، کھڈیاں
بناؤ۔''

بات معقول تھی، مگر وہ شمشیر ہی کیا جو دادا شہباز کی بات نہ ٹوکے، ''تم نے یہ بال کڑکتی
دھوپ میں سفید کیے ہیں دادا..... ہو سکتا ہے کھڈیوں کے بہانے مورچے بنوائے جا رہے

ہوں۔"

"اور یہ دروازے کھلے چھوڑ دو؟"

"یعنی اندر آتے ہی دبوچ لو۔"

"اور یہ چرخہ چلاؤ؟"

"یعنی چرخہ چلاتے ہوئے کسی سے چل جائے تو تکلی چبھو دو، ہتھی دے مارو کلّے پر۔"

"لٹھ کیوں نہ دے مارو کھوپڑی پر؟"

"اس طرح دشمن خفا ہو جاتا ہے نا بھولے دادا؟ ہاں تو منشی جی کوئی اور خبر؟"

"انگلستان نے فرانس کے بیڑے پر قبضہ کر لیا زبردستی۔"

"یعنی گاندھی جی کی نصیحت نہیں مانی!"

چوپال پر گپّوں اور قہقہوں کے ہجوم میں وہ بہت حد تک پرانے شمشیر کے روپ میں اجاگر ہو جاتا، مگر گھر لوٹتے ہی اس کا ضمیر اس کے چٹکیاں لیتا، دلیر کو جنگ پر بھیجنے کا مقصد اس کے سامنے آتا تو وہ اپنے آپ کو نہایت کمینہ، ذلیل اور خود غرض محسوس کرتا۔ پریشان ہو کر اندھیرے میں آوارہ پھرتا رہتا اور جب کہیں چین میسّر نہ آتا تو صندوق کھول کر دلیر کا بھیجا ہوا روپیہ گننے لگتا۔

انہیں دنوں دلیر کا خط آیا کہ "وہ اب مصر میں ہے اور خوب مزے میں ہے۔ اور مصری اذان بڑی سریلی ہوتی ہے اور مصری لوگ بڑے اچھے ہوتے ہیں۔ اور ہم روز تماشے دیکھتے ہیں۔ سیریں کرتے ہیں اور ......" اور یعنی جنگ کا ذکر تک نہ تھا۔ شاداں نے یہ سنا تو شیر کو اچھالتی ہوئی صحن میں بھاگ گئی اور شمشیر خط کو دوبارہ اور سہ بارہ پڑھوانے کے لیے پٹوار خانے کی چکر کاٹنے لگا۔

"اٹلی نے سمالی لینڈ پر حملہ کر دیا۔" ایک دن پٹواری نے خبر سنائی۔ "سمالی لینڈ مصر کے قریب ہی واقعہ ہے۔"

"ارے!"

"ایک ہزار جرمن ہوائی جہازوں نے انگلستان پر حملہ کیا۔"



"خدا کی پناہ یعنی ٹڈی دل ہوائی جہازوں کا!"

"اٹلی نے مصر پر حملہ کر دیا۔"

گاؤں والوں کی زندگی میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ انہوں نے شمشیر کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ وہ چپ چاپ چوپال پر سے اٹھ کر گھر کو چل دیا۔ اپنے کمرے میں آ کر اس نے صندوق کھولا اور دلیر کی کمائی کو فرش پر بکھیر کر بچوں کی طرح رونے لگا۔ وہاں سے اٹھ کر دھم سے پلنگ میں گر پڑا۔ شاداں بھاگی آئی تو شمشیر بولا۔

"نہ جانے اب تک کیا کچھ ہو چکا ہوگا۔ دعا کر بیٹی، دعاؤں کا تانتا باندھ دے۔ اتنی دعائیں مانگ کہ اللہ میاں کے دربار میں شور مچ جائے۔ رو رو کر، بلک بلک کر، سسک سسک کر دعائیں مانگ، دلیر کی زندگی کے لیے دعائیں مانگ، اور مجھ پر لعنتیں بھیج کہ میں نے قرض اتارنے کے لالچ میں اپنے اکلوتے لعل کو آگ کی بھٹی میں جھونک دیا۔ یہ نہ سوچا کہ میں اجڑ جاؤں گا۔ یہ نہ سوچا کہ شاداں میری اچھی بیٹی کا سہاگ ابھی نیا نویلا ہے۔ یہ نہ سوچا کہ......"

اس کا گلہ رندھ گیا اور سر کو تکیے پر رکھ کر رونے لگا۔

شاداں مچل گئی۔ شیر کو فرش پر بٹھا کر شمشیر کی پیٹھ پر دونوں ہاتھ رکھ کر بولی۔

"میرے چاچا کچھ بتاؤ تو سہی آخر۔ کیا ہوا؟ کچھ تو کہو۔"

شمشیر نے بازو سے اپنی آنکھوں کو چھپا کر کہا۔

"دلیر مصر میں ہے اور مصر پر اٹلی نے حملہ کر دیا ہے۔ اب وہاں جہاز بم برسا رہے ہوں گے، توپیں چل رہی ہوں گی، بندوقوں کی تڑتڑ اور گرد و غبار اور دھواں اور دھائیں دھائیں...... میرا نازوں سے پالا دلیر، میری حرص کا شکار، لیر، میرے دلیر میرے......" وہ پھر رونے لگا۔

چھ مہینے تک شمشیر اور شاداں کے آنسو خشک نہ ہوئے اور دعائیں بند نہ ہوئیں۔ مزاروں پر دیئے جلے۔ بھکاریوں میں گڑ بانٹا گیا۔ بکرے قربان ہوئے۔ دونوں ایسے حواس باختہ ہو گئے کہ رات کو گھر میں دیا تک نہ جلتا اور اگر جلتا تو جلتا ہی رہتا۔ کپڑے میل سے اٹ جاتے تو یونہی رسا تھوپ تھاپ کر الگنی پر ڈال دیئے جاتے۔ شیر بیمار پڑتا تو کسی آتی جاتی بڑھیا سے دوا پوچھ لی جاتی۔ چوپال پر پٹواری سے لوگ نئی خبروں کا تقاضا کرتے تو وہ کہتا، "بھئی نئی خبریں بہت ہیں پر

اگر چچا شمشیر نہ ہو تو بات کا سارا مزا کرکرا ہو جاتا ہے۔ اسے آنے دو۔''

مگر شمشیر کو اب چوپال پر بیٹھ کر گپیں ہانکنے کی فرصت ہی کہاں تھی...... وہ نوجوان تک اداس ہو گئے تھے جن پر نہایت کڑی مگر شگفتہ تنقید کر کے وہ قہقہوں کا طوفان مچا دیتا تھا۔

چھ مہینے کے بعد اسے دلیر کا خط ملا کہ لڑائی میں اس کے کندھے پر معمولی سے زخم آئے اور اب وہ تندرست ہو کر عنقریب انڈیا آنے والا ہے۔

''انڈیا؟'' اس نے پٹواری سے پوچھا۔

''ہاں......یعنی ہندوستان''۔

''یہ انگریزی ہے؟''

''ہاں۔''

''یعنی دلیر اب انگریزی بھی جانتا ہے؟''

''یہی معلوم ہوتا ہے۔''

''اری شاداں بیٹی......'' وہ گھر آ کر پکارا......''کچھ سنا...... دلیر انگریزی بھی بولنے لگا......اور اب واپس آ رہا ہے......اور دیکھ...... وہ مرغی پھر رہی ہے نا وہ گوری سی، بانجھ کم بخت جو بڑے نخروں کے ساتھ تین مہینے بعد ایک ذرا سا انڈا برآمد کرتی ہے۔ اسے ذبح کرا لے اور ساتھ ہی گورکھ کی دکان سے جوشی چاول لے آ...... اور دیکھ بڑے مٹکے میں جو گڑ پڑا ہے نا، وہ بچوں میں بانٹ دے......ہاں......''

باہر گلی میں آ کر وہ خواہ مخواہ ایک نوجوان کے پیچھے پڑ گیا۔

''ارے طرے باز! ارے بائیں مڑتے ہوئے دائیں دیکھنے والے بات سن۔ پگڑی کو اتنی کلف نہیں لگانی چاہئے کہ اچھی خاصی ملائم ململ ٹین کا پترہ بن کر رہ جائے۔''

شمشیر پھر چوپال کی رونق بن گیا۔

''جنگ کی کوئی نئی خبر؟'' اس نے پٹواری کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

''کوئی تروتازہ خبر ہو بھئی۔ ننھے ننھے گاؤں اور چھوٹی موٹی کھاڑیاں اور تل بھر کے جزیرے...... نہ نہ بہت ہو چکیں باتیں۔ کوئی ایسی خبر سناؤ منشی جی کہ اوسانوں کو ٹھکانہ ملے۔''



دادا شہباز ایک بڈھے سے کسی بلغم توڑ نسخے کے اجزاء پوچھ رہا تھا، یکایک چونکا اور کھسک کر شمشیر کے سامنے آ گیا۔

''کیا کہا میاں شمشیر، ہائے ہائے ہائے، انسان بھی کتنا طوطا چشم ہے، قرآن کی قسم ......ارے تمہارا دلیر مصر میں تھا تو تم وہاں کے ہر ٹیلے کی خبر سنتے تھے اور اب تمہارا دلیر مصر سے واپس آ رہا ہے تو تم ننھے منے گاؤں اور چھوٹی موٹی کھاڑیوں کا ذکر ہی نہیں سنو گے؟ کوئی بہت بڑی خبر سنو گے تم؟ تو بھئی جنگ کی بہت بڑی خبر تو وہی ہوتی ہے نا جس میں ان گنت انسان کھیت رہیں اور میاں شمشیر جو جوان تمہیں بہت بڑی خبر سنانے کے لیے جان دیں گے ان کے بھی تو باپ ہوں گے، ان کی بھی تو نئی نویلی بیویاں ہوں گی اور معصوم بچے اور پیارے دوست اور ہمدرد رشتہ دار۔ ان کی امیدیں اور ان کے حوصلے۔ چاہے وہ جرمن کے ہوں چاہے انگریز، چاہے ہندوستانی، میں انسانوں کی بات کر رہا ہوں۔''

شمشیر کا چہرہ ایک خوفناک ندامت آمیز سنجیدگی کے ہالے میں گھر گیا۔ مٹی ہوئی جھریاں پھر سے ابھر آئیں۔ پہلو بدلا، اور سر پر ہاتھ پھیر کر شہباز کی طرف دیکھا۔

''تم ٹھیک کہتے ہو چچا......'' اس کی آواز کھوکھلی تھی اور بج رہی تھی اور اس میں گھبراہٹ کے اتار چڑھاؤ تھے۔'' میں نے تو ویسے ہی بات کی تھی کہ...... بات یہ ہے کہ دادا کہ تم ٹھیک کہتے ہو۔''

''میں نے غلط بات کب کہی ہے؟'' شہباز الجھ رہا تھا۔

''صرف اب۔'' شمشیر موضوع کو بدلنا چاہتا تھا۔

لوگ ہنس پڑے۔

''میرا مطلب ہے میں نے کبھی نہیں کہی......''

''سچ بات۔'' شمشیر نے دادا شہباز کا فقرہ پورا کر دیا اور چوپال قہقہوں سے گونج اٹھی۔

مگر شہباز اپنے احساسات کی تلخی سے ابھی پیچھا نہیں چھڑا سکا تھا بولا۔

''تم مجھ سے بہت چھوٹے ہو، شمشیر۔ اور تم نے مجھ سے کم دنیا دیکھی ہے۔ پچھلی لام کو ان آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں۔ سینکڑوں جرمنوں کو موت کے گھاٹ اتارا، اور سچ کہتا ہوں، دشمن

کی ہر لاش سے میرے دل کا ایک ٹکڑا چپک کر رہ گیا۔ اندھیری گرجتی دھاڑتی راتوں میں مردہ جسموں سے ٹھوکریں کھائیں اور ٹھوکریں کھا کر گرا بھی تو لاشوں پر کسی کی انتڑیاں باہر پڑی تھیں کسی کا بھیجا چٹان پر بکھر گیا تھا کسی کی ٹانگیں غائب ہیں کوئی مرنا چاہتا ہے اور مر نہیں سکتا کوئی جینا چاہتا ہے مگر جی نہیں سکتا۔ میں نے ایک روز ایک لاش دیکھی۔ جرمن سپاہی تھا۔ اتنا خوبصورت تھا کہ مورت چھاپ لینے کو جی چاہے۔ میں نے اس کی جیبیں ٹٹولیں تو اندر سے سنہری بالوں کا ایک گچھا نکلا۔ اور کسی پھول کی چند سوکھی پتیاں اور ایک مڑی تڑی تصویر...... ایک لڑکی کی...... جس کی آنکھیں اتنی گھمبیر تھیں، قرآن کی قسم کہ جہاں ڈوب جائے اور اس کی آنکھیں جیسے پوچھ رہی تھیں۔ ''سچ مچ کیا تم واپس نہیں آؤ گے؟'' میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ توپوں کی دھائیں دھائیں اور دھوئیں اور دھول کی اس دنیا میں میر آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے یہ تینوں چیزیں اس کی جیب میں ڈال دیں۔ اس کے چہرے کو دیکھتا رہا اور میاں شمشیر، میری بات سننا۔ میں سچ کہتا ہوں میں چیخ کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے منہ سے اچانک چند مکھیاں نکلیں اور اس کے نیلے ہونٹ اور ننھی ننھی سنہری مونچھوں پر بیٹھ کر پر سنوارنے لگیں...... یہ نوجوان دنیا کو بہت بڑی خبر سنانے کے لیے مرا...... اور میں نے ان تمام خونوں کے بدلے سات روپے پنشن پائی...... یہ ساتھ ٹھیکریاں...... یہ سات لعنتیں......'' دادا شہباز کی آواز بھرا گئی اور وہ لاٹھی سنبھالتا چوپال پر سے اتر گیا۔

''دادا'' شمشیر نے اسے پکارا۔

وہ بغیر مڑے بولا۔

''میں پاگل ہو جاؤں گا مجھے جانے دو۔''

''دادا'' شمشیر ننھے بچے کی طرح پکارا۔ اور پھر سر جھکا کر بیٹھ رہا۔ ایک مجرم کی طرح شرمندہ اور نڈھال...... جیسے دنیا کی ساری جنگوں کا ذمہ دار صرف وہی ہو۔

صبح کو اٹھا تو شاداں کے چہرے پر غیر معمولی تازگی دیکھ کر اس کا احساس مسرت پھر سے جاگ اٹھا اور جرمن سپاہیوں کی لاشیں ایک طرف سرک گئیں۔

''دلیر آ رہا ہے...... دلیر مصر سے بخیریت آ رہا ہے۔'' اس کی ذاتی تسلی کے لیے یہی خیال



کافی تھا اور دادا شہباز کی بھرائی ہوئی آواز اور ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں۔'' اور میں پاگل ہو جاؤں گا......'' بڑھاپا کتنا ذکی الحس ہوتا ہے۔ اس نے پوچھا۔

بڑھاپا کتنا ذکی الحس ہوتا ہے اس نے ایک مرتبہ پھر سوچا۔ یعنی دلیر آ رہا ہے تو آ کر واپس بھی تو جائے گا۔ اور جنگ سے انسان ایک مرتبہ بچ نکلے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہمیشہ بچتا چلا جائے۔

دادا شہباز! قتلے کر ڈالوں تیری زہریلی زبان کے...... بات کیا تھی اور تو نے کہاں پہنچا دی!

اس نے بہت کوشش کی مسکرائے، قہقہے لگائے، پھبتیاں کسے مگر اس کے ذہن پر اچانک ایک خوبصورت چہرہ ابھرتا اور پھر نیلے ہونٹوں اور سنہری مونچھوں پر مکھیاں بھنبھناتیں اور کلیجے میں کرچ سے سنگین پیوست ہو جاتی اور انتڑیاں باہر ابل پڑتیں۔ وہ شاداں سے کہتا۔

''بیٹی کوئی بات سناؤ......'' مگر وہ مسکرا کر پیاز کاٹنے لگتی۔

''ارے بھئی کوئی بات سناؤ''...... وہ گلی کے نکڑ پر بیٹھے ہوئے لوگوں سے کہتا۔ ''دلیر کب آئے گا؟'' سوال کا جواب سوال ہی میں ملتا۔

''دادا کوئی بات سناؤ......'' اس نے چرکے لگانے والے شہباز سے مرہم کی التجا کی۔

''بات؟'' بڈھے نے پوچھا۔ ''یعنی کوئی بہت بڑی خبر؟''

اور شمشیر کے جی میں آئی کہ ہڈیوں کے اس ڈھانچے کو توڑ مروڑ کر ببول میں پھینک آئے۔

چند روز بعد اسے دلیر کا خط ملا کہ وہ گھر نہیں آئے گا۔ کراچی اترتے ہی اس کی رجمنٹ رنگون چلی جائے گی اور رنگون سے سنگاپور جانے کا قصد ہے۔

''دلیر نہیں آ رہا......'' ایک دھماکے کی طرح یہ الفاظ اس کے لبوں سے نکلے اور شاداں جو مسالہ رگڑ رہی تھی دم بخود ہو کر دیوار سے لگ کر بیٹھ گئی۔

''دلیر نہیں آ رہا، وہ رنگون جا رہا ہے۔'' اس نے دادا شہباز کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے چوپال پر اعلان کیا۔

"بہت بری خبر ہے بھئی۔" دادا شہباز کی لے ابھی نہیں ٹوٹی تھی۔

شمشیر بگڑ گیا۔

"دیکھو دادا بہت لحاظ کیا تمہارا۔ تم چند دنوں سے ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئے ہو۔ یہ اچھی بات نہیں۔ میں تمہارے سفید بالوں کی عزت کرتا ہوں ورنہ......" اور وہ غصے سے کانپتا ہوا چوپال پر سے اٹھ آیا۔

پٹواری نے آواز دی۔

"جنگ میں یونہی ہوتا ہے چچا۔"

اور شمشیر نے پلٹ کر پٹواری کی طرف یوں دیکھا جیسے بس چلے تو اس کی کھوپڑی ادھیڑ کر رکھ دے۔

لیکن اسی روز ایک شہباز یا پٹواری کیا وہ سارے گاؤں سے بگڑ گیا۔ شاداں تک کو گھرک دیا۔

"لوہے کی زبان ہوتی تو شائد مرچیں اثر نہ کرتیں، مگر اب تو گلے سے ناف تک جلتا ہوا فتیلہ رکھ دیا ہے تمہارے سالن نے...... بڈھوں کو جان سے مارنے کے اور بھی تو طریقے ہیں۔ کفگیر جمادو کنپٹی پر۔ کڑاہی دے مارو ماتھے پر...... لے جاؤ، میں نہیں کھاؤں گا۔"

مگر آہستہ آہستہ وہ سنبھلتا گیا۔ اس کا بیٹا رنگون میں تھا اور اس کے خیال میں یہ ناممکن تھا کہ جنگ مغرب سے ہٹ کر ہزاروں میل کی الٹی زقند بھرے اور مشرق کے مرغزاروں میں ناچنے لگے۔ "مشرق میں کیا پڑا ہے۔" پٹواری نے کہا تھا۔ "مشرق کے لیے دوسرے بم اور توپیں تھوڑی ہیں کہ اب یہ تکلف بھی کیا جائے۔"

"ایک جاپان ہے۔" دادا شہباز نے جہاندیدہ سیاست دان کے انداز میں کہا تھا" سو گنجی نہائے گی کیا اور نچوڑے گی کیا۔ برسوں سے سر پٹخ رہا ہے پر یہ افیمی ابھی تک اس کے مقابلے میں ڈٹے ہوئے ہیں اور بھئی جاپانی مال تو تم جانتے ہی ہو۔ جاپانی کھلونے۔ ادھر بچے کے ہاتھ میں آئے ادھر دانت نکال بیٹھے۔ اور جاپانی ریشم کے کپڑے۔ ایک تاگا لٹک آئے تو سمجھو سارا تانا بانا اشارے کا منتظر ہے۔ ان کے جہاز بھی تو ٹین کے بنے ہوتے ہیں اور ان کے سپاہی ٹھنگنے



ناٹے۔ تم یوں جما کر ان کی کھوپڑی پر تھپڑ مارو تو زمین میں دھنس جائیں۔"

"نہیں نہیں" پٹواری نے دادا شہباز کو ٹوکا تھا" یہ بات تو نہیں دادا۔ مگر جنگ ابھی ادھر نہیں آئے گی۔ جنگ زندہ لوگ لڑتے ہیں۔ لاشوں نے بھی کبھی لڑائیاں کی ہیں بھولے بادشاہ۔"

ادھر دلیر کے خط پن خط آرہے تھے۔ رنگون کے پگوڈے، برما کے جنگل، ناریل اور کیلے اور...... "ہم بڑے مزے میں ہیں۔ رنگون برما کی جنت ہے۔ جنگ نہ ہوتی تو میں شاداں، شیر اور آپ کو یہاں بلا لیتا۔"

شمشیر پٹواری کے پاس دوڑ آیا۔

"کیا رنگون میں بھی جنگ ہو رہی ہے منشی جی؟"

پٹواری نے کان پر قلم دھر کر کہا۔

"یہ جنگ کہاں نہیں ہو رہی چچا۔ جنگ صرف توپ بندوق کی تو محتاج نہیں...... بھوک کی بھی جنگ ہوتی ہے۔ غلامی کی بھی جنگ ہوتی ہے۔ انتظار کی بھی جنگ ہوتی ہے۔ جنگ ہر جگہ ہو رہی ہے۔ رنگون میں بھی ہو رہی ہے۔ ہمارے گاؤں میں بھی ہو رہی ہے۔ یہ ازلی وابدی جنگ...... یہ جنگ جو کبھی ختم نہ ہوگی۔ یہ جنگ تو دریا سے نہریں نکالتی ہے جو سرسبز کھیتوں میں سے سڑکیں گزارتی ہے جو پانی پر لگان لگاتی ہے جو پولیس کے سپاہیوں کو نمرود کے اختیارات بخشتی ہے جو غریبوں کے کھدر میں جوئیں ڈالتی ہے جو امیروں کے ریشم تلے گھٹیا کی صورت میں پروان چڑھتی ہے...... تم ہر روز جنگ جنگ پکارتے ہو، جنگ ہر جگہ جاری ہے۔ ہماری زندگی خود ایک جنگ ہے۔"

"مگر جنگیں ختم بھی تو ہوتی ہیں۔"

"نہیں...... کئی ایسی جنگیں بھی ہیں جو قیامت تک جاری رہیں گی۔ اب جنگ ختم ہوگی تو ایک نئی جنگ آدھمکے گی۔ وہ امن کی جنگ ہوگی۔ امن قائم کرنے کے لیے تجارت کی جنگ ہوگی۔ تجارت بڑھانے کے لیے سمندری راستوں کی جنگ ہوگی۔ ان کے عقب میں انسان کی پیدائشی حقوق کی جنگ ہوگی اور جب یہ جنگ ہوگی...... جب یہ جنگ ہوگی......" اور پٹواری نے

کان پر سے قلم اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا اور بولا۔ ''کھتونی کہاں گئی؟''

چند روز کے بعد اس نے پٹواری سے خبر سنی۔

''جاپان نے امریکہ پر حملہ کر دیا۔''

اور پھر اتنے ہی روز بعد اسے معلوم ہوا کہ جاپان نے سنگاپور لے لیا۔

مگر دلیر تو رنگون میں تھا اور رنگون سنگاپور سے بہت دور ہے۔ گھر آ کر اس نے شیر کو اٹھایا اور صحن میں ٹہلنے لگا۔

''تیرا ابا رنگون ہے اور جنگ ہو رہی ہے سنگاپور میں۔ اور سنگاپور بہت دور ہے رنگون سے۔''

بچے نے ناک پر ہاتھ رگڑ کر دادا کے بال پکڑ لیے اور جب بڑی مشکل سے اس نے بچے کی گرفت ڈھیلی کی تو بچہ رونے لگا۔ شاداں بھاگی آئی۔ وہ رو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے ڈوروں میں خون تھا۔ اس کے گالوں میں خون تھا۔ اس کے ہونٹوں پر خون تھا۔ اس وقت سورج غروب ہو رہا تھا۔ شمشیر نے محسوس کیا کہ ساری کائنات پر انسانی خون کے چھینٹے بکھر گئے ہیں لاشیں پہیوں تلے چیخ رہی ہیں۔ کھوپڑیاں فضا میں اڑتی پھر رہی ہیں۔ کسی آسیبی ہاتھ نے افق پر سے لپک کر کھیتوں کی ہریالی کو نچوڑ لیا ہے اور ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے جس میں تازہ خون کی بو ہے، سڑتی ہوئی لاشوں کی بو ہے، جھلسے ہوئے چمڑے کی بو ہے۔

''دیا جلاؤ۔'' وہ پکارا۔

کچھ دیر تک انتظار کے بعد وہ بھڑک کر اٹھا اور صحن میں جا کر چنگھاڑا۔

''شاداں میں بک رہا ہوں...... دیا جلاؤ۔''

وہ اس وحشت ناک خاموشی کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ دانت بھینچ کر چلایا۔

''دیا جلاؤ شاداں، مجھے اندھیرا نگل جائے گا۔''

دروازے پر کسی کی دستک ہوئی۔

''کون ہے؟''

وہ اسی شدت سے پکارا اور دروازے تک گیا۔ مہاجن کی ٹھوڑی جھٹپٹے میں تھیلی کی طرح



لٹک رہی تھی۔

''اب کے تم نے قسط نہیں دی۔''

''نہیں دوں گا قسطیں۔'' شمشیر نے کواڑ پر گھونسا جما کر کہا۔ ''کب تک دیتا رہوں گا قسطیں؟ میں نے تمہاری قسطوں کے لیے اپنا بچہ موت کے منہ میں ڈال دیا۔ اپنے آنگن کی رونق لٹوا دی۔ اپنی روح کو نچوڑ کر تیری پیاس بجھانی چاہی پر تیری پیاس نہیں بجھے گی۔ تو نے میرے دلیر کو رڑکا۔ اب تو میرے شیر کو بھی چبائے گا...... جا نہیں دیتا قسطیں۔ بتا دے جا کر اپنے ہوتوں سوتوں کو...... نالش کر دے......''

پیچھے سے شاداں نے آ کر اسے کھینچ لیا۔

''آپ کس سے بول رہے ہیں! سیٹھ تو چلا گیا۔''

''دیا کیوں نہیں جلایا تم نے؟''

''دیا جلایا ہے۔''

''کہاں جلایا ہے......؟ کدھر جلایا ہے؟...... جلایا ہوتا تو......'' مگر دیا جل رہا تھا اور دیئے کی روشنی میں شاداں کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ خود شمشیر کا سارا وجود جل رہا تھا۔ وہ دھم سے بستر پر جا گرا۔ بہت دیر کے بعد کروٹ بدلی۔ اٹھ کر بیٹھا۔ سر کو دبایا اور ہولے سے بولا۔

''شاداں بیٹی، ذرا ادھر آ کر دیا بجھا دے، تیل ضائع ہو رہا ہے خواہ مخواہ۔''

دلیر کی خاموشی اور خطرناک ثابت ہوئی۔ قسم قسم کے وسوسے شمشیر کو پریشان کرنے لگے۔ شاداں گھلتے گھلتے کانٹا بن گئی۔ اس کا دودھ خشک ہو چلا تھا۔ پڑوس کے دھوبیوں سے وہ بکری کا دودھ خرید لاتی تھی مگر شیر ہمک ہمک کر ماں کے سینے سے چمٹ جاتا۔ ادھر پٹواری نت نئی اور خطرناک خبریں سنانے لگا۔ دادا شہباز شمشیر کو بہلانے کے کئی جتن کرتا۔ مگر شمشیر مری ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ ٹال جاتا۔ ہر روز مدرسے جاتا۔ جب ماسٹر جی ڈاک کھولتے تو وہ بت بنا ایک طرف کھڑا رہتا۔ ''تمہارا خط نہیں آیا چچا۔'' ماسٹر جی کہتے اور وہ سر جھکائے گھر کو پلٹ آتا۔

ہر صبح کو مدرسے میں سارا گاؤں جمع ہوتا تھا۔ سب اپنے اپنے بیٹوں بھتیجوں نواسوں اور پوتوں کے خط لینے آتے اور دکھوں کی گٹھڑیاں اٹھا کر واپس جاتے اور پھر ایک دن اچانک ڈاک

کے بھرے بھرے تھیلے میں سے سرکاری خطوط کا ایک ڈھیر سا برآمد ہوا۔ ایک خط شمشیر کے نام بھی تھا۔ اسے سرکار نے اطلاع دی تھی کہ دلیر جاپانیوں کا قید ہو چکا ہے۔

خط کھلتے جاتے تھے اور آنکھیں بھیکتی جاتی تھیں۔ اچانک ایک بوڑھے نے چٹاخ سے اپنی گنجی کھوپڑی پر ہاتھ مار کر کہا۔

''میں اجڑ گیا''

اور پھر ہر طرف سسکیاں اور فریادیں اور شیون...... ڈاک خانہ ماتم کدہ بن گیا۔ کوئی جنگ میں مارا گیا۔ کسی کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ کوئی جاپانی قیدی تھا۔ آن کی آن میں گاؤں کے بہت سے گھروں میں واویلا مچ گیا۔ چھاتیاں کوٹی جانے لگیں۔ بال نوچے جانے لگے۔ گلیوں میں بھگدڑ مچ گئی۔

''جنگ ہر جگہ ہے۔''

شمشیر کے کانوں میں پٹواری کے الفاظ گونج رہے تھے۔

''شاداں......شاداں......'' اور صحن کے کونے میں بیٹھی ہوئی شاداں نے سر اٹھایا۔

اس کی آنکھیں سوج رہی تھیں اور کھلے بال زمین کو چھو رہے تھے۔

''میں سن چکی ہوں۔'' اس نے بلکتے ہوئے کہا۔

''شیر کہا ہے؟'' شمشیر نے پوچھا۔

''پڑا ہوگا کہیں۔'' شاداں گھٹنوں میں سر دے کر رونے لگی۔

شیر اندر کمرے میں ایک کھٹولے کے نیچے لڑھکتا پھر رہا تھا۔ اس کے منہ میں مٹی تھی اور بالوں میں تنکے اٹک گئے تھے۔ شمشیر نے اسے اٹھایا چوما چوم چوم کر اسے نڈھال کر دیا اور پھر اسے شاداں کے پاس بٹھا کر بولا۔

''یہ سب میرا کیا دھرا ہے۔ مجھ بوڑھے کا۔ مجھ خناس کا۔ بیٹے کو یوں جنگ میں بھیجا جیسے جہاد کا حکم مل چکا ہے......میں......میں......'' مگر اس نے اچانک محسوس کیا کہ یہ مقام اور یہ موقعہ ایسی باتوں کا نہیں۔ پلٹ کر اپنے پلنگ پر آیا۔ وہاں سے اٹھ کر مرحوم نوجوانوں کے والدین کے پاس جا نکلا۔ ایک گھر میں اسے پٹواری مل گیا۔ بولا۔



''بڑا افسوس ہوا چچا۔''

شمشیر نے بازو اٹھا کر انگلیوں کو ایسا چکر سا دیا جیسے کہہ رہا ہو ''قسمت۔''

''جب تم اپنے کلیجوں کے ٹکڑوں کو جنگ کی بھٹی میں جھونک رہے تھے تو تمہیں یہ کسی نے نہ بتایا کہ......'' اس وقت ذیلدار فاتحہ خوانی کے لیے آ نکلا اور پٹواری دبک کر دیوار سے لگ گیا۔

جاپان کی فاتحانہ یلغار برق رفتاری سے بڑھ رہی تھی۔ ادھر جرمنی نے اتحادیوں کے چھکے چھڑا دیئے تھے۔ مگر اب گاؤں والے بالکل بے حس تھے جیسے جنگ کے ساتھ ان کی دلچسپی اور وابستگی ان کے بیٹوں اور پوتوں کی وجہ سے تھی۔ اور جب وہ کٹ مرے یا قیدی ہو گئے تو جنگ ختم ہو گئی۔ باہر چراگاہوں میں ریوڑ چرنے لگے تو ان کے پیچھے بوڑھے بوڑھے گڈریئے ہوتے کھانستے اور ہانپتے ......کھیتوں کی رکھوالی کرنے والیاں اپنے بھائیوں اور خاوندوں کی یاد میں دھیمے سروں میں گاتیں اور روتیں۔ چوپالوں پر لاؤ کے اردگرد دہقان چپ چاپ بیٹھے رہتے۔ گلیوں میں خاک اڑتی۔ ٹھنڈی کنواری صبحوں کو بوڑھیوں کی سسکیاں اور کھانسیاں داغدار کر دیتیں۔ پھولتی ہوئی شفق کے کلیجے میں خرخراتے ہوئے گلے والے عمر رسیدہ موذن کی آواز برچھے کی طرح گھس جاتی۔ زندگی جیسے پاؤں گھسٹتی پھر رہی تھی۔ ماری ماری خانماں برباد اور پریشان حال گھومتی اور چکراتی ہوئی اونچی گگروں پر رکھتی اور گہری کھاڑیوں میں ٹھٹکتی ہوئی...... لال گالوں اور چمکتی آنکھوں اور سریلے گیتوں کی تلاش میں......مگر لال گالوں کو گدھ نوچ کر لے گئے تھے چمکتی آنکھیں مصر کے ریگستانوں اور برما کے جنگلوں میں بجھ چکی تھی اور سریلے گلوں کا رس صحرائی مکھیوں نے چوس لیا تھا......اور جنگ جاری تھی......عوام کی جنگ......جمہوریت کی جنگ......نوع انسان کی آزادی کی جنگ...... اور دریائے سندھ سے ایک بڑی نہر نکالی جارہی تھی اور دادا شہباز کی ایک بیگھہ زمین پر سے پکی سڑک گزرنے والی تھی۔ اشیائے خوردنی نابود ہو رہی تھیں۔ ایک ہندوستانی نے ایک یورپین نازنین کے بوسے کے عوض ہزاروں روپیہ کا چندہ جنگ میں دیا تھا اور مہاجن شمشیر کے پیچھے سائے کی طرح لگ گیا تھا۔

''تھوڑی سی رقم ہی تو باقی ہے، چکا دو، مجھے نیا دھندا شروع کرنا ہے''۔

''نیا دھندا......!'' پٹواری نے کہا تھا۔ ''یعنی اناج کے ذخیرے اور ریزگاری کی تھیلیاں

اور......''

''نہیں......نہیں......'' مہاجن نے ٹھوری کے بلوں میں سے میل کی ایک مروڑی نکال کر کہا تھا......''میں کانگریسی ہوں میں ایسا نہیں کروں گا۔''

ہے شمشیر چچا...... جیسے ہر گاؤں والا پکار رہا تھا...... ارے کچھ بولو کوئی پھبتی کوئی مذاق کوئی لطیفہ...... کچھ سناؤ بھئی ورنہ ہماری روحیں بجھ جائیں گی۔ ہمیں نوجوان بھائی اور بھتیجے اور پوتے راتوں کی خاموشیوں میں آکر ستاتے ہیں۔ لال لال آنکھیں نکال کر ہمیں اپنے پھٹے ہوئے پیٹ کٹے ہوئے بازو اور نچی ہوئی رانیں دکھاتے ہیں اور کہتے ہیں......''مبارک ہو مبارک ہو مبارک ہو۔'' ہے شمشیر چچا کوئی بات سناؤ ہمارے کانوں میں عزیزوں کی کراہیں برمے کی طرح گھسی جارہی ہیں۔ ہماری بیوہ بہنیں، ہماری لٹی ہوئی بیٹیاں، ہمارے کچلے ہوئے بچے......شمشیر چچا، ہے شمشیر چچا!

مگر شمشیر چچا پر تو کوئی اور دھن سوار تھی۔ وہ اب چپ چاپ رہنے لگا تھا۔ ہر روز ڈاک خانے میں جانا اس کا معمول ہوگیا تھا وہاں سے ناکام لوٹ کر وہ پٹواری کے پاس چند لمحے گزارتا اس۔ اور پٹواری کے زرد سوکھے ہوئے چہرے میں ٹھنسی ہوئی بڑی بڑی بے رونق آنکھیں چمچما اٹھتیں۔

''یہ جنگ کبھی ختم نہیں ہوگی۔ یہ جنگ کرۂ ارض کی آخری جنگ ہے۔ اس جنگ میں آدم کی اولاد جل بجھ بھسم ہوجائے گی۔ اور پھر اس راکھ سے ایک نئے آدم کی تعمیر ہوگی۔ جس کی اولاد صحیح انسان ثابت ہوگی وہ ایک گھر کی آبادی کے لیے بیس گھر نہیں اجاڑے گی۔ وہ ایک انسان کو موٹر مہیا کرنے کے لیے سینکڑوں انسانوں کی ٹانگیں نہیں کاٹے گی۔ ساری دنیا کی پیداوار ساری دنیا کی باشندوں کی ملکیت ہوگی۔ اس وقت چچا شمشیر صرف، صرف اس وقت...... صرف تبھی......'' اور وہ کان پر سے قلم اٹھا کر کہتا۔

''کھتونی کہاں گئی؟''

مہاجن کی دکان کے سامنے سے گزرتا تو مہاجن لجاجت سے کہتا۔

''بھئی چکا دو نا باقی حساب۔ اب نیا دھندا شروع کرنا ہے۔ اور پھر اب تو تمہارا بیٹا قیدی ہے اس کی ساری تنخواہ تمہارے نام پر آتی ہوگی۔''



اب تو تمہارا بیٹا قیدی ہے!

اب تو تمہاری قسمت جاگ اٹھی!

اب تو تمہاری برسوں کی تمنا پوری ہوئی۔

اب تو تمہاری پانچوں گھی میں ہیں! لعنت ہو، شمشیر کو ہر کوئی چڑ کے لگا تا تھا۔ دادا شہباز بھی جو کہتا تھا......''آجائے گا، قیدیوں کو تو بادشاہیاں بڑے آرام سے رکھتی ہیں۔ دلیر ضرور آئے گا......'' دادا شہباز اس سے مذاق کرتا تھا۔

آہستہ آہستہ گاؤں پر سکون چھاتا چلا گیا مگر اس سکون میں زندگی کم تھی اور موت زیادہ۔ ہواؤں میں بیواؤں کی آہیں اور یتیموں کی کراہیں تھیں۔ کھیتوں کا رنگ زہر کی طرح کٹیلا تھا۔ مویشی تک اداس نظر آتے تھے۔ ہر جمعرات کو چوپال سے پرے گاؤں کے قبرستان میں بزرگوں کی قبروں پر چراغوں کی قطاریں جلنے لگیں۔ ہر ماں، ہر بیوی اور ہر بہن جمعرات کو مٹی کے دیوں میں تیل بھر کر بزرگوں کے پاس جاتیں، ان کے سرہانے دیئے رکھ کر دعائیں مانگتی۔''میرا بیٹا واپس آئے، میرا مالک واپس آئے، میرا بھیا واپس آئے......''

''کوئی واپس نہیں آئے گا۔'' پٹواری نے کہا تھا۔''میں کہتا ہوں تم جن بھائیوں اور بیٹوں کو واپس بلا رہی ہو، وہ کبھی واپس نہیں آئیں گے۔ وہ مر چکے ہیں یا مر رہے ہیں۔ ان کے ذہن مر چکے ہیں۔ ان کے عقیدے مر چکے ہیں۔ ان کے جسم شائد واپس آجائیں، لیکن وہ اپنی روحوں کو وہیں دفن کر آئیں گے۔ اور اس لیے جب وہ واپس آئیں گے تو تمہارے بھائی اور بیٹے نہیں ہوں گے وہ دھرتی کے بیٹے ہوں گے اور جب میکسیکو میں کسی حبشی پر کوئی امریکن گولی چلائے گا تو درد کے مارے وہ چلا اٹھیں گے۔ جب شنگھائی میں کوئی جاپانی کسی چینی کے تھپڑ مارے گا تو وہ بلبلا اٹھیں گے، جب ڈلی میں کوئی گورا کسی ہندوستانی کے بھیجے پر لات جمائے گا تو وہ تڑپ اٹھیں گے اور پکار اٹھیں گے اور ان کی پکار ہندوستان سے نکل کر لندن کے قلعوں سے ٹکرائے گی۔ واشنگٹن کے محلوں میں گونجے گی۔ ماسکو کے......''

''میرے خیال میں یہ پٹواری یا تو بم بنانے لگے گا یا قید ہوجائے گا۔'' ذیلدار نے ایک

روز تنگ آ کر کہا تھا۔

پٹواری کی باتیں پُر سکون تالاب کی سطح پر گرتے ہوئے ننھے ننھے سنگریزوں کی مانند تھیں۔ لہروں کے دائرے اپنے محیط وسیع کرتے ہوئے پھیلنے لگتے اور مٹ جاتے اور پھر تالاب سو جاتا...... ایک سال گزر گیا۔ دو سال گزر گئے، کبھی کبھی یورپ کے محاذ سے کسی نوجوان کی موت کی خبر آتی، تو اس تالاب میں چٹان سی گر پڑی۔ تالاب تھلتھلا کر رہ جاتا۔ لہریں دیر تک اس کی سطح پر ناچتی رہتیں، اور پھر سکون چھا جاتا...... سکون جو ہر انجام کا آغاز ہے۔

ٹھیک ہی تو ہے۔ وہ بیوائیں جن کے پریشان بال، خشک ہونٹ اور چھلکتی ہوئی آنکھیں دیکھ کر کائنات بھی سسکیاں لینے لگتی ہے۔ وہ بہنیں جن کی چیخ پکار کا خلوص غیر فانی اور ابدی معلوم ہوتا تھا...... اب ترنجنوں میں چرخے گھماتیں، چہلیں کرتیں، قہقہے لگاتیں، ٹہو کے مارتیں اور کہتیں۔

''تیری اوڑھنی کا رنگ تو بالکل نئے نئے خون کا سا ہے بہن نوری......'' اور تیری لونگ اتنی اچھی ناک پر اتنی بھونڈی لونگ، جیسی مصری کی ڈلی پر پکوڑا لٹک کر رہ جائے......'' ناکوں، آنکھوں، بالوں اور اوڑھنیوں کے گورکھ دھندے میں گھری ہوئی یہ بیویاں اور یہ بہنیں مصر کی ریتوں اور برما کی پتاور میں گلی ہوئی ہڈیوں کو فراموش کر چکی تھیں۔ صرف ماؤں کی محبت زندہ تھی۔ یہ ابدیت سے بھی گہری اور لامحدود محبت، جو انقلاب کا نام نہیں جانتی، جو خدا کی طرح اٹل ہے...... اندھیری شاموں میں جب یہ بوڑھی مائیں پلو تلے دیئے چھپا کر بزرگوں کی قبروں پر جاتیں اور جب مقبروں پر سجے ہوئے دیئے، جواب تعداد میں بہت کم رہ گئے تھے، ہوا کے جھونکوں میں اپنی آتشیں زبانیں تھرتھراتے اور قریب بیٹھی ہوئی ماؤں کے فق چہرے میں دھنسی ہوئی آنکھیں شہاب ثاقب کی طرح چمک اٹھتیں تو شمشیر جس کی خاموشی اس عرصہ میں آوارگی کی صورت اختیار کر چکی تھی، لپک کر گھر آتا اور ننھے شیر کو پاس بٹھا کر شاداں سے کہتا۔

''بیٹا آج جمعرات ہے۔ دیا تو جلا دیا ہوتا مزار پر۔ کون جانے اسی تیل کے صدقے خدا ہمارے گھروندے کو پھر سے روشن کر دے......'' تو شاداں انگڑائیوں کا تانتا باندھ کر اٹھتی اور کہتی۔



''بہت دیئے جلائے چچا اور پھر دیئے بجھ جاتے ہیں تو تیل مجاور الٹ کر لے جاتے ہیں۔ دیئے جلانے سے کیا ہوگا؟''

شمشیر کے لیے دلیر کی دوری اب اتنی تشویش ناک نہیں رہی تھی جتنا شاداں کا تغیر۔ دلیر کی قید کے پہلے ہی سال کے آخری مہینوں میں اس کے دبلے پتلے جسم میں تازہ خون دوڑنے لگا تھا۔ صبح سویرے بناؤ سنگھار میں کتنی دیر لگا دیتی۔ بہترین لباس پہنتی شیر کو گھرکتی اور پڑوس میں دھوبیوں کے گھر چلی جاتی۔ ہر مہینے دلیر کی تنخواہ سے دس روپے شمشیر سے جبراً لے لیتی۔

''مجھے بھی زندہ رہنا ہے۔'' وہ کہتی...... ''مہاجن کا حساب شیطان کی آنت بنتا چلا جائے تو میرا کیا بس...... میرا بھی تو حق ہے۔''

شمشیر چپ چاپ دس روپے ہر مہینے اس کے حوالے کر دیتا۔ وہ جانتا تھا کہ جنگ میں صرف جانیں ہی نہیں، آبروئیں اور عزتیں بھی ملیا میٹ ہو جاتی ہیں۔

''سنبھلو، سنبھلو۔'' دادا شہباز کہا کرتا تھا۔ ''سنبھلو شمشیر، چوکنے ہو کر رہو، آخر دوسرے کے بیٹے بھی تو قیدی ہیں۔''

مگر شمشیر کو سنبھلنے کی توفیق ہی کہاں تھی۔ وہ ہمیشہ کے لیے ڈگمگا چکا تھا۔ اس لٹو کی طرح جو کہ فرش پر گرتا ہے تو ایک جگہ قرار نہیں پا سکتا۔ اس کی نوک کو جیسے زمین کے اندر سے کوئی چیز اچھال کر پرے پھینک دیتی ہے۔ اسے کوئی مرکز نہیں ملتا۔ کوئی منزل میسر نہیں آتی۔ سنبھلنے کے لیے فرصت چاہیے، اور شمشیر کے پاس بہت کم فرصت تھی۔ مہینے میں محاذ جنگ سے ایک دو موتوں کی خبر آ جاتی، تو وہ فاتحہ خوانی کے لیے چلا جاتا۔ لوگ امن کے لیے قرآن مجید کے ختم کراتے تو ان میں شامل ہو جاتا، اور جب پلٹتا تو پٹواری کہتا۔

''امن؟ امن تو صرف ایک لفظ ہے۔ امن جنگ کا دوسرا نام ہے، اور امن کی جنگ اصلی جنگ سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ بنگال کا قحط کیا تھا؟ یہ امن کی جنگ تھی۔ یہ ہر چیز کی گرانی!! یہ امن کی جنگ ہے۔ یہ اغواء اور زنا کے نت نئے شوشے؟ یہ امن کی جنگ ہے...... امن...... تم امن کے لیے دعائیں مانگتے ہو؟ حالانکہ تم دو صدیوں سے امن کے مزے لوٹ رہے ہو، دو صدیوں سے تم اس چپ چاپ جنگ میں مبتلا ہو ایسی جنگ جو تمہارا خون نہیں بہاتی، صرف

تمہارے دماغ اور دل کو نچوڑ کر گلے ہوئے چیتھڑے کی طرح پرے پھینک دیتی ہے...... ارے یہ کھتونی کہاں گئی؟"

مگر اب جنگ کی تازہ خبریں حوصلہ افزا ثابت ہو رہی تھیں۔ اور شمشیر پٹواری سے بحث کرنے لگا تھا۔

"ارے بھئی امریکی فوج جزیرہ فلپائن پر اتر آئی ہے نا...... جنگ کو ختم سمجھو۔"

"روسی برلن میں گھس گئے۔"

"یہ نئی جنگ کی ابتداء ہے۔"

"مسولینی کو سولی پر چڑھا دیا گیا۔"

"یہ نئی جنگ کی ابتداء ہے۔"

"یورپ میں جنگ ختم ہوگئی۔"

"اب نئی جنگ شروع ہوگی۔"

"جاپان کے شہر ہیروشیما پر ایک نیا بم گرایا گیا...... ایٹم بم...... ذیلدار کہہ رہا تھا۔"

"مجھے معلوم ہے۔"

اس روز شمشیر کی آنکھیں چمک اٹھیں اور ہونٹوں کی پپڑیاں اچٹ کر رہ گئیں۔ مدّت کے بعد اس نے پھبتی اور مذاق کی طرف توجہ دی۔

"بڑی دیر کے بعد نظر آئے ہو بھئی۔" اس نے ایک نوجوان سے کہا۔ "سناؤ آج کل کون سی گپھا آباد کر رکھی ہے۔"

اور پھر۔ "ابے کھل کر قدم اٹھا...... یوں چل رہا ہے جیسے تہمد کھل گیا ہو تیرا۔"

ایٹم بم کی خوشی میں اس روز اس نے ایک بڑھیا پر حملہ کر دیا۔

"لہنگا سنبھال خالہ، بلاوا دے رہا ہے۔"

بڑھیا پلٹ کر کھڑی ہوگئی اور پھر رو دی۔

"تم سچے ہو شمشیر، تمہارا دلیر واپس آجائے گا نا...... اور میرا حمد...... وہ ادھر تین سال ہوئے مصر میں......" اور وہ روتی ہوئی وہیں بیٹھ گئی۔ "تم مجھ سے مذاق کرتے ہو......؟ کیوں نہ



کرو، تمہارا بیٹا آرہا ہے اور میرا بیٹا...... میرا بیٹا......" سر پر ہاتھ رکھ کر وہ اٹھی اور اپنے بیٹے کے ماتم کو تازہ کرتی ساری گلی کو چونکاتی چل دی۔

"ارے!" شمشیر نے گلی میں جمع ہوتے ہوئے لوگوں کی طرف دیکھا۔ ان کے چہروں پر غم اور غصہ کے آثار تھے اور وہ سب نفرت سے شمشیر کو گھور رہے تھے۔ "ارے!" شمشیر نے دوبارہ کہا اور سر کو دونوں ہاتھوں میں دبا کر وہیں بیٹھ گیا اور بہت دیر تک بیٹھا رہا۔

رات کو چوپال پر لوگ اکٹھے ہوئے تو ذیلدار نے ایٹم بم کا ذکر چھیڑ دیا۔ "اس کی طاقت پانچ لاکھ ساٹھ ہزار من بارود کے برابر ہوتی ہے۔ جب ہیروشیما پر بم گرا تو جو لوگ باہر تھے وہ وہیں دم توڑ گئے اور جو اندر تھے...... وہ مارے حبس کے تڑپ پھڑک کر رہ گئے۔ لاشوں کے چہرے تک نہیں پہچانے جا سکتے۔ بم گرا تو سات آٹھ میل اونچا دھوئیں کا مینار ابھر آیا۔ ہیروشیما بالکل مٹ چکا ہے۔ پچاس ہزار سے زیادہ جاپانی مر چکے ہیں۔ ہزاروں ہسپتالوں میں ہیں۔ ہزاروں کا کچھ پتہ ہی نہیں۔ اب جنگ کو ختم سمجھو۔"

"ہت تیری نکٹے ناٹے کی۔" ایک دہقان بولا۔ "کیسے گرجتا دہاڑتا بڑھتا تھا۔ اور کیسے دبوچا انگریز نے۔"

"نہیں نہیں...... انگریز نہیں......" اعتراض ہوا۔

"ابے نہیں...... انگریز نے۔"

"امریکا نے۔"

"انگریز نے۔"

"ساری عالم انسانیت کے بدبختی اور بدطینتی نے۔" پٹواری بولا اور سب اس کی طرف متوجہ ہوگئے۔ "جنگ میں زہریلی گیس استعمال کرنا منع ہے، مگر زہریلی گیس سے ہزار درجہ خطرناک ایٹم بم استعمال کرنا جائز ہے۔ بھئی بڑے لچکیلے ہیں جنگی اصول۔ اس وقت جب ہٹلر نے گیس چھوڑنے کی دھمکی دی تھی تو کانفرنسیں بلائی جانے لگیں، کمیٹیاں ہونے لگیں اور اب یہ ایٹم بم......"

ذیلدار کڑک کر بولا، "منشی بکواس بند کرو!"

''میں کہتا ہوں'' پٹواری تو جیسے دیوانہ ہوگیا تھا۔ ''ایٹم بم کوئی نئی چیز تو نہیں۔ ہم ہندوستانیوں کے لیے تو ایٹم بم کوئی عجوبہ نہیں۔ بنگال میں کسی ایٹم بم نے قحط ڈالا؟ آسام میں کسی ایٹم بم نے لڑکیوں کی جوانیاں لوٹیں؟ راجپوتانہ اور پنجاب میں کسی ایٹم بم نے بیواؤں اور یتیموں کی فوج کی فوج پیدا کردی۔ ہندوستان پر تو پچھلی دو صدیوں سے ایٹم بم کی بارش ہو رہی تھی اور تم نہ کھولے ہیروشیما کے ایٹم بم کی باتیں یوں سن رہے ہو جیسے تمہارے لیے جنت کا دروازہ کھل گیا...... ایٹم بم کی خبریں تم اخباروں میں کیوں پڑھتے ہو؟ قطب دین سے پوچھو، لال بیگ سے پوچھو، نور محمد خاں سے پوچھو، چچا شمشیر سے پوچھو اور......''

''بکواس بند کرو میں کہتا ہوں۔'' ذیلدار گرجا اور پٹواری تھر تھر کانپتا چوپال پر سے اٹھ کر چلا گیا۔

''منشی پاگل ہو جائے گا۔'' ایک شخص نے رائے ظاہر کی۔

مگر ذیلدار کی غضب ناک خاموشی کا تقاضہ تھا کہ حاضرین بھی خاموش رہیں۔ کڑی نگاہوں کی گھڑکی نے اس اصول توڑنے والے کو کپکپا کر رکھ دیا تھا۔

اب تو نت نئی چٹ پٹی خبروں کا تانتا بندھ گیا۔

''برطانیہ میں چھ سال کے بعد سب لوگوں نے صحیح معنوں میں چھٹی منائی، جنگ ختم ہو رہی ہے۔''

''روس نے جاپان کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔''

''موئے کو مارے شاہ مدار...... جنگ ختم ہو جائے گی۔''

''جاپان نے ہتھیار ڈال دیے۔''

''اللہ بس باقی ہوس، جنگ ختم ہوگئی۔''

جنگ ختم ہوگئی...... جنگ ختم ہوگئی...... پتلیاں چمک اٹھیں۔ گالوں پر گلال پھر گئے۔ قیدی اور عدم پتہ بیٹوں کی مائیں لاٹھیاں ٹیکتی گلیوں میں آ گئیں۔

''سچ مچ...... سچ مچ؟''

''ہاں ہاں...... جنگ ختم ہوگئی، جنگ بالکل ختم ہوگئی۔ اب جنگ نہیں ہوگی۔ اب جنگ



بالکل نہیں ہوگی۔''

اتنی بڑی سچائی پر ایمان لانے کے لیے بھی شیر کا کلیجہ چاہیے۔

''جنگ ختم ہوگئی شاداں بیٹی۔'' شمشیر گھر جا کر چلایا اور شیر کو اٹھا کر اس پر بوسوں کی بوچھاڑ کردی۔

''سچ مچ......؟'' مگر شاداں کے اس استعجاب میں مسرت کے بجائے صرف حیرت تھی۔

''ارے کوئی یقین نہیں کرتا۔ شیر بیٹا، تیرا ابا اب واپس آ جائے گا۔''

''شچ......؟'' ننھے نے بڑی بڑی گول مول آنکھیں پھاڑ کر دادا کو گھورا...... ''تیا لائے دا؟''

''تمہاری سواری کا گھوڑا، عید کے لیے کپڑے اور ٹوپیاں اور بوٹ اور چھڑی اور......''

''پٹاخے۔''

''ہاں ہاں پٹاخے اور پھلجھڑیاں اور......''

''خاک لائے گا۔'' شاداں نے بوڑھے کا منہ نوچ لیا تھا۔

''تنخواہ تو ساری مہاجن ہضم کر گیا۔ وہ تو اپنی جان بچا کر بھی لائے تو شکر کرو خدا کا۔''

اور اس نے نقرئی چوڑیوں کی گھنگھریاں چھنکائیں اور شیر کو گھسیٹ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

کانٹوں کا وہ گچھا جو دلیر کی قید اور شاداں کی سرد مہری نے اس کے حلق میں ٹھونس رکھا تھا، اچھل کر جیسے اس کے دماغ میں کودنے لگا۔ مگر اب جنگ ختم ہو چکی تھی اور اندر ہی اندر گھلنے سے یہی بہتر تھا کہ دلیر کی راہ دیکھی جائے۔

دو تین ہفتے بعد اسے معلوم ہوا کہ انگریزوں نے سنگاپور پر دوبارہ قبضہ کرلیا۔ اور پھر آہستہ آہستہ خبریں آنے لگیں کہ قیدیوں کے جہاز ہندوستان آ رہے ہیں۔ ''دامن کوہ کے ایک گاؤں کا نوجوان جو سنگاپور میں جاپان کا قیدی رہا، گھر واپس آ چکا ہے۔'' اس نے ایک روز ہرکارے کی زبانی سنا، اور اسی روز ننھی سے بقچی کاندھے پر لٹکا کر اسی گاؤں کی راہ لی۔ گاؤں والوں نے بھی اپنے اپنے عزیزوں کے نام اور نمبر لکھ کر دیے، اور وہ ایک ذمہ دارانہ حیثیت

سے، بالکل پرانے بادشاہوں کے ایلچیوں کی طرح پہاڑ کے دامن کی طرف چلا۔

وہاں جا کر اسے نو وارد سپاہی کی زبانی معلوم ہوا کہ قیدی بے شمار تھے اور انہیں ملایا اور جاوا اور دوسرے جزیروں میں بکھیر دیا گیا تھا اس لیے وہ کوئی یقینی خبر نہیں دے سکتا تھا، مایوس ہو کر گھر کو پلٹا۔

تھکا ماندہ کھانستا کھنکارتا جب وہ اپنے گاؤں سے ایک میل کے فاصلے پر پہنچا تو اس نے کچھ دور پٹواری کو اپنی طرف آتا دیکھا۔ دیہاتوں کا ایک جمگھٹا بہت پرے چپ چاپ کھڑا پٹواری کی طرف دیکھ رہا تھا۔

سورج غروج ہونا چاہتا تھا۔ مگر جیسے شمشیر کے گاؤں میں پہنچ جانے کا منتظر کھڑا تھا۔ دھوپ پیلی پڑ گئی تھی درختوں کے پتے اداس اور رنڈھال ہو کر بل کھا گئے تھے۔ کھیتوں پر مردنی کا عالم تھا۔ ٹھکانوں کو جاتی ہوئے پرندوں کی آوازوں کا شیون تھا۔ پگڈنڈی کے لہراتے ہوئے زرّیں فیتے پر ایک گدھا دھول میں نہا رہا تھا۔

''واپس آ گئے چچا؟'' پٹواری نے پوچھا۔

''ہاں...... واپس آ گیا ہوں...... نامراد'' شمشیر نے کہا...... ''مگر تم کہاں چلے؟''

''میں یہاں سے دور جا رہا ہوں ہمیشہ کے لیے۔''

''کیوں...... خیریت تو ہے نا؟''

''خیریت؟'' پٹواری کے ہونٹوں پر ایک عجیب زہریلی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور پھر وہیں چمٹ کر رہ گئی...... ''خیریت امن کی طرح بے معنی لفظ ہے۔ امن کے لفظ سے معنی نچوڑنے کے لیے ماسکو میں مولوٹاف، برنز اور بیون کی کانفرنس ہونے والی ہے اور تمہیں خیریت کا مطلب سمجھانے کے لیے وہ مجمع تمہارا منتظر کھڑا ہے۔ جاؤ بابا...... تم جو ہر کسی کا مذاق اڑاتے تھے، تم جو بڑی بڑی خبریں سننے کے شوقین تھے، تم جو ہنسنے ہنسانے کے سوا اور کچھ جانتے ہی نہ تھے، جاؤ، وہاں اس مجمع میں دادا شہباز سے پوچھو کہ خیریت کیا چیز ہے۔ اور اپنی گھر جانا، وہاں کہیں طاق پر تمہارے بیٹے کا تار پڑا ہوگا...... وہ آ رہا ہے۔''

''دلیر آ رہا ہے؟'' شمشیر بقچی کو پھینک کر پٹواری سے لپٹ گیا، مگر وہ لوہے کی لاٹھ کی



طرح بے حس و حرکت کھڑا رہا اور اسی خوفناک سنجیدگی سے بولا۔ ''ہاں واپس آ رہا ہے تمہارا دلیر...... سو تم تار اٹھا کر شیر کو پکارنا جسے کل صبح اس کی ماں نے دلیر کا تار ملنے کے بعد لاہور کے کسی یتیم خانے کے سفیر کے حوالے کر دیا ہے۔''

''تار ملنے کے بعد؟''

''اور پھر پکارنا۔ شاداں...... شاداں بیٹی۔ تمہاری شاداں بیٹی جو شائد ہیروشیما پر ایٹم بم گرائے جانے کی منتظر تھی۔ جو رات کو تمہارے پڑوسی دھوبی کے ساتھ بھاگ گئی ہے بنوں کی طرف۔''

''کیا کہہ رہے ہو؟''

''اور پھر تجوری کھول کر وہ روپیہ گننا جو تم نے جنگ کی برکت سے کمایا۔ تمہیں امن اور خیریت کے تمام معانی ازبر ہو جائیں گے۔''

وہ شمشیر کے مردہ ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں دبا کر پلٹا اور پگڈنڈی پر ہولیا۔ سورج دریا کے پرلے کنارے پر پھیلی ہوئی پہاڑیوں میں ڈوب چکا تھا۔ شفق نے پٹواری کے سفید لباس میں آگ سی لگا دی۔ وہ ایک شعلہ بن گیا...... دھرتی کے کلیجے سے نکلتا ہوا شعلہ...... رواں دواں ......رواں دواں...... اور پھر یہ شعلہ بجھنے لگا۔ دھوئیں کا ایک بونبا سا بن گیا۔ مشرقی افق کی دھند میں گھلتا ہوا یہ سایہ بڑھتا گیا۔ پھیلتا گیا...... ناپید ہوتا گیا...... اور پھر اسی افق سے چاند بن کر ابھرا۔ جگمگاتا ہوا ہنستا ہوا...... جیسے مغرب میں دبکے ہوئے سورج کے تعاقب میں ہے۔

# چچا سام کے نام پانچواں خط

محترمی چچا جان

تسلیمات۔ میں اب تک آپ کو ''پیارے چچا جان'' سے خطاب کرتا رہا ہوں پر اب کی دفعہ میں نے ''محترمی چچا جان'' لکھا ہے اس لیے کہ میں ناراض ہوں۔ ناراضی کا باعث یہ ہے کہ آپ نے مجھے میرا تحفہ (ایٹم بم) ابھی تک نہیں بھیجا۔ بتائیے یہ بھی کوئی بات ہے۔

سنا تھا باپ سے زیادہ چچا بچوں سے پیار کرتا ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے امریکہ میں ایسا نہیں ہوتا۔ مگر وہاں بہت سی ایسی باتیں نہیں ہوتیں جو یہاں ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر یہاں آئے دن وزارتیں بدلتی ہیں آپ کے یہاں ایسا کوئی سلسلہ نہیں ہوتا۔ یہاں نبی پیدا ہوتے ہیں۔ وہاں نہیں ہوتے۔ یہاں ان کے ماننے والے وزیر خارجہ بنتے ہیں، اس پر ملک میں ہنگامے برپا ہوتے ہیں مگر کوئی شنوائی نہیں ہوتی۔ ان ہنگاموں پر تحقیقاتی کمیشن بیٹھتی ہے۔ اس کے اوپر کوئی اور بیٹھ جاتا ہے۔ وہاں اس قسم کی کوئی دلچسپ بات نہیں ہوتی۔

چچا جان میں آپ سے پوچھتا ہوں۔ آپ اپنے یہاں نبی کیوں پیدا نہیں ہونے دیتے۔ خدا کی قسم ایک پیدا کر لیجئے۔ بڑی تفریح رہے گی۔ بڑھاپے میں وہ آپ کی لاٹھی کا کام دے گا۔ اس لاٹھی سے آپ امریکہ کی ساری بھینسیں ہانک سکیں گے (بھینسیں تو یقیناً آپ کے یہاں ضرور ہوں گی)

اگر آپ نبی پیدا کرنے سے کسی وجہ سے معذور ہوں تو مجھے حکم دیجئے میں مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب سے گزارش کروں گا وہ اپنا صاحب زادہ بھیج دیں گے۔ جلدی لکھیے گا۔ ایسا نہ ہو آپ کے دشمن روس سے مانگ آجائے اور آپ منہ دیکھتے رہ جائیں۔



بات ایٹم بم کی تھی جو میں نے آپ سے تحفے کے طور مانگا تھا۔ اور نبی جموں کی طرف چلا گیا...... ہاں...... کتنی معمولی بات تھی۔ میں نے صرف ایک چھوٹا، بہت ہی چھوٹا ایٹم بم مانگا تھا جس سے میں ایک ایسے آدمی کو اڑا سکتا جو مجھے اپنے گھیرے دار شلوار کے نیفے کے اندر ہاتھ ڈال کر ڈھیلا لگاتا نظر آتا ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے میری خواہش کی شدت کو محسوس نہیں کیا۔ شاید آپ ہائیڈروجن بموں کے تجربات میں مشغول تھے۔

چچا جان، یہ ہائیڈروجن بم کیا بلا ہے۔ آٹھویں جماعت میں ہم نے پڑھا تھا کہ ہائیڈروجن ایک گیس ہوتی ہے ہوا سے ہلکی، آپ اس کرۂ ارض کے سینے سے کس ملک کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتے ہیں۔ روس کا؟

مگر سنا ہے وہ کم بخت نائیٹروجن بم بنا رہا ہے۔ آٹھویں جماعت ہی میں ہم نے پڑھا تھا کہ نائیٹروجن ایک گیس ہوتی ہے جس میں آدمی زندہ نہیں رہ سکتا۔ میرا خیال ہے کہ آپ اس کے جواب میں آکسیجن بم بنادیں۔ آٹھویں جماعت میں ہم نے پڑھا تھا کہ نائیٹروجن اور آکسیجن گیس جب آپس میں ملتی ہیں تو پانی بن جاتا ہے۔ کیا ہی مزا آئے گا ادھر آپ آکسیجن بم پھینکیں گے ادھر روس نائیٹروجن بم...... باقی دنیا پانی میں ڈبکیاں لگائے گی۔

خیر یہ تو مذاق کی بات تھی۔ سنا ہے آپ نے ہائیڈروجن بم صرف اس لیے بنایا ہے کہ دنیا میں مکمل امن وامان قائم ہوجائے۔ یوں تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ لیکن مجھے آپ کی بات کا یقین ہے ایک اس لیے کہ میں نے آپ کا گندم کھایا ہے اور پھر میں آپ کا بھتیجا ہوں۔

بزرگوں کی بات یوں بھی چھوٹوں کو فوراً ماننی چاہیے لیکن میں پوچھتا ہوں، اگر آپ سے دنیا میں امن وامان قائم کردیا تو دنیا کتنی چھوٹی ہوجائے گی۔ میرا مطلب ہے کتنے ملک صفحۂ ہستی سے نیست ونابود ہوں گے...... میری بھتیجی جو اسکول میں پڑھتی ہے کل مجھ سے دنیا کا نقشہ بنانے کو کہہ رہی تھی۔ میں نے اس سے کہا، ابھی نہیں۔ پہلے مجھے چچا جان سے بات کر لینے دو۔ ان سے پوچھ لوں کون سا ملک رہے گا کون سا نہیں رہے گا۔ پھر بنادوں گا۔

خدا کے لیے روس کو سب سے پہلے اڑائیے گا، اس سے مجھے خدا واسطے کا بیر ہے۔ سات آٹھ دن ہوئے وہاں سے فنکاروں کا ایک وفد آیا تھا۔ خیر سگالی کر کے میرا خیال ہے اب واپس

چلا گیا ہے اس وفد میں ناچنے اور گانے والیاں تھیں، جنھوں نے ناچ گا کر ہمارے سادہ لوح پاکستانیوں کا دل موہ لیا۔ اب آپ اس کے توڑ میں جب تک وہاں سے کوئی ایسا گاتا، بجاتا ناچتا تھرکتا خیر سگالی وفد نہیں بھیجیں گے کام نہیں چلے گا۔ میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا کہ ہالی وڈ کی چند ''ملین ڈالر'' ٹانگوں والی لڑکیاں یہاں روانہ کر دیجئے، مگر آپ نے اپنے کم عقل بھتیجے کی اس بات پر کوئی غور نہ کیا اور ہائیڈروجن بم کے تجربوں میں مصروف رہے۔ قبلہ جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے۔

ذرا اپنی سفارت خانے متعینہ پاکستان سے پوچھیے۔ یہاں ہر ایک کی زبان پر تمارا خانم اور مادام عاشورہ کا نام ہے، یہاں کا ایک بہت بڑا اردو اخبار ''زمیندار'' ہے اس کے ایڈیٹر بڑے زاہد خشک قسم کے نوجوان ہیں۔ ان پر اسی روسی وفد نے اتنا اثر کیا کہ نثر میں شاعری کرنے لگے ایک پیرا ملاحظہ فرمایئے۔

''جب وہ گا رہی تھی تو کھچا کھچ بھرے ہوئے اوپن تھیٹر (شاید آپ کے یہاں ایسا تھیٹر نہ ہو) میں سامعین کے سانس لینے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ تھیٹر پر جھکا ہوا تاروں بھرا آسمان اور سٹیج کے چاروں طرف ابھرے ہوئے سرسبز درخت بھی دم بخود تھے اور اس گھمبیر سناٹے میں ایک کوئل کوک رہی تھی۔ اس کی تیز، گہری اور روح کو چیر دینے والی آواز، تاریک رات کے سینے میں جا بجا ان دیکھی روشنی کے گہرے گھاؤ ڈال رہی تھی''۔

پڑھ لیا آپ نے؟...... چچا جان یہ معاملہ بہت سنگین ہے۔ ہائیڈروجن بموں کو فی الحال چھوڑیئے اور اس طرف توجہ دیجئے۔ آپ کے پاس کیا حسیناؤں کی کمی ہے۔ چشم بددور ایک سے ایک پٹاخا سی موجود ہے لیکن میں آپ کو ایک مشورہ دوں۔ جتنی بھیجئے گا سب کی ٹانگیں ''ملین ڈالر'' قسم کی ہوں اور ہمارے پاکستانی مردوں کو بوسہ دینے سے نہ گھبرائیں۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر آپ نے ایک جہاز بھر کولینوس ٹوتھ پیسٹ بھیج دی تو میں سب کے دانت صاف کرا دوں گا۔ ان کے منھ سے بو نہیں آئے گی۔

آپ میری بات مان گئے تو آپ کی سات آزادیوں کی قسم کھا کے کہتا ہوں کہ روس والوں کے چھکے چھوٹ جائیں گے اور تمارا خانم اور مادام عاشورہ ناچتی رہ جائے گی اور ''زمیندار''



کے ایڈیٹر کو دن میں تارے نظر آنے لگیں گے۔ لیکن چچا جان ایک بات سن لیجئے اگر آپ نے اگر بھی نیلز کو بھیجا تو اس کے بوسے صرف میرے لیے وقف ہوں گے۔ مجھے اس کے ہونٹ بہت پسند ہیں۔

ہاں، اس خیر سگالی وفد میں کہیں اس حبشی کو یعنے پال روبنسن کو نہ شامل کیجئے گا۔ سالا (سالے کا مطلب ہے بیوی کا بھائی۔ ہم اسے گالی کے طور استعمال کرتے ہیں) کمیونسٹ ہے۔ مجھے حیرت ہے آپ نے اسے ابھی تک ایسٹ افریقہ کیوں نہیں بھیجا۔ وہاں اسے بڑی آسانی سے ماؤ ماؤ کی تحریک میں ماخوذ کر کے گولی سے اڑایا جا سکتا ہے۔

میں اس خیر سگالی وفد کا بے چینی سے انتظار کروں گا اور ''نوائے وقت'' کے مدیر سے کہوں گا کہ وہ ابھی سے اس کا پروپیگنڈہ شروع کر دے۔ بڑا نیک اور برخوردار قسم کا آدمی ہے۔ میری بات نہیں ٹالے گا...... ویسے آپ اسے تحفے کے طور پر ریٹا ہیورتھ کی اوٹو گرافڈ تصویر بھجوا دیجئے گا۔ بے چارہ اسی میں خوش ہو جائے گا۔

میں یہ بھی وعدہ کرتا ہوں کہ جب آپ کا یہ خیر سگالی وفد لاہور میں آئے گا تو میں اسے ہیرا منڈی کی سیر کراؤں گا۔ شورش کشمیری صاحب کو میں ساتھ لے چلوں گا۔ کہ وہ اس علاقے کے پیر ہیں (حال ہی میں آپ نے اس پر ایک کتاب بھی لکھی ہے جس کا عنوان ''اس بازار میں'' ہے...... آپ اپنے سفارت خانے کو حکم دیجئے۔ وہ آپ کو اس کا ترجمہ کرا کے بھیج دے گا) یہاں ایک سے ایک درخشندہ تابندہ ہیرا پڑا ہے...... ہر تراش کا، ہر وزن کا۔

اب اور باتیں شروع کرتا ہوں...... پاکستان کو آپ کی فوجی امداد دینے کے فیصلے اور مشرق بعید کے دیگر مسائل پر بھارت اور آپ کے اختلافات پر پنڈت نہرو نے پچھلے دنوں جو زبردست نکتہ چینی کی تھی، سنا ہے اس کا یہ رد عمل ہوا ہے کہ آپ کے ملک کی حکمت عملی میں ایک نیا رجحان ترقی کر رہا ہے۔ بعض کی یہ بھی رائے ہے کہ امریکہ بھارت کو اپنے عزائم کے متعلق اطمینان دلانے کی ضرورت سے زیادہ کوشش کر رہا ہے۔

آپ کے جنوبی ایشیائی اور افریقی معاملات کے اعلیٰ افسر، کیا نام ہے ان کا؟...... ہاں مسٹر جان جونکینز نے اپنے ایک بیان میں بھارت کے لیے اپنے ملک کے خیر سگالی جذبات کی پیشکش

کی ہے اس کا تو یہ مطلب نکلتا ہے کہ واشنگٹن دلّی کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے تڑپ رہا ہے۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں پاکستان اور بھارت کو خوش رکھنے سے آپ کا واحد مقصد یہی ہے کہ جہاں کہیں بھی آزادی اور جمہوریت کا ٹمٹماتا دیا جل رہا ہے، اسے پھونک سے نہ بجھایا جائے بلکہ اس کو تیل دیا جائے۔

بلکہ تیل میں ڈبو دیا جائے تاکہ وہ پھر کبھی اپنی تشنہ لبی کا شکوہ نہ کرے...... ہے نا چچا جان؟

آپ پاکستان کو آزاد دیکھنا چاہتے ہیں اس لیے کہ آپ کو درۂ خیبر سے بے حد پیار ہے جہاں سے حملہ آور صدیوں سے ہم پر حملہ کرتے رہے ہیں۔ اصل میں درۂ خیبر ہے بھی بہت خوب صورت چیز، اس سے پیاری اور خوبصورت چیز پاکستان کے پاس اور ہے بھی کیا؟

اور بھارت کو آپ اس لیے آزاد دیکھنا چاہتے ہیں کہ پولینڈ، چیکوسلوویکیہ اور کوریا میں روس کی جارحانہ کارروائیاں دیکھ کر آپ کو ہر دم اس بات کا کھٹکا رہتا ہے کہ یہ سرخ مملکت کہیں بھارت میں بھی درانتیاں اور ہتھوڑے چلانا شروع نہ کر دے۔

ظاہر ہی کہ بھارت کی آزادی خدانخواستہ چھن گئی تو کتنا بڑا المیہ ہوگا...... اس کا تصور کرتے ہی آپ کانپ اٹھتے ہوں گے۔

آپ کی تاروں والی اونچی ٹوپی کی قسم، آپ ایسا مخلص انسان کبھی پیدا ہوا ہے اور نہ ہوگا ...... خدا آپ کی عمر دراز کرے اور آپ کی سات آزادیوں کو دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی دے۔

یہاں ایک علاقہ ہے مغربی پنجاب، اس کے وزیر اعلیٰ ہیں فیروز خان نون (ان کی بیگم ایک انگریز خاتون ہیں) آپ نے ان کا نام سنا ہوگا۔ حال ہی میں آپ نے اپنے دولت کدے پر (جو پنچولی فلم اسٹڈیو کے آگے ہے) ایک کانفرنس بلائی۔ اس میں آپ نے مسلم لیگ (جسے مشرقی پاکستان میں شکست فاش ہوئی ہے) کے کارکنوں کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے اپنے علاقوں میں اشتراکیوں (سرخوں) کے مقابلے کے لیے جدو جہد کریں۔

دیکھیے چچا جان آپ فیروز خان نون صاحب کا شکریہ ادا کیجیے اور خیر سگالی کے طور پر ان کی بیگم صاحب کے لیے ہالی وڈ کے سلے ہوئے دو تین ہزار فراک بھیج دیجیے...... کہیں آپ نے بھیج تو نہیں دیئے، میں بھول گیا تھا۔ کیونکہ اب وہ ساڑھی پہنتی ہیں۔



بہر حال نون صاحب کا اشتراک دشمن ہونا بڑی نیک فال ہے کیونکہ کامریڈ فیروز الدین منصور پھر جیل میں ہوگا۔ مجھے اس کا ہر وقت دمے کے مرض میں گرفتار رہنا ایک آنکھ نہیں بھاتا۔

اب میں آپ کو ایک بڑا اچھا مشورہ دیتا ہوں۔ ہماری حکومت نے حال ہی میں کامریڈ سبط حسن کو جیل سے رہا کیا ہے۔ آپ اس کو اغوا کر کے لے جایئے۔ میرا دوست ہے لیکن مجھے ڈر لگتا ہے کہ وہ اپنی پیاری پیاری نرم نرم باتوں سے ایک روز مجھے ضرور کمیونسٹ بنا لے گا...... یوں تو میں اتنا ڈرپوک نہیں۔ کمیونسٹ ہو بھی جاؤں تو میرا کیا بگڑ جائے گا، مگر آپ کی عزت پر حرف آنے کا خیال ہے۔ لوگ کیا کہیں گے کہ آپ کا بھتیجا ایسے بڑے دلدل میں جا دھنسا...... میری اس برخورداری پر ایک شاباش تو بھیجئے۔

اب میں احوال روزگار کی طرف آتا ہوں۔ چچا جان آپ کی ریش مبارک کی قسم۔ دن بہت برے گزر رہے ہیں، اتنے برے گزر رہے ہیں کہ اچھے دنوں کے لیے دعا مانگنا بھی بھول گیا ہوں۔ یہ سمجھیے کہ بدن پر لتے جھولنے کا زمانہ آ گیا ہے کپڑا اتنا مہنگا ہو گیا ہے۔ کہ جو غریب ہیں ان کو مرنے پر کفن بھی نہیں ملتا، جو زندہ ہیں وہ تار تار لباس میں نظر آتے ہیں۔ میں نے تو تنگ آ کر سوچا ہے کہ ایک ''ننگا کلب'' کھول دوں۔ لیکن سوچتا ہوں ننگے کھائیں گے کیا...... ایک دوسرے کا ننگ؟...... مگر وہ بھی اتنا کریہہ ہوگا کہ نگاہیں لقمہ اٹھاتے ہی وہیں رکھ دیں گے۔ کوئی ویرانی سی ویرانی ہے، کوئی ننگی سے ننگی ہے، کوئی ترشی سی ترشی ہے لیکن چچا جان داد دیجیے۔

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

لیکن چھوڑیئے اس قصے کو آپ خوش گلو، خوش اندام اور خوش خرام حسینوں کا وہ خیر سگالی وفد بھیج دیجیے۔ ہم اس غربت میں بھی اپنا جی ''پشوری'' کر لیں گے۔ فی الحال آپ الزبتھ ٹیلر کے ہونٹوں کا ایک پرنٹ بھیج دیجیے، خدا آپ کو خوش رکھے۔

آپ کا تابعدار بھتیجا

سعادت حسن منٹو

۳۱ لکشمی مینشنز ہال روڈ، لاہور۔

حسن منظر

# زمین کا نوحہ

پھر وہ وقت آیا کہ اعداد و شمار میں دل چسپی رکھنے والوں نے محسوس کرنا شروع کیا کہ اب اخباروں میں ضرورت رشتہ کے نام سے جو اشتہار چھپتے ہیں ان میں زیادہ تر بیوی کی مانگ ہوتی ہے، شوہروں کی مانگ پہلے کم ہوئی پھر گھٹتے گھٹتے یکسر غائب ہوگئی۔ اشتہاروں کا مضمون بھی بدلنے لگا۔ لوگوں کے مطالبات کم ہوتے جارہے تھے۔ پہلے اگر کسی کو کسی خاص علاقے، کسی خاص ذات، مذہب اور مذہب کی کسی خاص شاخ کی لڑکی سے شادی کرنے کی خواہش تھی تو اب وہ اس خاص علاقے سے باہر کی لڑکی سے شادی کرنے کو بھی تیار تھا۔ لیکن باقی شرائط بدستور تھیں، مثلاً لڑکی کا رومن کیتھولک، شیعہ یا برہمن ہونا ضروری تھا اور اگر وہ شادی کرکے کسی باہر کے ملک میں بھی جاتی تو رہتی کم از کم اپنے ہی کسی ہم وطن کے گھر میں۔

پھر لڑکا محض عیسائی، مسلمان یا ہندو لڑکی سے شادی کرنے پر آمادہ نظر آنے لگا اور اس پر مصر نہیں تھا کہ لڑکی میرو فائیٹ کرسچین، بوھری مسلمان یا چٹر جی برہمن ہی ہو۔

ایسا لگتا تھا لڑکے اور ان کے ماں باپ کم سے کم آنے والی بہو یا بیوی کے معاملے میں قناعت پسند ہوتی جارہے تھے۔ خواہ بجلی کے نئے نئے آلات خریدنے اور سامان آسائش جمع کرنے کے معاملے میں ان کی حرص پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گئی تھی۔ ایک نئی تبدیلی جو ان اشتہاروں کے مضامین میں پیدا ہوئی وہ خاصی حوصلہ افزا تھی یعنی یہ کہ اب لڑکی کا خوبصورت یا گورا ہونا لازمی نہیں رہا تھا۔ بعد میں اس کا محض لڑکی ہونا ہی کافی رہ گیا۔ لڑکی کی عمر کا ذکر پہلے اشتہار کی پہلی ہی سطر میں ہوتا تھا، بعد میں آخر میں ہونے لگا اور پھر حذف کیا جانے لگا۔ اب نہ کسی کو صوم وصلوٰۃ کی پابند، خوبصورت، چھریرے جسم، گندمی رنگت، کنواری اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکی



کی ضرورت تھی، نہ ہی اس کا بیس اور پچیس کے درمیان ہونا ضروری تھا۔ یہ سب مطالبات فرسودہ ہوتے جارہے تھے۔

لیکن اعداد وشمار میں دلچسپی رکھنے والے حضرات اس وقت چونک پڑے جب ایک ملیالی اخبار میں ڈچ اور جرمن شادی کی خواہشمند لڑکوں کے نام پڑھنے میں آئے اور اردو کے اخباروں میں ٹرینیڈاڈ اور امریکہ میں بسنے والے لڑکوں نے بیوی کی ضرورت کے اشتہارات چھپوانے شروع کردیے۔ کچھ عالمی پیمانے پر کام کرنے والی شادی کرانے کی ایجنسیاں معرض وجود میں آنے لگیں اور لوگ سمجھے شاید ان کا تعلق عالمی ادارۂ صحت یا اقوام متحدہ کے ادارۂ نشر و اشاعت سے ہے۔ اور یہ ادارے ممکن ہے اقوام عالم کو ایک نسلی برادری میں گوندھنے کی کوشش کررہے ہوں۔

کیونکہ اب انگریزی اور فرانسیسی اخباروں میں ریڈ انڈین اور نیگرو مردوں کے لیے بیویاں چاہییے ہیں کے گروپ اشتہارات چھپ رہے تھے اور اردو ہندی کے اخباروں میں بھی ہر ملک کے شادی کرنے کے خواہشمند مردوں کی فہرستیں چھپنے لگی تھیں۔ ایسا لگتا تھا دنیا بھر میں عورتوں کا قحط پڑ گیا ہے۔

ان اشتہاروں میں جن مطالبات نے سب سے آخر میں دم توڑا وہ مذہب اور نسل کی قید کے تھے۔ یہ مطالبات سب سے زیادہ سخت جان تھے لیکن بالآخر انسان اب ان سے بھی دست بردار ہونے پر آمادہ نظر آرہا تھا۔ مثلاً کسی کے ہریجن ہونے پر اب کسی کو اعتراض نہیں رہا تھا اور بعض اخباروں میں اس قسم کے اشتہارات بھی دیکھنے میں آئے:

"ایک سفید جنوبی افریقہ کا باشندہ، عمر تقریباً ۴۵ سال، پیدائشی لحاظ سے ڈچ ریفارمڈ چرچ سے تعلق رکھنے والا، مالی اعتبار سے آسودہ، شادی کا خواہشمند ہے۔
لڑکی کا کسی نسل یا مذہب سے ہونا ضروری نہیں ہے۔"

یہ ان دنوں کی بات ہے جب عورتیں اخباروں میں چھ چھ اور آٹھ آٹھ نوزائیدہ بچوں کو صاف ستھرے سفید ڈائپرز یا پوتڑوں میں لپٹا ہوا دیکھنے کی عادی ہوگئی تھیں، جو سب ایک ہی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے اور اخبار میں ایک قطار میں لیٹے ہوئے دکھائے جاتے تھے۔

بعض اخباروں میں ان کی ماں کی تصویر بھی ہوتی تھی جو ایسا لگتا تھا، فوٹو گرافر کے ''ذرا ہنسئے تو'' پر کمزور سی ہنسی ہنس رہی ہے۔ بعض عورتوں کو ایسی ماں بسورتی ہوئی لگتی تھی۔ اور کچھ جو ذرا منہ پھٹ ہوتی تھیں بے ساختہ کہہ اٹھتی تھیں ''عورت ہے یا کتیا۔ پوری دس بیاہی ہے۔'' ایسے موقع پر ان میں سے کسی کا لڑکا اپنی ماں سے پوچھ بیٹھتا ''امی کتنے بچے دیئے ہیں اس عورت نے؟'' اور ماں کے نو یا دس کہنے پر تعجب سے کہتا تھا، ''اچھا اپنی ڈوگی سے بھی زیادہ!''

اب کالم نگاروں کی جگہ اخباروں میں سائنسدانوں نے لے لی تھی اور کالم نگاروں کا کام ان کی تحریر کی نوک پلک سنوارنا اور اسے عام فہم بنانا رہ گیا تھا۔ ہر طرف جینیٹکس کا زور تھا۔ جین اور کروموسومز کے الفاظ اب گاؤں والوں کے لیے بھی نئے نہیں رہے تھے اور اکثر ایکس وائی (X-Y) اور ایکس ایکس (X-X) کے بارے میں بھی پوچھ بیٹھتے تھے کہ ہوتے ہیں۔ ہر شخص جاننا چاہتا تھا، لڑکیاں دنیا میں کیوں کم ہوتی جارہی ہیں اور جس کے گھر اب قدرتی طور سے یا فرٹی لٹی پلز لینے کے بعد بچہ ہوتا ہے وہ لڑکا ہی کیوں ہوتا ہے یا یہ کہ عورتوں کی کوکھ سے بچوں کی ایک پوری جھول ایک ہی دفعہ میں کیسے جنم لی لیتی ہے جو Viable نہیں ہوتی ہے۔ اور یہ نیا لفظ بھی اب ہر شخص کے لیے پرانا ہوگیا تھا۔ وہ جانتے تھے اس پوری جھول کے لیے ایک گروپ قبر کی ضرورت ہوتی۔ اور اسے بغیر رسومات کے دفنا دیا جائے گا کیونکہ ان میں سے اکثر نے پیدا ہونے کے بعد نہ بیاں کیا تھا نہ ہوآں اور نہ ہی ہاتھ پیر ہلائے تھے۔ ایسے بچے بلی یا خرگوش کے بچوں کی طرح گلابی، بالوں سے عاری، آنکھیں بند کئے ہوئے گل گلاتے ہوئے نظر آتے تھے۔ ان میں انسان کے بچوں جیسی کوئی بات نہیں ہوتی تھی۔

جینیٹکس کے ماہر چلا رہے تھے کہ کسی وجہ سے جس کا تعین فی الوقت نہیں کیا جاسکتا تھا عورتیں اس قابل ہی نہیں رہی ہیں کہ ان کے ہاں لڑکی پیدا ہو اور اس کی تصدیق اُن والنٹیر عورتوں کے کروموسومز کا مطالعہ کر کے ہو چکی تھی جنھوں نے اپنے آپ کو تجربات کے لیے پیش کیا تھا۔

انہیں دنوں ایک پارٹی میں جہاں بچوں کے ماہر معالج بھی موجود تھے اس بات پر بحث ہو رہی تھی کہ آج کل ہر ماں یہ شکایت کرتی ہوئی کیوں نظر آتی ہے کہ اس کا بچہ کھاتا نہیں ہے۔



ہر ماں کو بچے کی خوشامد کرنی پڑتی ہے، لالچ دینی پڑتی ہے، تب وہ منہ بنا کر ایک آدھ لقمہ لیتا ہے۔ ماں پلیٹ لیے اس کے آگے پیچھے پھرتی ہے اور بچے کے نہ کرتے رہنے پر روہانسو ہر کر بیٹھ جاتی ہے کہ بچہ کیسے بڑا ہوگا۔ جن آراء پر لوگ سنجیدگی سے غور کررہے تھے وہ یہ تھیں کہ مائیں گھر سے باہر رہتی ہیں اور اپنے اس احساس جرم کو کم کرنے کے لیے بچے کو زبردستی کھلا کر گویا اس کا کفارہ ادا کرتی ہیں۔

ایک صاحب نے کہا'' ممکن ہے وہ اُس کمی کو پورا کرتی ہوں جو بچپن میں ان کا مقدر رہی ہو۔''

ان کی بات کو بھی بھرکم جانا گیا۔ لیکن جب ایک آدمی نے بڑی معصومیت سے کہا'' عجیب بات ہے، ہمارے بچپن میں ہر بچہ ہر وقت کھانے کی الماری اور گنجینے کو کھکھوڑنے اور چھینکے تک کسی طرح پہنچ جانے کی تاک میں رہتا تھا اور اس بات پر ڈانٹا جاتا تھا کہ کیا ہر وقت پیٹ کو اناڑی کی بندوق کی طرح بھرے جاتا ہے۔ اور آج کل......''

تو کسی نے مداخلت کرتے ہوئے کہا'' آپ کے خیال میں سب تبدیلی بدلے ہوئے زمانے کی لائی ہوئی ہے۔''

اس آدمی نے کہنا چاہا'' میرا مطلب ہے پچھلے زمانے میں......''

مداخلت کرنے والے نے تلخی سے کہا'' آپ کا مطلب ہے پچھلا زمانہ ہی اچھا زمانہ تھا جب بچے بن کہے کھاتے تھے اور اب کھلانے پر بھی نہیں کھاتے۔''

اس آدمی نے سنجیدگی سے لیکن جھینپتے ہوئے کہا'' معاف کیجئے میرا تعلق سائنس سے نہیں ہے اس لیے مجھے عام الفاظ کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے آج کل کے بچوں نے اس وجہ سے کھانا چھوڑ رکھا ہے کہ یہ آئے دن جو ایٹمی تجربے ہو رہے ہیں، تابکار ذرات کا گرنا، راکٹس کا چھوڑا جانا، نیوکلیئر آلات کا سمندروں اور پہاڑوں میں کھویا جانا، یورینیم کا کچرہ، کیڑے مار دوائیں جو فصلوں پر چھڑکی جاتی ہیں، فوڈ پریزرویٹوز (کھانے کو محفوظ رکھنے والے کیمیکلز) مونوسوڈیم گلوٹامیٹ وغیرہ۔ ہوا میں، پانی میں......''

پارٹی میں شریک حضرات ایک دم خاموش ہوگئے اور خاموشی سے کونیاک اور وسکی

پینے لگے۔

اعتراض کرنے والے کا رخ ابھی تک اس سیدھے سادھی آدمی کی طرف تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ کیونکر اس سے اپنا پیچھا چھڑائے۔ چنانچہ وہ پیالے کو اپنی ناک کے پاس لے جا کر اسے سونگھنے لگا۔

سیدھے سادے آدمی نے اپنا گلاس خالی کیا اور پاس سے گزرتے ہوئے ویٹر کی ٹرے پر اسے رکھ کر اس نے سر جھکا کر ان لوگوں سے کہا "You will excuse me" اور خاموشی سے ایک اور گروپ کی طرف چلا گیا۔

اس کے بعد وہ زمانہ آیا پہلے جہاں جہاں سمندر کے کنارے اور بازاروں میں خوش رنگ ساڑھیاں، اسکرٹس اور سارونگ اور کبایا پہنے ہوئے لڑکیاں لڑکوں کے ساتھ گھومتی نظر آتی تھیں اور کم عمر عورتیں شام کو بچوں کے پریمز لیے ہوا خوری کے لیے نکل آتی تھیں اب وہاں صرف ادھیڑ عمر کی عورتیں اور بوڑھیاں نظر آنے لگیں۔ جن کے کپڑے عمر کی لحاظ سے پھیکے رنگوں والے اور ڈھیلے ڈھالے ہوتے تھے۔ ڈھیلے ڈھالے اس لیے کہ وہ عمر کے اس دور سے گزر چکی تھیں جب جسم ظاہر کرنے کی چیز ہوتا ہے۔

وہ تھوڑی دور چل کر تھک کر بینچ پر بیٹھ جاتی تھیں اور نوجوان ان کے پاس سے بے تعلقی سے گزر جاتے تھے اور اکثر چھٹی کا دن مچھلی پکڑنے میں گذارتے تھے۔ مچھلی پکڑنا اب ایک آرٹ کی حیثیت اختیار کر گیا تھا کیونکہ مچھلیاں سمندروں میں نایاب اور دریاؤں اور جھیلوں میں کم یاب ہو گئی تھیں۔ فیکٹریوں سے نکلنے والا زہریلا پانی اور سمندر میں ڈوبنے والے بڑے بڑے تیل بردار جہازوں کا تیل ان کی نسلوں کا خاتمہ کر چکے تھے۔ پرندے، جانور اور پانی میں بسنے والے بہر حال انسان کی طرح سخت جان نہیں ہوتے ہیں کہ ان نئی آفات کا مقابلہ کر پاتے۔

ہر زبان میں پہلے کافی عرصہ تک عشقیہ شاعری نے ایک بار پھر زور پکڑا اس کے بعد شاعروں نے زیادہ گنجلک موضوع اپنانے کی کوشش کی اور پھر قلم رکھ کر بیٹھ گئے۔ رسالوں میں کہانیوں کی تعداد کم ہوتی جا رہی تھی اور فلمیں بھی کم بن رہی تھیں۔ پرانے لکھنے والے اس کے



عادی تھے کہ کسی مہم پر جانے والے کی ساتھی ایک لڑکی ہو لیکن لڑکی اب ناپید تھی تو کہانی کے لیے کہاں سے آتی!

ٹارزن کے لیے بھی کسی لڑکی کا کسی گوریلے کی گرفت میں ہونا ضروری تھا۔ لیکن جب انسانوں ہی کے لیے لڑکیاں ناکافی تھیں تو گوریلوں کے لیے کہاں سے آتیں! کہانیوں میں کس کو جیتنے کے لیے جدو جہد پیدا کی جاتی اور کون عورت کسی ڈاکو کی محبوبہ بن کر اس کے ساتھ پولیس سے لڑتی ہوئی ہلاک ہوتی! یہ سب باتیں پرانی ہو گئی تھیں اور نئی نسل جو اب اتنی نئی نہیں رہی تھی اکتاہٹ سے ان پرانی فلموں کو دیکھتی تھی۔

سنیما ہالوں میں جب مرد اور عورت کے درمیان پیدا ہونے والے شدید جذبات کا کوئی سین آتا تھا تو یہ نئی نسل والے زور زور سے جمائیاں لیتے تھے۔ یہاں تک کہ اکثر سنیما ہال بند ہو گئے اور ان میں حکومتیں جنگی اسلحہ رکھنے لگیں۔ فلم اسٹوڈیوز سے ٹینک گیراجوں کا کام لیا جانے لگا۔ پرانی نسل والے، نوجوان کے اس رجحان سے خائف سے تھے "مان لیجئے کل پھر سے لڑکیاں پیدا ہونے لگیں تو یہ لوگ ان کی طرف مائل بھی ہونگے یا نہیں؟" اور اس کا قوی امکان تھا کہ لڑکیاں دوبارہ پیدا ہوں گی۔ کیونکہ ہر بڑے تحقیقی سینٹر میں اس عالمی مرض کی وجوہات کا جائزہ لیا جا رہا تھا۔ جاپان، چین، امریکا، روس، برطانیہ، فرانس، سوئیٹزرلینڈ اور جرمنی قسم کے ممالک آئے دن اس قسم کا اعلان کرتے رہتے تھے کہ ایک نئی دوا جو اس وقت جانوروں پر ٹیسٹ کی جا رہی ہے اس کے اثرات حوصلہ افزا ہیں۔ مثلاً ارجنٹینا میں ایک گائے اب دھڑا دھڑ محض بچھیاں ہی پیدا کئے جا رہی تھی اور وہ بھی ہر تیسرے مہینے۔ بعض ملکوں سے بیک وقت دو قسم کے مژدے سننے میں آئے تھے:

ایک مہارشی یا مجذوب کی دی ہوئی مٹی پھانکنے سے ایک عورت کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی ہے جسے ۱۲ برس تک ہر قسم کے گرہن سے بچنا ہوگا حتیٰ کہ منش کے نظر گرہن سے بھی اور فلاں سینٹر میں ایک نئی دوا دریافت ہوئی ہے جس کے استعمال سے چوہوں کی دوسری نسل میں نر اور مادہ کا تناسب ایک اور دو کا ہے اور تیسری نسل میں ۱/۱ور ۳/۱ کا اور دسویں نسل تک پہنچتے پہنچتے پھر چوہیا صرف چوہیا پیدا کر رہی ہے۔ ایک بار پھر اخباروں کے کالموں میں سائنسدانوں کا زور

بڑھ گیا تھا۔ یہ ٹھیک تھا۔ اصلی دوا ابھی دریافت کی جانی باقی تھی لیکن یہ کتنی بڑی بات تھی کہ ایک نئی پروڈکٹ (جے ۷۳۱۴) J 7314 کو کتیوں کو ایسٹرس سائیکل کے پہلے ہفتے میں دیئے سے انسان ان سے محض کتے پیدا کروا سکتا تھا اور اگر یہی پروڈکٹ سائیکل کے آخری ہفتے میں دی جاتی یعنی جانوروں کے حیض سے پہلے تو نئی نسل میں کتیاں ہی کتیاں ہوتیں۔ مگر اس نئی دریافت کے بارے میں کہا جا رہا تھا کہ اس سے خود کتیا کے تھنوں میں کینسر کے اثرات رونما ہونے لگے تھے اور فی الحال اسے عورت پر آزمانا درست نا تھا۔

پرانے لوگ اکتائے اکتائے سے لگتے تھے جیسے وہ ان تمام خبروں سے بیزار ہو چکے ہوں اور انہیں دنیا ختم ہوتی نظر آ رہی ہو۔ ان میں سے اکثر رات کو سوتے میں چلانے لگتے تھے اور پوچھنے پر بتاتے تھے، پہاڑ اڑتے پھر رہے ہیں، یا یہ کہ دنیا کے گلوب میں آر پار ایک بہت بڑا چھید ہو گیا ہے جس میں سے ہو کر گنگا، جمنا کا پانی مسوری، مسس پسی میں گر رہا ہے اور مسوری، مسس پسی کا گنگا جمنا میں۔

دوسری نسل والے فرد ابھی تک شادی کے خواہشمند تھے اخباری رپورٹ کو دلچسپی سے پڑھتے تھے اور بے وجہ ایک دوسرے سے جھگڑتے تھے۔ ان میں سے اکثر دن میں چرس کے سگریٹ پھونکتے تھے اور رات کو افیون کے ڈوڈے چائے کی پتیوں کے ساتھ ابال کر پیتے تھے۔ اب اکثر جگہ جگہ کھلے عام افیون کے خوبصورت کھیت نظر آتے تھے اور ان پر کسی کو اعتراض نہیں تھا۔

لیکن تیسری نسل ان دو نسلوں سے مختلف تھی۔ ان میں سے اکثر نے کسی عورت کو شاذ و نادر ہی دیکھا تھا اور اگر دیکھا بھی تھا تو ایسی کو جس کا منہ پوپلا تھا یا مصنوعی دانتوں سے مرصع اور آنکھیں گول شیشوں کے پیچھے سے بے جان سی نظر آتی تھیں۔ ایسی عورت کو دیکھ کر بھلا کون شاعری کرتا!

اپنی بے رحمی میں ان میں سے کوئی کوئی کہہ اٹھتا تھا'' یہ بڑی بی! ان کو دیکھ کر کبھی لاکھوں کے دل دھڑک اٹھتے تھے! یقین نہیں آتا''۔

ایسے ہی ایک موقعہ پر ایک بوڑھے نے کہا تھا'' ہم جب تمہاری عمر کے تھے اور ہمارے ماں باپ اپنے ان ملکوں کی خوبصورتی کا ذکر کرتے تھے جہاں سے وہ ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے تھے، وہاں کے دریاؤں کا، گھاس سے ڈھکی ہوئی پہاڑیوں کا اور جنگلوں کا اور ان میں بسنے والے جانوروں کا تو ہم بھی ہنستے تھے۔ کیونکہ ہمیں بھی یقین نہیں آتا تھا۔''



لڑکے کلاسیکی ادب سے بیزار تھے جسے اب لائبریریوں میں دیمک چاٹ رہی تھی اور پرانی فلمیں ڈبوں میں بند پڑے پڑے چپک کر ڈھما بن چکی تھیں۔ اس نسل کے ذہن میں عورتوں کا بچنا نہ بچنا کوئی معنی نہیں رکھتا تھا کیونکہ وہ صرف لڑکوں میں کھیل کر بڑے ہوئے تھے اور بہن نام کی کسی رفیق کو نہیں جانتے تھے۔

تحقیقی کام کی رفتار کا تعلق عورتوں کے صفحہ ہستی سے معدوم ہونے کی رفتار کے تابع تھا۔ جوں جوں عورتیں اور بالخصوص وہ عورتیں جن سے ابھی بچے پیدا کیے جانے کی توقع کی جا سکتی تھی کم ہوتی جا رہی تھیں، تیوں تیوں حکومتیں اپنے خزانوں کا دھارا بجائے خلا اور سیاروں کو تسخیر کرنے والے اداروں کے، ''انسان کو بچاؤ'' فنڈ کسی طرف موڑنے پر مجبور ہوتی جا رہی تھیں۔ سائنسدان دن اور رات تابکاری، کروموسومز اور جینیٹکس (Genetics) پر اخباروں میں لکھ رہے تھے اور ایک دوسرے پر کیچڑ بھی اچھال رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر فلاں تجربہ بیس سال پہلے فلاں ملک میں نہ کیا گیا ہوتا تو آج یہ صورت حال پیدا نہیں ہوتی۔ جس ملک میں بیس سال پہلے وہ تجربہ کیا گیا تھا وہاں کے سائنسدان اور سیاستدان اول الذکر ملک پر الزام دھرتے تھے کہ اس جانب پہلا قدم پچاس سال پہلے خود انہوں نے اٹھایا تھا۔ ایسے کالم نگار جن کا کالم ہر ملک میں چھپتا تھا، میانہ روی سے کام لے رہے تھے اور ان کی رائے میں یہ کہنا زیادہ مناسب تھا کہ ہمیں ابھی یہی نہیں معلوم ہو سکا ہے کہ عورتیں ایک خاص قسم کے بانجھ پنے کی کیوں شکار ہو گئی ہیں اس لیے جب تک کہ وجہ یا وجوہات کی صحیح نشاندہی نہ ہو سکے ہر قسم کی رائے قبل از وقت تھی اور علاج تھوڑا دور۔

ایک ادیب نے جسے قلم سے دست بردار ہوئے تقریباً نصف صدی ہو چکی تھی جب اپنی پرانی ڈائریاں پڑھنی شروع کیں تو اُسے ایک جگہ اپنا یہ عجیب خواب پوری تفصیل سے لکھا ہوا نظر آیا:

''آج سخت گرمی تھی، میں کھانے کے بعد دوپہر کو اخبار پڑھ رہا تھا کہ پڑھتے پڑھتے مجھے نیند آ گئی، مجھے دور سے ایک جزیرہ نظر آ رہا تھا جس پر ناریل کے درختوں کے جھنڈ تھا۔ اس کے پیچھے کا آسمان صاف وشفاف تھا، جیسے سفید چادر کو دھوبی نے زیادہ نیل دے دیا ہو۔ خود میں جزیرے سے دور تھا اور کسی ماہی گیر کی کشتی میں تھا۔

ہوا ہلکی تھی اور جیسے مجھے خود بخود پتہ چل گیا تھا کہ ہم بحرالکاہل میں ہیں۔ میرے ساتھی جو جاپانی بھی ہوسکتے تھے اور فلپینوں بھی کشتی کے دوسرے سرے پر کھڑے مچھلیاں پکڑنے میں مصروف تھے۔ میں اس جزیرے کو دیکھ رہا تھا۔ کسی نے جیسے ہوا میں سے مجھ سے کہا وہ بکنی ایٹول ہے اور تب ہی وہاں سے، ناریلوں کے جھنڈ میں سے، ایک دھوئیں کا ستون ابھرا جس نے جزیرے کو چھپا لیا۔ ہمارے اوپر راکھ گر رہی تھی جیسے پومپیائی پر کبھی گری ہوگی۔ میرے ساتھی پانی میں کود پڑے حالانکہ وہاں شارکس بھی تھیں۔ میں ڈوبتی ہوئی کشتی میں جسے موجیں جھنجھوڑ رہی تھیں تختے کے نیچے چھپنے لگا اور جب میں جاگا تو مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا تھوڑی سی راکھ میری ایک ران پر بھی گری ہے اور جیسے وہاں جلن پڑ رہی ہے''۔

ادیب کو تعجب تھا اتنے اچھے خواب کی نیوز ویلیو کو وہ اس زمانے میں کیسے نظر انداز کر گیا تھا۔

اس نے اپنا یہی خواب ایک رسالے کو اس خط کے ساتھ چھپنے کے لیے بھیجا کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ موجودہ صورت حال ان سالہا سال کے تجربات کا نتیجہ ہے جو ان جزیروں اور ریگستانوں میں کیے جاتے رہے ہیں جہاں کے بسنے والوں کو اکثر ان کا علم بھی نہیں ہوا ہے۔

وہ چھ ماہ تک اس خط کے چھپنے کا انتظار ہر ہفتہ کرتا رہا اور آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ غالباً اس خواب کی وہی نیوز ویلیو صحیح تھی جو آج سے پچاس سال پہلے اس نے لگائی تھی۔

اور پھر بالآخر وہ وقت آ گیا جب ایک دم لوگوں کو احساس ہونے لگا کہ عورتیں دنیا سے غائب ہوچکی ہیں۔ ہر گاؤں، ہر قریہ یہ بتا سکتا تھا کہ اس میں رہنے والی آخری عورت کب اور کہاں مری تھی اور اب وہ کہاں دفن ہے۔ حتیٰ کہ ایک کروڑ سے زیادہ آبادی کے شہر والے بھی اپنی شہر میں مرنے والی آخری پانچ یا دس عورتوں کے نام گنا سکتے تھے۔ مثلاً شیلا اس سے پہلے



جودھا اس سے پہلے سکینہ۔ اس سے پہلے...... اور یہ لسٹ ہر کس وناکس سے معلوم کی جاسکتی تھی۔ لیکن ان ناموں کا جاننا اب اتنا ہی کارآمد یا بے سود تھا جتنا کسی دنیا سے معدوم ہو جانے والے پرندے کا۔ مثلاً ڈوڈو کا جو سترھویں صدی تک ماریشس میں پایا جاتا تھا اور اب اس میں کسے دلچسپی تھی کہ آخری ڈوڈو کی ہڈیاں کہاں کی مٹی میں دبی ہوئی تھیں۔

انسان کو بچاؤ سینٹر کی طرف سے ہونے والے اس اعلان نے کہ ''دوا'' دریافت کر لی گئی ہے، باقی ماندہ عورتوں کی تلاش کی مہم کو تیز کر دیا اور جب لوگوں کو یہ پتہ چلا کہ اس دوا کے کھانے کے بعد جس عورت کے بھی بچے ہونگے قدرتی انداز سے ہوں گے کوئی نر کوئی مادہ تو موت کے خوف نے ان کی اس مہم پر مہمیز کا کام کیا کیونکہ کوئی بے نام ونشان نہیں مرنا چاہتا تھا اور وہ بھی اس طرح کہ شہر کے شہر کھڑے رہ جائیں اور ان میں بسنے والا کوئی نہ ہو۔ لوگ پارٹیوں میں اور انفرادی طور پر عورت کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے۔ دن بھر ہوائی جہاز کھیتوں پر منڈلاتے تھے کہ شاید کپاس بیننے والوں اور سر پر جنگل سے لکڑیاں لاد کر لانے والوں ہی میں کوئی عورت ہو۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن، اخبار اور دیواروں پر چسپاں کیے جانے والے اشتہارات میں صرف ایک بات کا تذکرہ تھا ''آخری عورتیں یا عورت کہاں ہے؟ دوا دریافت ہوچکی ہے''۔ لیکن جیسے جیسے دن بیتے جا رہے تھے اور لوگ جزیروں اور نخلستانوں سے منہ لٹکائے ہوئے واپس لوٹ رہے تھے۔ ''انسان کو بچاؤ'' والے عالمی ادارے کے کارکنوں کے ہاتھ پاؤں پھولنے کی رفتار بڑھتی جارہی تھی۔

پھر ایک دن انہیں ایک خط موصول ہوا جو کسی نے کسی دور افتادہ پہاڑی گاؤں سے ادارے کو بھیجا تھا۔ اس میں کہا گیا تھا:

''یہاں کے ایک گاؤں میں ایک عورت میں نے کئی بار ایک پہاڑی کی طرف جاتے دیکھی ہے۔ اس کا شوہر اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ پہلے وہ اسکول ماسٹر تھا اب بھیڑیں پالنے لگا ہے اور زیادہ وقت اپنی بیوی کی دیکھ بھال میں گزارتا ہے کیونکہ عرصہ ہوا اس کے دو جوان لڑکے ایکا ایکی خون کے خراب ہوجانے سے چل بسے تھے۔ مجھے معلوم ہے وہ عورت کہاں رہتی ہے''۔

اگلی صبح اس پہاڑی پر جس کی چوٹی پر ایک جھیل تھی جس میں ایک طرف سے گلیشیئر گرتے تھے اور دوسری طرف ایک بہت بڑا میدان تھا کئی ہیلی کوپٹر ایک ساتھ اترے ان کی پنکھوں کی آواز سن کر بھیڑیں بھاگ کھڑی ہوئیں اور کسی آدمی نے ایک غار میں سے منہ نکال کر آنے والوں کو دیکھا۔

ہیلی کوپٹر سے اتر کر لوگ میدان پار کرتے ہوئے اس غار کی طرف بڑھے۔ گھاس میں چھپے ہوئے کاسنی رنگ کے چھوٹے چھوٹے پھول جنھوں نے نئی دھوپ میں نہانے کے لیے بمشکل اپنے سر صبح کی ہوا میں اٹھائے تھے ان کے بوٹوں تلے مسلے جانے لگے۔

غار کے پاس پہنچ کر انہوں نے مختلف زبانوں میں اس آدمی کو پکارا اور تالی بجا کر اسے مخاطب کرنا چاہا۔ لیکن اندر مکمل خاموشی رہی۔

جب ان میں سے ایک آدمی نے کھال کے پردے کو اٹھا کر اندر جھانکنا چاہا تو اندر چھپے ہوئے آدمی نے غصے سے کہا ''کیا بات ہے؟''

''ہم عالمی ادارۂ انسان کو بچاؤ کی طرف سے یہاں آئے ہیں''۔

اندر والے نے پہلے سے بھی زیادہ غضبناک آواز سے پوچھا۔

''کس لیے؟''

''تم نے اعلان سنا ہے...... آخری عورت کا...... تمہارے پاس ریڈیو ہے؟''

تھوڑی دیر بعد اس آدمی نے جواب دیا ''ہاں میرے پاس ریڈیو ہے...... اور میں عرصے سے اعلان بھی سن رہا ہوں''۔

''ہم دوا لے کر آئے ہیں'' ترجمہ کرنے والے نے کہا ''تمہاری بیوی کے لیے۔''

''ہمیں کوئی دوا نہیں چاہیے'' اس نے غصے سے کہا۔

باہر کھڑے ہوئے لوگ اس کی خوشامد کرنے لگے۔ اگر وہ انسان کی بقا کی خاطر انہیں صرف ایک مرتبہ یہ نئی دوا جو وہ اپنے ہمراہ لے کر آئے تھے اپنی بیوی پر آزما لینے دے! وہ سب کی آخری امید تھی۔

وہ پردہ اٹھا کر باہر نکل آیا اور ان کے سامنے ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ اندر چھپی ہوئی عورت



غار کے منہ کے پاس ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔ وہ زندگی کی شام کو پہنچ رہی تھی۔ دونوں نڈر نظر آتے تھے۔

آخر کار اس نے اپنی بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے ان سے ترش لہجے میں کہا ''بالکل نہیں، میرے لیے میری زندگی سب سے زیادہ اہم ہے''۔

''بنی نوع انسان کی نہیں؟''

اس نے آنکھیں چندھیا کر کہا ''آپ کو کب سے بنی نوع انسان کی فکر لاحق ہوگئی ہے؟ آپ نے کب میری دنیا کی پرواہ کی تھی جسے میں چاہتا تھا آپ اسی کے حال پر چھوڑ دیں، ہر طرح کی گندگی سے پاک۔ لیکن آپ نے اسے دھویں، تابکاری، تابکار راکھ اور اپنے تجربات سے تباہ کر کے رکھ دیا۔ میرا اسکول، میرا گاؤں، میرے دونوں لڑکے سب کہاں ہیں؟ سب آپ کی نذر ہوگئے۔ جتنے کی آپ کو ضرورت نہیں تھی اس سے زیادہ کی آپ کو ہوس تھی۔ اپنے سمندروں اور پہاڑوں تک کو نہیں چھوڑا۔ ان میں دشمنی کی حرکات کو سونگھ لینے والے ایٹمی آلات نصب کیے۔ کیوں میں اپنی بیوی یا خود کو انسان کی بقا کے لیے استعمال ہونے دوں۔ اور یوں بھی دیکھا جائے تو انسان کی بقا کی آپ کو کب فکر رہی ہے''۔

باہر سے آنے والے برابر اپنی حکومتوں سے وائرلیس پر صلاح مشورہ لے رہے تھے اور لمحے لمحے کی خبر بھی دے رہے تھے۔ انہیں پتہ چلا کہ ماسٹر کی بیوی بیمار ہے اور وہ خوشی سے اچھل پڑے کیوں کہ اس کی بیماری کا علاج ان کے پاس تھا۔ لیکن ماسٹر نے وہ دوا لینے سے بھی انکار کر دیا۔

دن گزرا۔

آنے والے پہاڑی پر رات بسر کرنے کا اہتمام کرنے لگے۔ گاہے گاہے ان کے پاس عجیب وغریب قسم کے پیغامات آتے تھے۔ مثلاً، جو خلا نورد کسی دوسرے سیارے پر بھیجے جا رہے تھے انہوں نے روانہ ہونے سے پہلے پوچھا۔

''عورت راضی ہوئی؟''

مواصلاتی سیارے کے ذریعے جو کرکٹ کمنٹری ہو رہی تھی اور جسے کچھ لوگ خاصے

انہماک سے سن رہے تھے ایک دم رک گئی اور کسی نے مائیک کے پاس منہ لا کر کمنٹری کرنے والے سے کہا ''شٹ اپ، مجھے بات کرنے دو...... عورت راضی ہوئی؟'' اور یہ بتائے جانے پر کہ نہیں، اس نے تھینک یو کر کے مائیک دوبارہ کمنٹری کرنے والے کے حوالے کر دیا۔

چند روز میں پہاڑی پر مختلف ممالک کے لوگوں کی ایک اچھی خاصی آبادی ہو گئی۔ جس کا کام باقی دنیا کو محض اس عورت کا حال بتانا اور اس کے شوہر کے فیصلے سے آگاہ کرنا تھا۔ عورت کی حالت تیزی سے بگڑ رہی تھی اور وہ اور اس کا شوہر غار چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھے۔

باہر مختلف ممالک کے نمائندوں میں بحث چھڑ جاتی تھی کہ اس تباہی کا ذمہ دار کون تھا۔ جینیٹکس کے تجربوں کا آغاز کس نے کیا تھا۔

ایک چھوٹے ملک کے نمائندے نے فخر سے کہا ''خدا کا شکر ہے پہل ہم نے نہیں کی تھی۔ ہم مشرقی ممالک کے لوگوں میں ابھی تک روحانی قدریں باقی ہیں''۔

ایک عظیم طاقت کے نمائندے نے دانت کچکچا کر اس کی طرف دیکھا اور کہا ''کسے بہلا رہے ہو۔ دوسرے کو یا خود کو۔ تم ہمیشہ اپنے پڑوسی ملک کو برباد کرنا چاہتے تھے جو تمہارا ہی جتنا روحانی اقدار کا مالک اور تمہارا ہی جتنا مشرقی تھا''۔

ایک سیاہ فام نمائندے نے کہا ''ہم نے کبھی یہ نہیں چاہا تھا۔ ہم ہمیشہ اپنے دشمن کو تیر کمان اور بھالوں سے ختم کر سکتے تھے''۔

''تم نے کبھی یہ نہیں چاہا تھا؟ تم وہ چھوٹے چھوٹے فتنے تھے جو ہمیشہ ہم سے کہتے تھے جاگو ورنہ دوسری عظیم طاقت پوری دنیا کو ہڑپ کر جائے گی۔ تم اسلحہ کی بھیک مانگنے کسی دروازے پر نہیں گئے ہو۔ تم اور تمہاری روحانی اقدار اور مشرقیت! یہ اقدار تھیں یا جھوٹے اعتقادات؟''

جب وہ لوگ آپس میں لڑ رہے تھے اسکول ماسٹر غار سے باہر نکلا اور کھال کا پردہ کھینچ کر اسے غار کے منہ پر سے ہٹا دیا۔ عورت غار کے اندر کھالوں کے ڈھیر پر لیٹی ہوئی تھی۔ ماسٹر دوبارہ اندر گیا اور جب وہ باہر آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک پھاوڑا تھا۔ غار سے تھوڑے فاصلے پر وہ زمین کھودنے لگا۔

مواصلاتی سیارے کے ذریعے کسی نے خلائی تجرباتی سینٹر سے پوچھا ''کوئی خبر؟''



وائرلیس آپریٹر نے کہا ''میرا خیال ہے وہ عورت رات مر گئی''۔

دوسری طرف تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ پھر سوال کرنے والے نے بے وقوفی سے پوچھا۔

''یعنی دوا لینے پر راضی نہیں ہوئی''۔

وائرلیس آپریٹر نے ترشی سے کہا ''ظاہر ہے''۔

اسکول ماسٹر جو گڑھا کھود رہا تھا اب اس کی شکل واضح ہو چکی تھی۔ گڑھا تقریباً چھ فٹ لمبا تھا۔ اندر عورت اسی طرح بے حس و حرکت پڑی تھی۔ ایک بار پھر مواصلاتی سیارے کے ذریعے خلائی تجرباتی سینٹر سے کس نے پوچھا:

''تمہیں یقین ہے عورت مر چکی ہے؟''

آپریٹر نے کہا ''بالکل''۔

سوال کرنے والے نے پوچھا ''نئی دوا کا کیا کرو گے؟''

''معلوم نہیں۔ ابھی سوچا نہیں ہے''۔ ادارۂ انسان کو بچاؤ کے نمائندے نے کہا۔

دوسری طرف والے نے کہا ''ہمیں بھیج دو''۔

''کیوں؟'' عالمی ادارۂ انسان کو کو بچاؤ، کے نمائندے نے پوچھا۔

''ہمیں معلوم ہے اس کا کیا کرنا چاہیے'' خلائی تجربہ گاہ کے سوال کرنے والے نے کہا۔

ادھر خاموشی رہی۔

خلائی تجربہ گاہ والے نے کہا ''ہم خلا میں جانے والے راکٹ کی ناک کے کیپسول میں رکھ کر اسے بھی خلا میں بھیج دیں گے''۔

اسکول ماسٹر تھوڑے تھوڑے وقفے سے قبر کی مٹی پھاوڑے سے باہر پھینک رہا تھا۔ اس کے سر پر سے ہیلی کوپٹر گزر رہے تھے۔ لیکن وہ ان کے پروں کے شور سے بے نیاز خود سے باتیں کر رہا تھا۔

''پیاری زمین، تو ابھی تک اچھی ہے۔ ابھی تک کتنی خوبصورت ہے۔ اتنی خوبصورت کہ میں اپنی سب سے خوبصورت متاع جسے میں نے تیرے ان دشمنوں کے حوالے نہیں کیا، آج تیرے حوالے کرنے کو تیار ہوں''۔

# راکھ

موم بتّی جل کر آدھی رہ گئی تھی اور پگھلا ہوا موم، جو بہہ بہہ کر ایک طرف جمع ہوتا رہا تھا، ایسا لگتا تھا جیسے بارشوں سے کٹی پھٹی کوئی لال مٹّی کی پہاڑی موم بتّی اس طرح رکھی گئی تھی کہ بساط پر زیادہ سے زیادہ روشنی پڑ سکے اور سامنے کی دیوار پر مہروں کے سائے بہت بڑے ہو کر نظر آ رہے تھے۔ سب سے نمایاں سایہ بادشاہ کا تھا جس کا تاج بڑی سی صلیب میں تبدیل ہو گیا تھا۔ مہروں کے سایوں کے اس جمگھٹے پر کسی گورستان کے منظر کا دھوکا ہوتا تھا۔ مہرہ اپنی جگہ لوحِ مزار سے کم نہ تھا۔ میں نے باقی بچی ہوئی موم بتّی سے اندازہ لگایا کہ وہ کتنی دیر اور جلے گی اور کسی کو مخاطب کیے بغیر رائے ظاہر کی:

''موم بتّی کوئی ایک بجے جل بجھے گی۔'' اشفاق نے بساط سے نظر ہٹا کر ایک لمحے کے لیے موم بتّی کو اور پھر اپنی کلائی پر بندھی گھڑی کو دیکھا اور کہنے لگا:

''ابھی تو پونے دس بجے ہیں۔ تم کیوں بے چین ہو رہے ہو؟'' اور صابر نے چال چلنے کے لیے فیل اٹھاتے ہوئے کہا: ''تم جا کے ریڈیو کیوں نہیں سنتے ذرا۔ میرا دل کہتا ہے آج کہیں نہ کہیں سے کوئی خبر ضرور آئے گی۔'' میں نے جمائی لی اور جواب دیا۔ ''اگر اتنا یقین ہے تو تم آپ جا کے ریڈیو سے کان لگا کے بیٹھ جاؤ۔ میں ساڑھے آٹھ سے سوا نو تک کوشش کرتا رہا۔ کہیں سے کچھ نہیں آ رہا۔ ہر بینڈ پر شور کے بھنور سے پڑ رہے ہیں بلکہ اب تو مجھے لگتا ہے کہ کبھی کچھ سنائی نہیں دے گا۔ برسوں تک۔ کیوں رفیق؟'' رفیق نے، جو کمرے میں ایک طرف دونوں





پاؤں دیوار سے ٹکائے دری پر لیٹا تھا، کوئی جواب نہیں دیا۔

اشفاق بازی قریب قریب ہار چکا تھا۔ بڑے مہروں میں اس کے پاس صرف ایک فیل اور رخ بچا تھا۔ بادشاہ پر بار بار شہ پڑ رہی تھی۔ کھیل میں کوئی جان نہ رہی تھی۔ میں اٹھ کر کمرے سے باہر آ گیا۔ کل کی نسبت آج پھر بھی چہل پہل کے کچھ آثار تھے۔ نیچے سڑک سے آدمیوں کے بولنے چالنے کی آواز آ رہی تھی۔ کل تو ایسا لگتا تھا جیسے شہر بھر کو سانپ سونگھ گیا ہو، جیسے ہر کوئی بالکل نا امید ہو کر منہ چھپائے بیٹھا ہو میں نے بالکنی مین جا کر جھانکا۔ بیڈن روڈ پر اس سرے سے اس سرے تک اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ جب میں نے اس طرف نظر ڈالی جہاں بیڈن روڈ میکلوڈ روڈ سے جا ملتی ہے تو وہاں چند لمحوں کے لیے اچانک پیلی سی روشنی کہیں سے آتی دیکھائی دی جس پر مجھے حیرت ہوئی۔ روشنی کے ناپید ہوتے ہی دوبارہ گھپ اندھیرا چھا گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے دور سے گانے بجانے کی آواز آ رہی ہو۔ شاید میرے کان بج رہے تھے۔ یا شاید وہ وقت آ پہنچا تھا جب آدمی کو خیالی آوازیں سنائی اور خیالی شکلیں دکھائی دینے لگتی ہیں۔

جنگ اتوار کی صبح کو شروع ہوئی تھی۔ ابتدائی خبروں سے کچھ پتا نہ چلتا تھا کہ پہل درحقیقت کس نے کی ہے اور لڑائی کہاں کہاں ہو رہی ہے اور کیا صورت اختیار کرے گی۔ ہماری جملہ معلومات اتفاق سے انہیں ابتدائی اور مبہم معلومات تک محدود رہیں کیوں کہ دوپہر کے بارہ بجے تک ہمارا رابطہ باقی دنیا سے بالکل منقطع ہو گیا۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا ہو رہا ہے یا کیا ہونے والا ہے۔ ہر طرح کی احمقانہ، ڈراؤنی اور افسانوی افواہیں گشت کر رہی تھیں۔ ریڈیو پر سفید شور کے سوا کچھ سنائی نہ دے رہا تھا۔ شہر میں انتظامیہ کی طرف سے بلیک آؤٹ کا اعلان کیا گیا لیکن اس پر عمل درآمد کرانے کی ضرورت پیش نہ آئی کیوں کہ تین بجے سہ پہر پندرہ منٹ کے وقفے سے زلزلے کے دو سخت جھٹکے محسوس کیے گئے جن سے بعض بوسیدہ اور کمزور مکان گر گئے اور بہت سے مکانوں اور عمارتوں میں دراڑیں پڑ گئیں۔ سب سے بڑی قباحت یہ ہوئی کہ ان زلزلوں کے ساتھ ہی برقی رو معطل ہو گئی۔

اس ناگہانی آفت نے مزید افواہوں اور بدگمانیوں کو جنم دیا۔ شہر میں منگلا اور تربیلا ڈیم کو

نقصان پہنچنے اور چناب اور جہلم پر بنے ہوئے پلوں کے ٹوٹ جانے کی خبر پھیل گئی۔ پتا نہیں یہ اطلاع صحیح تھی یا غلط، البتہ اتنا ضرور دیکھنے میں آیا کہ پنڈی کی طرف سے آنے والی ٹریفک اچانک رک گئی اور ٹیلی فون کا رابطہ بھی باقی نہ رہا۔ طیاروں کی پرواز بھی بند تھی۔ ہو سکتا ہے کہ ایسا حفظِ ماتقدم کے طور پر کیا گیا ہو یا شاید تیل بچانا مقصود ہو کیوں کہ تیل پیدا کرنے والے ملکوں سے بھی رابطہ ٹوٹ چکا تھا اور کچھ معلوم نہ تھا کہ ان پر جنگ کے کیا اثرات مرتب ہوئے ہیں۔

سب سے بڑا خدشہ اس کا تھا کہ ایسی صورت حال میں ہر طرف آپا دھاپی مچ جائے گی۔ لوگ لوٹ مار اور غارت گری پر اتر آئیں گے لیکن کم از کم لاہور کی حد تک اس قسم کے صرف اکا دکا واقعات ہی اتوار اور اتوار اور پیر کی درمیانی رات کو پیش آئے۔ مسلسل دہشت سے لوگوں کے اعصاب سن ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ بار بار آسمان کی طرف دیکھتے جیسے بس کوئی جگمگ جگمگ کرتا جوہری ہتھیار، سنسناتا ہوا ان کے درمیان گرا ہی چاہتا ہو اور ان کے بھسم ہو جانے کی گھڑی قریب آ پہنچی ہو۔ جن لوگوں سے بن پڑا اور جنہوں نے اپنے خیال میں قصبات اور دیہات کو محفوظ جانا وہ شہر چھوڑ کر جانے لگے۔

پیر کے دن اگرچہ مجموعی صورت حال میں کوئی تبدیلی نہیں آئی مگر لوگوں میں زندگی یا کہہ لیجیے امید کی رمق دکھائی دینے لگی۔ علی الصباح ہی پورے شہر میں یہ افواہ پھیل گئی کہ کسی پیر کامل کو، جو داتا صاحب کے مزار پر حاضر ہوئے تھے، پچھلے پہر بشارت ہوئی کہ ان مسلمانوں کے لیے، جو صحیح معنی میں مومن ہیں، تشویش کی کوئی بات نہیں کہ جمعرات کو چاشت کے وقت مہدی علیہ السلام بیت المقدس میں ظہور فرمائیں گے اور مسلمانوں کو جہاد کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اس نوید سے لوگوں کے دل، جو الٹے ہوئے تھے، پچھلے پہر بشارت ہوئی کہ ان مسلمانوں کے لیے، جو صحیح معنی میں مومن ہیں، تشویش کی کوئی بات نہیں کہ جمعرات کو چاشت کے وقت مہدی علیہ السلام بیت المقدس میں ظہور فرمائیں گے اور مسلمانوں کو جہاد کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اس نوید سے لوگوں کے دل، جو الٹے ہوئے تھے ذرا سنبھل گئے اور مسجدوں میں اور مزاروں پر تل دھرنے کی جگہ نہ رہی۔

یہ سب کچھ سہی لیکن کسی طرف سے کوئی یقینی اطلاع نہ آ رہی تھی۔ محض افواہوں کا بازار



گرم تھا۔ سننے میں آیا کہ بعض لوگ بھمبر سے چل کر لاہور پہنچے ہیں۔ وہ بقول خود، اتوار کی سہ پہر کو بھمبر سے روانہ ہوئے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ انہوں نے سہ پہر کو شمال کی طرف ایک خیرہ کن چمک دیکھی تھی اور ایک غیبی آواز کو، جو سخت مہیب تھی، فاعتبرو کہتے سنا تھا۔ اس چمک اور ندا کے فوراً بعد زلزلہ آیا تھا۔ مشکل یہ تھی کہ بظاہر کوئی شخص خود ان آنے والوں سے نہیں ملا تھا۔ ہر آدمی کو ان کے بارے میں کسی اور نے بتایا تھا۔ اس بنا پر اس سارے قصے کو من گھڑت قرار دینے کے سوا چارہ نہ تھا۔

پیر کی شام کو خاصی تیز آندھی آئی جس سے ہزاروں درخت اور بجلی کے کھمبے اکھڑ گئے۔ آندھی زیادہ دیر نہیں چلی اور اس کے بعد فضا پر ایک گہرا سکوت چھا گیا جو کسی اور ابتلا کا پیش خیمہ معلوم ہوتا تھا۔

میں بالکنی سے ہٹ کر صحن میں ٹہلنے لگا۔ ہوا بالکل بند تھی میں نے سوچا کہ کل منگل ہو گا اور پھر بدھ۔ یہ دو دن صدیوں لمبے معلوم ہو رہے تھے، پہاڑ جو کاٹے نہ کٹیں۔ جمعرات کا مجھے بھی انتظار تھا۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بہت ہوتا ہے۔ میں بھی یہ آس لگائے بیٹھا تھا کہ شاید جمعرات کو کوئی تبدیلی ظہور میں آئے اور اس نزع کی کیفیت سے ہماری جان چھٹے۔

ٹہلتے ٹہلتے مجھے محسوس ہوا جیسے کوئی چیز، کوئی بہت ہلکی سی چیز میرے سر پر گری میں نے سر پر ہاتھ پھرا تو ہاتھ لگتے ہی وہ چیز غبار ہو کر بالوں میں بکھر گئی۔ میں حیران ہوا کہ ہوا بالکل رکی ہوئی ہے تو پھر سر پر مٹی کہاں سے آ گری؟ اگلے ہی لمحے کوئی چیز میری گردن کے پچھلے حصے پر گری جس سے وہاں چھوٹے چھوٹے بالوں میں ویسی سلسلاہٹ ہوئی جیسی بدن کے کسی حصے پر چیونٹی کے رینگنے سے رونگٹوں میں پیدا ہو جاتی ہے۔ سلسلاہٹ کی وجہ سے مجھے خیال آیا کہ ہو نہ ہو یہ مکڑی کا کوئی جالا ہے جو آندھی میں اڑ کر صحن میں آ لٹکا ہو گا اور اب میری گردن کو لگ گیا ہے۔ میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو پتا چلا کہ درحقیقت کوئی چیز فضا سے چھوٹے چھوٹے گالوں کی صورت میں نیچے آ رہی ہے۔ اندھیرا تو ضرور تھا لیکن میں کچھ دیر سے ٹہل رہا تھا اور میری آنکھیں اندھیرے سے تھوڑی بہت مانوس ہو چکی تھیں۔ دیر سے کچھ نہ کچھ یقیناً گر رہا تھا۔ میں نے اپنی

دونوں ہتھیلیاں سامنے پھیلا دیں۔ چند لمحے بعد کوئی نرم اور بالکل بے وزن سی چیز میری بائیں ہتھیلی پر گری۔ میں اسی طرح ہتھیلی پھیلائے کمرے کے دروازے کے پاس گیا جہاں کواڑ کی درزوں سے موم بتی کا مدھم نور چھنک رہا تھا۔ وہاں رک کر میں نے ہتھیلی کی طرف دیکھا۔

میری ہتھیلی پر روپے کے سکے جتنی جگہ گھیرے راکھ کی ایک باریک سی پرت رکھی تھی۔ راکھ کی اس تہہ سے مشابہ جو بجھتے کوئلے پر چڑھنے لگتی ہے اور پھونک مارنے سے ادھر ادھر اڑ جاتی ہے۔ میں نے مڑ کر صحن کر دیکھا۔ راکھ اب جگہ جگہ پتیوں کی طرح بکھری نظر آ رہی تھی۔ کمرے کے کواڑ ذرا سے کھول کر میں نے زور سے کہا: ''آسمان سے راکھ گر رہی ہے۔''

یہ سنتے ہی رفیق اس طرح اٹھ بیٹھا جیسے اسے بجلی کا جھٹکا لگا ہو۔ صابر نے، جو کچھ دیر سے دوزانو بیٹھا تھا، میری طرف حیران ہو کر دیکھا، اٹھنے کی کوشش میں دونوں ہاتھ زمین پر ٹیک دیے اور دوبارہ مجھے تکنے لگا جیسے اسے یقین نہ آ رہا ہو کہ جو کچھ اس نے سنا وہ صحیح ہے۔ دراصل وہ شطرنج کے بازی میں پوری طرح منہمک تھا اور اس انہونی سے اس کا ذہن چکر کھا گیا۔ کس بندر کی طرح جو ابھی درخت سے ٹپکا ہو، وہ دونوں ہاتھ زمین پر ٹیکے، منہ کھولے، مجھے تکتا رہا۔

پھر وہ تینوں یکایک ہڑبڑا کر دروازے کی طرف لپکے۔ اشفاق نے اٹھتے اٹھتے، خدا جانے اتفاقاً یا عمداً، کچھ اس طرح پاؤں چلایا کہ ٹھوکر سے ساری بساط ہی الٹ گئی۔ راکھ اب پہلے سے زیادہ گر رہی تھی اور صحن میں اس کی تہہ بچھ گئی تھی۔ اور لوگوں کو بھی پتا چل گیا تھا کہ راکھ برس رہی ہے اور آس پاس کے مکانوں اور چھتوں سے ان کے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔

اشفاق اندر سے موم بتی اٹھا لایا۔ ہم نے راکھ کو غور سے دیکھا۔ وہ سرمئی کم اور سیاہی مائل زیادہ تھی۔ صابر نے کہا:

''اسے ہاتھ مت لگاؤ۔ یہ تاب کار ہوگی۔''

اس پر اشفاق ہنسا اور کہنے لگا: ''تم بھی نرے گوکھے ہو۔ ہر طرف راکھ ہی راکھ پھیلی ہوئی ہے۔ صبح تک، اگر صبح ہوئی تو، یہ سیروں کے حساب سے نتھنوں کے راستے ہمارے اندر جا چکی ہوگی۔ تاب کار ہو تو کیا، بے ضرر ہو تو کیا۔ آج تو لگتا ہے چودہ کے چودہ طبق جل گئے۔



شیطان بے چارہ بھی پچھاڑیں کھا رہا ہوگا''۔

''پچھاڑیں کیا معنی'' صابر بولا۔ ''بغلیں بجا رہا ہوگا۔''

اشفاق نے فوراً کہا: ''بھئی جس کا روزگار ہی چھن جائے وہ کاہے کو اٹکھیلیاں کرے گا۔ جب دنیا میں آدمی نہ رہیں گے تو شیطان بہکائے گا کسے، ورغلائے گا کسے؟ پنشن بھی نہیں ملے گی سالے کو۔''

صابر نے کہا: ''مجھے یہ فکر ہے کہ اگر شہر میں کہیں ایک دفعہ آگ لگ گئی تو پھر خدا ہی حافظ ہے۔ پانی کی کمی کی وجہ سے پہلے ہی تراہ تراہ ہو رہی ہے۔''

اشفاق بولا: ''دنیا خالصے لگ گئی، انھیں اپنی پڑی ہے۔ قاضی جی کیوں دبلے؟ شہر کے اندیشے سے۔''

مجھے ڈر لگا کہ کہیں ان کی نوک جھوک تو تکار میں نہ بدل جائے اور میں نے صابر کو کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ پہلے ہی بول پڑا۔ ''پتا نہیں کب سے لوگ کہہ رہے تھے کہ یارو، ہوش کے ناخن لو۔ دنیا میں اور بہت سے کام بھی کرنے کے ہیں۔ صرف اسلحہ کا انبار نہ لگائے جاؤ کسی نے نہ سنی۔ آپ تو منٹوں میں چٹ پٹ ہو گئے ہوں گے۔ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر کون مرے گا؟ ہم! آپ لڑ مرے، راکھ ہمیں پھانکنی پڑ رہی ہے۔ بولو، اس راکھ کو کیا شہد لگا کر چاٹیں؟''

صابر نے کہا: ''یار، اس وقت تم نے عجیب بات کی۔ ہمارے پرانے شہر میں، میرے بچپن کی بات ہے، ہمارے محلے میں وہ جو گھر تھا نا اپنا جس کے باہر کنواں اور کنویں کے ساتھ پیپل تھا، اس سے کوئی دس بارہ گھر چھوڑ کر ایک حکیم صاحب کی حویلی تھی۔ حکیم تاج الدین نام تھا ان کا۔ حکمت ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ باپ حکیم، دادا حکیم، پردادا حکیم۔ ان کا کتب خانہ بھی بہت خوب تھا۔ ایک دفعہ، خدا جانے جون کے دن تھے یا جولائی کے، دن دہاڑے، پتا نہیں کیسے، حویلی میں آگ لگ گئی۔ لوگ کہتے تھے کوئی کیمیاگری کا چکر تھا۔ یار، بڑی زبردست آگ تھی۔ اس وقت تو ایسا لگتا تھا، ہم سب بہن بھائی چھوٹے چھوٹے تھے نا، کہ ساری دنیا جل رہی ہے پرانی پرانی، ہاتھ کی لکھی ہوئی کتابوں کے ادھ جلے ورق ہوا میں اڑتے اڑتے ہمارے گھر میں آ آ کر گر رہے تھے۔ ہر طرف دھواں اور راکھ۔ پورے محلے میں جیسے غدر پڑا ہوا تھا۔

بڑی مشکل سے آگ بجھائی گئی۔ حویلی کا بیشتر حصہ جل کر تباہ ہو گیا۔ خود حکیم صاحب کا دماغ چل گیا۔ اپنی جلی حویلی کے سامنے ادھر سے ادھر ٹہلتے رہتے۔ کوئی جاننے والا نظر آ جاتا تو مٹھی بھر راکھ اٹھا کر اسے دیتے اور کہتے کہ لو، یہ شہد لگا کے چاٹ لو، نافع ہے۔ نافع کا لفظ پہلی بار وہیں کان میں پڑا۔ اس وقت صرف ایک حویلی جلنے سے دل دہل گیا تھا اور اب، پتا نہیں کیا بات ہے، جب کہ آدھی پونی دنیا جل گئی ہے، کوئی ہیبت ہے نہ عبرت۔ کوئی ملال بھی نہیں۔ بس اتنا سا تجسس ہے کہ یہ راکھ آئی کہاں سے۔"

''چولھے میں آخر راکھ ہی رہ جاتی ہے''۔

اشفاق نے مسکرا کر کہا۔

میں نے کہا: ''لگتا ہے کہ راکھ بھی ختم ہونے کو ہے۔'' اور واقعہ بھی یہی تھا۔ راکھ جس ناگہانی انداز میں گرنی شروع ہوئی تھی اسی طرح اچانک رک بھی گئی۔

اشفاق کہنے لگا: ''آئندہ موسمی رپورٹیں کچھ اس قسم کی ہوا کریں گی۔ اگلے چوبیس گھنٹوں میں مطلع جزوی طور پر خبر آلود رہے گا۔ وقفے وقفے سے گوروں کی راکھ برسے گی۔ ہوا میں سمیت چونسٹھ فی صد۔ میرے خیال میں اندر چلا جائے۔''

ہم سب واپس کمرے میں چلے گئے۔ صابر نے ہنس کر مجھ سے کہا: ''اشفاق آج کل بہت چہک رہا ہے۔ ارے یار، تو مردم آزاد تو نہیں جو ساری دنیا کو آفت میں مبتلا دیکھ کر خوش ہو رہا ہے؟ دوسری طرف یہ حال ہے کہ مات ہوتے دیکھی تو جھوٹ موٹ ٹھوکر کھا کر بساط الٹ دی۔''

اشفاق نے بساط پر نئی بازی کے لیے مہرے جماتے ہوئے جواب دیا: ''بساط کا کیا ہے۔ الٹتی ہی رہتی ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ میں دوسروں کو تکلیف میں مبتلا دیکھ کر خوش ہوتا ہوں تو یہ بالکل غلط ہے۔ اپنا فلسفہ ہے کہ آدمی کو سدا خوش رہنا چاہیے۔ وہ جو محاورہ ہے کہ بور کے لڈو، کھائے سو پچھتائے، نہ کھائے سو پچھتائے تو جب پچھتانا دونوں صورت میں لازم ہے تو، یارو، کھا کر ہی کیوں نہ پچھتایا جائے۔ مرنے سے کون بچا ہے؟ روتی صورت کا انجام بھی وہی، ہنس مکھ کا انجام بھی وہی پھر آدمی آخری دم تک خوش و خرم کیوں نہ رہے؟ اب یہ تو مجھ سے ممکن نہیں کہ صابر کی طرح اپنے اوپر دہشت طاری کر کے بیٹھا رہوں یا رفیق کی طرح گم سم کیوں، میاں، تمہاری جیبھ کو کوّے لے گئی کیا؟''

لیکن رفیق نے، جو پہلے کی طرح دیوار پر دونوں پاؤں ٹکائے لیٹا تھا، کوئی جواب نہیں دیا۔ اشفاق نے کن انکھیوں سے رفیق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ''اس پودنے کی کہانی یاد ہے، صابر، جو تمہیں اوپر اٹھائے لیتا تھا؟''

''تم چال چلو!'' صابر نے کچھ جھنجھلا کر اسے ٹوکا۔ نئی بازی شروع ہو چکی تھی۔ میں بھی دفع الوقتی کے لیے پاس بیٹھ کر کھیل دیکھنے لگا۔ صابر نے جمائی لے کر کہا: ''ایک چوک ہو گئی۔ ذرا جا کر دیکھنا چاہیے تھا۔ شاید کہیں سے سگرٹ مل جاتے۔ آج تو شاید پتی بھی نہیں ہے؟ چائے کو جی چاہ رہا تھا۔''

''مسئلہ پتی کا نہیں ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''پانی ختم ہو چلا ہے۔''

چند چالیں دیکھ کر میں ساتھ والے کمرے میں چلا گیا۔ وہاں میرا ٹرانزسٹر رکھا تھا۔ میں نے بڑی احتیاط سے ہر بینڈ پر اول تا آخر سوئی گھما کر سنا۔ کھڑ بڑ، سیٹیوں اور بادلوں جیسی گڑگڑاہٹ کے سوا کوئی آواز نہیں آ رہی تھی، بلکہ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ شور پہلے سے بہت بڑھ گیا ہے۔

میں واپس آ کر بیٹھا ہی تھا کہ سیڑھیوں پر کسی کے آہستہ آہستہ چڑھنے کی آواز آئی۔ زینے میں، ظاہر ہے، اندھیرا تھا اور آنے والا پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا تھا۔ ''اس وقت کون آ گیا؟'' صابر نے بساط سے نظر ہٹا کر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''پتا نہیں'' میں نے جمائی لے کر جواب دیا اور بڑی بے دلی سے اٹھ کر کھڑا ہونے لگا۔ اتنے میں کسی نے دروازہ دھم دھمایا اور پکار کر کہا: ''ارے بھئی، کوئی ہے گھر پہ؟''

صابر نے حیران ہو کر کہا: ''یہ تو مرزا صاحب کی آواز معلوم ہوتی ہے۔'' رفیق اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے جلدی سے جا کر دروازہ کھولا۔ واقعی مرزا صاحب تھے۔ سر پر جناح کیپ، ہاتھ میں چھڑی، سفید کرتا شلوار زیب تن۔ وہ پہلے ہمارے دفتر میں ہیڈ کلرک تھے۔ کئی برس ہوئے ریٹائر ہو چکے تھے۔ بڑے شگفتہ خاطر انسان تھے۔ مجھ سے اور صابر سے اکثر ملتے رہتے تھے۔ اصل

میں وہ صابر کے والد کے ارادت مندوں میں سے تھے۔ صابر گویا ان کا مرشد زادہ ٹھہرا۔ اس سے میل جول رکھنے میں کچھ دخل شاید عقیدت کا بھی ہو۔ مجھ سے تعلق خاطر کا سبب اور تھا۔ جب میں نیا نیا لاہور آیا تھا تو چند مہینے ان ہی کے گھر ایک کمرے میں رہا تھا۔ وہ کرایہ لینے پر راضی نہ تھے اور میں کرایہ ادا کرنے پر بضد تھا۔ بالآخر طے یہ پایا کہ میں ان کی لڑکی کو، جو اس وقت آٹھویں میں پڑھتی تھی، اور دونوں لڑکوں کو، جو پانچویں میں تھے، حساب اور انگریزی پڑھا دیا کروں۔ کہنے کو تو یہ بہت معقول سا بندوبست دکھائی دیتا تھا لیکن دس پندرہ دن روزانہ دو تین گھنٹے مغز خالی کرنے کے بعد میری طبیعت الجھنے لگی اور مجھے اندازہ ہوا کہ اس کوفت کی نسبت مہینے کے مہینے کرایہ ادا کرنا کہیں زیادہ سہل رہتا۔ چناں چہ جیسے ہی موقع ملا میں ان کا گھر چھوڑ کر ایک اور جگہ منتقل ہو گیا۔ ممکن ہے مرزا صاحب نے میری اس بے صبری کا برا مانا ہو لیکن انھوں نے کبھی ملال کا اظہار نہیں کیا۔

”آئیے، مرزا صاحب“ میں نے کہا۔ ”آپ اس وقت کیسے؟“ میں انھیں لے کر اندر آیا تو وہ صابر کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے: ”یہ تو بہت ہی اچھا ہوا کہ آپ یہیں مل گئے۔ میں پہلے آپ کی طرف جانے لگا تھا۔ پتا نہیں پھر ادھر آنے کا خیال کیسے غالب آ گیا۔ آپ کا کوئی روحانی تصرف معلوم ہوتا ہے۔ اشفاق صاحب، مبارک ہو سنا ہے آپ کی ترقی ہو گئی۔“

اشفاق ہنسا اور بولا: ”آپ ترقی کی کیا بات کرتے ہیں، ہم سب کا تبادلہ ہوتا نظر آ رہا ہے۔“

مرزا صاحب رفیق کو نہیں جانتے تھے۔ میں نے ان کا تعارف کرایا۔ رفیق نے ہاتھ ملانے پر اکتفا کیا۔ مرزا صاحب کی رسمی مزاج پرسی کے جواب میں ایک لفظ بھی زبان سے نہ کہا۔ مرزا صاحب دوبارہ ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمانے لگے: ”دو دن میں دنیا کیا سے کیا ہو گئی!“

”دو دن؟ ارے صاحب، میرا خیال ہے گھنٹے بھر میں جھاڑو پھر گئی ہو گی“ صابر نے کہا۔

اشفاق بولا: ”دراصل مرزا صاحب صرف یہ دیکھنے آئے ہیں کہ اس تابڑ توڑ بلکہ جگر پاش تاب کاری سے ہم جیسے چبلوں کے دل کی سیاہی دور ہوئی یا ہمیں راہ راست پر لانے کے لیے



کوئی اور غضب ڈھانا پڑے گا۔“

”شامت اعمال ہے، میاں“ مرزا صاحب نے جواب دیا۔ ”کہاں آسمان سے چھاجوں نور برستا تھا، کہاں ہمارے زمانے میں اوپر سے مارا مار راکھ گر رہی ہے۔ جب چیزوں میں برکت ہی نہ رہے تو سب کچھ راکھ ہے۔“

”معلوم ہوتا ہے کہ ہنگامی بنیادوں پر دوزخ کی صفائی کا حکم صادر ہوا ہے۔ راکھ پچھواڑے پھینکتے جا رہے ہیں۔“ اشفاق نے خیال ظاہر کیا۔

چند منٹ یہ چہل جاری رہی۔ یوں تو مرزا صاحب نے بھی حسب توفیق، اس میں حصہ لیا مگر مجھے ایسا لگا کہ ان کی توجہ بٹی ہوئی ہے اور وہ پوری طرح ہمارے درمیان حاضر نہیں۔ گفتگو میں ذرا سا وقفہ آیا تو مرزا صاحب نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بدلے ہوئے لہجے میں کہنے لگے: ”اب آپ سب کو ذرا سی زحمت فرمانی ہو گی۔ اسی لیے میں یہاں حاضر ہوا ہوں۔ کچھ دیر کے لیے غریب خانے پر تشریف لے چلیے۔ ذرا رونق ہو جائے گی۔ بچّی کا نکاح کر رہا ہوں۔ چند ایک اصحاب پاس پڑوس سے مدعو کیے ہیں۔ احباب میں آپ ہو جائیں گے۔“

کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ ہم ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے جیسے ہمارے ساتھ کوئی مذاق کیا جا رہا ہو جو ڈراؤنی حد تک نازیبا بھی ہو اور بالکل بے محل بھی۔

”نکاح مرزا صاحب؟“ میں نے بمشکل یہ الفاظ ادا کیے۔ ”اس وقت؟“ اور ظاہر ہے کہ اس وقت سے میری مرا صرف یہ نہیں تھی کہ رات کے گیارہ بجنے والے ہیں۔

مرزا صاحب کے لیے یہ سوال غیر متوقع نہ تھا۔ وہ سوچ کر آئے ہوں گے کہ جواب میں کیا کہنا ہے۔ انھوں نے گہرا سانس لیا اور بولے: ”آپ کو پتا ہی ہے کہ میری بچّی اپنے خالہ زاد سے منسوب ہے۔ حسیب بچپن ہی میں والدین کی شفقت سے محروم ہو گیا تھا۔ میں نے ہی اسے پالا اور پڑھایا لکھایا۔ بچپن سے صفیہ اور حسیب دنوں ساتھ ساتھ پلے بڑھے۔ ایک دوسرے سے بہت مانوس ہیں۔ بس یہی خیال تھا کہ حسیب برسر روزگار ہو جائے تو یہ بوجھ بھی سر سے اتار دیا جائے۔ خدا کے فضل سے پچھلے مہینے حسیب کو شیماز فرٹی لائنرز میں دو ہزار ماہانہ کی ملازمت مل گئی۔ وہی کارخانہ جو جاپانی لودھراں میں لگا رہے ہیں۔ میں نے تو پچھلے مہینے ہی اس سے کہا تھا

کہ نیک کام میں دیر کیسی، بس اب گھر بسالو۔ لیکن آج کل کے نوجوان کسی کی سنتے نہیں۔ اب پچھتا رہا ہوگا۔ بڑی مشکل سے دونوں کو...... خیر، آپ حضرات اب تشریف لے چلیں تو بہتر ہے دیر کرنی مناسب نہیں۔"

"جی ہاں، بالکل" یہ کہہ کر ہم سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں انھیں جوتے پہنتے چھوڑ کر اندر دوسرے کمرے میں گیا جہاں میرا سامان رکھا تھا۔ مجھے یاد آیا تھا کہ میری پاس ہاتھی دانت کی بنی ہوئی ایک ڈبیا پڑی تھی۔ والد صاحب کسی ملک سے لائے تھے۔ مجھے اچھی لگی تو ان سے میں نے لے لی۔ ایسی خوش نما اور نازک چیزوں کا بالعموم کوئی مصرف نہیں ہوتا۔ انھیں حاصل کرکے ہی آدمی کا شوق پورا ہوجاتا ہے۔ پھر باقی تمام وقت وہ کسی صندوق یا الماری میں پڑی یا کسی کارنس پر دھری رہتی ہیں۔ میں نے بکس سے وہ ڈبیا نکالی اور کرتے کی جیب میں ڈال لی۔

ڈبیا کے باریک نقش ونگار پر نظر پڑنے اور انگلیوں سے اسے چھونے سے مجھے صفیہ کا خیال آگیا اور میں باہر جاتے جاتے رکا۔ وہ خوب صورت تو نہیں تھی لیکن اس کی باریک بھوؤں، چھوٹی سی ناک، چھوٹے سے منھ، اجلی رنگت جس کی تہہ میں پیلاہٹ جھلک مارتی تھی، اور ہاتھوں پر ابھری ہوئی نیلگوں غبار جیسی رگوں سے کسی نازک اور آسانی سے ٹوٹ جانے والی چیز کا تاثر ملتا تھا۔ میں نے اس کے بارے میں کبھی دل لگا کر سوچا بھی نہ تھا۔ وہ گاہے گاہے محض اتفاق سے مجھے یاد آجاتی تھی جیسے کسی چیز پر اچٹتی سی نظر پڑ جائے۔ پھر بھی اس وقت اس کی شادی کا ذکر مجھے ناگوار سا گزرا جیسے خود میرے ساتھ کوئی زیادتی ہوئی ہو۔ میں نے یاد کرنا چاہا کہ جن دنوں میں مرزا صاحب کے گھر رہتا تھا تو ان کا رویہ حبیب کے ساتھ کیسا تھا اور مجھے کوئی خاص بات یاد نہ آسکی۔ شاید ان کے رویے میں کوئی قابل ذکر بات تھی ہی نہیں۔ میں نے سوچا کہ ان دنوں حبیب کالج میں تھا اور صفیہ یا بچوں کو وہ بھی پڑھا سکتا تھا۔ میں نے سوچتے سوچتے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ڈبیا باہر نکال لی۔ ہم سب جس صورت حال میں گرفتار تھے اس میں کوئی تحفہ دینے کی تک بھی کیا تھی؟

چند لمحے کے تامل کے بعد میں نے بغیر سوچے سمجھے ڈبیا دوبارہ جیب میں ڈال لی۔

وہ چاروں باہر صحن میں کھڑے تھے۔ مرزا صاحب چھڑی کی نوک سے راکھ کرید رہے



تھے۔ صابر کہہ رہا تھا "...... اور نہ وہ دجال آیا نہ یاجوج ماجوج نے دھاوا بولا۔"

اشفاق نے اپنے مخصوص انداز میں مسکرا کر اطمینان دلایا: "سب آئیں گے، سب کچھ ہوگا۔ خدا کے فضل وکرم سے مایوس نہ ہونا چاہیے۔ کیا پتا......"

اتنے میں صابر نے اس کی بات کاٹ کر کہا: "یہ کس چیز کی آواز ہے؟"

سب کان لگا کر سننے لگے۔ واقعی اوپر کہیں سنسناہٹ سی ہو رہی تھی۔ ہم نے اوپر دیکھا اور سب سے پہلا خیال جو میرے دل میں آیا وہ یہ تھا کہ یہ سنسناہٹ بھی اسی عالم گیر جنگ کا حصہ ہے اور ہمارے سر پر سے کسی قسم کے میزائل یا طیارے یا اسی قماش کی کوئی شے گزر رہی ہے اور ہم جو خوبیِ قسمت سے ابھی تک بچے ہوئے تھے آخر کار زد میں آگئے ہیں۔

یکا یک مرزا صاحب بولے: "یہ تو مرغابیاں ہیں۔"

ان کے شناخت کرتے ہی ہمیں بھی مرغابیاں نظر آنے لگیں جو کوئی پانچ چھ سو فٹ کی بلندی پر پر پھیلائے، پرے باندھے سن سن کرتی جنوب کی طرف اڑی جارہی تھیں۔ وہ ہزاروں میں ہوں گی اور کچھ دیر تک گزرتی رہیں اور ہم ہونقوں کی طرح سر اٹھائے انھیں دیکھتے رہے۔ ایک سایہ سا آتا تو انائی، ادھر میں بھٹکتی ہوئی، جس کی سامنے اب شاید کوئی منزل نہیں تھی اور مجھے یوں لگا جیسے اس لمحے دنیا کی باقی مخلوق سے انسانوں کا رشتہ ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گیا ہو۔

صابر نے کہا: "ہم سے یہی اچھی ہیں۔ انھیں شاید پتا ہے کہ جنوب میں دور کہیں کوئی گوشۂ عافیت ابھی باقی ہے اور یہ وہاں جاکر دم لیں گی۔ ہم سب ختم ہوجائیں گے اور جب یہ کسی بھلے دن واپس آئیں گی تو دیکھیں گی کہ آدم نہ آدم زاد۔ ہو کا عالم ہے۔"

اشفاق منہ بنا کر کہنے لگا: "تم پر تو ہر وقت رومانی رقت ہی طاری رہتی ہے۔ ہمیں کیا، مرغابیاں مریں یا جئیں۔ اپنی فکر کرنی چاہیے۔ آپ ڈوبے تو جگ ڈوبا۔"

میں نے کہا: "قطب جنوبی جارہی ہیں یہ مرغابیاں۔ مجھے انگریزی کی ایک نظم یاد ہے جس میں یہی ہے کہ جنگ کے بعد صرف پرندے زندہ بچے ہیں جنھیں یاد بھی نہیں کہ آدمی نام کی کوئی شے یہاں......"

"میرا خیال ہے، چلیں" مرزا صاحب کچھ مضطرب ہوکر کہنے لگے۔ "ہم سب زینہ اتر کر

باہر پہنچے۔ مرزا صاحب نکلسن روڈ پر رہتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ کا راستہ تھا مگر اندھیرے کی وجہ سے آہستہ آہستہ چلنا پڑ رہا تھا۔ ہمارے قدموں سے راکھ اڑتی رہی۔ راکھ اڑاتے ہوئے جب بیڈن روڈ کے سرے کے قریب جا پہنچے تو میکلوڈ روڈ کی طرف سے ایسی آواز آئی جیسے لوگ ڈھول بجا بجا کر کچھ گا رہے ہوں۔

''یہ کیا ہو رہا ہے، مرزا صاحب؟'' صابر نے پوچھا۔

''یہ لکشمی چوک میں کچھ لونڈے لفنگے، چند بڑی عمر کے لوگ، اچک پھاند میں مشغول ہیں۔'' مرزا صاحب نے بتایا۔

''فلمی دنیا کے معلوم ہوتے ہیں۔ شاید پی بھی رکھی ہے۔ مجھے یہ ڈر ہے انہیں مار نہ پڑ جائے۔ بھلا یہ ناچنے گانے کا موقع ہے؟''

جب ہم میکلوڈ روڈ پہنچے تو لکشمی چوک میں دس گیارہ آدمی نظر پڑے انہوں نے دو تین کرسیاں اور ایک بینچ جلا کر الاؤ دہکا رکھا تھا۔ وہ ڈھول کی تھاپ کر پر تھرک رہے تھے اور ان میں سے دو تین ایسے انداز میں، جس کا خوش آہنگی سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا، کچھ گا رہے تھے۔ بہت سے تماشائی دو دو چار چار کی ٹولیوں میں پرے ہٹ کر اِدھر اُدھر کھڑے تھے۔ ہم قریب پہنچے تو گیت کے بول ہماری سمجھ میں آئے۔ یہ ایک مزاحیہ بھارتی فلم کا گیت تھا جو دو تین مہینے پہلے بھارت میں ریلیز ہوئی تھی اور اس کے بہت سے گیت خاصے مشہور ہو چکے تھے۔ جو گیت وہ لوگ گا رہے تھے وہ فلم میں تو کوئی مزاحیہ پہلو رکھتا ہوگا مگر اس وقت اس کے معنی یکسر بدل گئے تھے۔

ڈھول بجانے والا آدمی سیاہ فام تھا۔ اس کے دو تین دانت باہر کو نکلے ہوئے تھے اور آنکھیں اسی تناسب سے اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ وہ اپنا سر بار بار اس طرح جھٹک رہا تھا۔ جیسے ڈھول بجانے میں سارا زور ہاتھوں کے بجائے سر کا لگ رہا ہو۔ دو سولہ سترہ سال کے لڑکے، جن میں ایک نے بش شرٹ اور دوسرے نے کرتا شلوار پہن رکھا تھا، مٹک مٹک کر چکر کھاتے ہوئے گا رہے تھے:

''دنیا ستی ہوگئی
ہم بیٹھے رہ گئے



بڑے بڑوں میں کھڑے ہی
کھٹا پٹی ہوگئی
ہم بیٹھے رہ گئے۔''

گروہ کے ایک دو آدمی اکڑوں بیٹھے تھے۔ پانچ چھ کھڑے تھرک رہے تھے۔ سب سے مضحکہ خیز حرکات ایک ادھیڑ عمر کے آدمی کی تھیں۔ جو زمین پر لوٹ رہا تھا اور سر سے پیر تک راکھ میں بھرا ہوا تھا۔ کبھی کبھی وہ ''بیٹھے رہ گئے'' الاپا جانے پر دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر گیڈر کی طرح بولنے لگتا۔

''یہاں نہ رکیں، بس نکل چلیں'' مرزا صاحب نے دبی آواز میں تاکید کی۔ چوک سے ذرا آگے ایک فربہ اندام مولانا ایک سیاہ فام آدمی سے، جو بظاہر ان ناچنے گانے والوں کا ساتھی تھا، الجھ رہے تھے۔ ہم نے مولانا کو کہتے سنا۔ ''اگر تمہاری یہ چنڈال چوکڑی فوراً یہاں سے دفع نہ ہوئی تو پھر میں ذمے دار نہیں۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ یہ تمہارے کہنے میں ہیں یا نہیں۔ ہم انہیں سنگسار کر دیں گے۔'' اس آدمی نے جواب دینے کے بجائے دونوں ہاتھ پھیلا کر کندھے اچکائے اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

''مرزا صاحب کا خیال درست ہے۔ یہاں فساد ہوگا۔'' صابر نے کہا۔ ہم قدم مارتے ہوئے آگے بڑھے۔ لاہور ہوٹل کے پاس ہمیں بیس پچیس نوجوان کھڑے نظر آئے جو لاٹھیوں اور ہاکی کی اسٹکوں سے مسلح تھے اور آپس میں کچھ بحث کر رہے تھے۔

اشفاق نے میرے کان میں کہا: ''مرزا صاحب کی خاطر چلا آیا ورنہ میں یہ دنگا الف سے یے تک دیکھے بغیر نہ رہتا۔'' مجھے جھرجھری سی آگئی۔ میں نے جواب دیا: ''چھوڑو یار۔ پرسوں سے ہم تماشائی دیکھ رہے ہیں۔ تمہارا ابھی جی نہیں بھرا؟''

مرزا صاحب کے گھر کی بیٹھک میں، جہاں لالٹین جل رہی تھی، دس بارہ آدمی پہلے سے موجود تھے۔ حبیب نیا سوٹ پہنے اس طرح صوفے پر بیٹھا تھا جیسے اس کا فوٹو اتارا جانے والا ہو۔ کیمرے کو دیکھ کر بعض لوگوں کے چہرے پر کھسیانی سی متانت طاری ہو جاتی ہے، گویا تصویر اتروانا کوئی بہت ہی ہیبت ناک اور ثقہ فعل ہو۔ کچھ ایسی ہی وحشت حبیب کے چہرے پر برس

رہی تھی۔ یہ شاید اس کی دلی کیفیت کی غماز ہو کیوں کہ کہنا مشکل تھا کہ وہ شادی کے لیے خود رضامند ہوگیا تھا یا اس نے مرزا صاحب کے رعب میں آ کر ہامی بھر لی تھی۔

نکاح خواں وہاں موجود تھا۔ ہم لوگوں کے پہنچتے ہی نکاح پڑھا گیا۔ نکاح ہونے کی دیر تھی کہ سب لوگ، جو کچھ دیر سے منقار زیر پر تھے، چبڑ چبڑ باتیں کرنے لگے۔ موضوعِ گفتگو وہی تھا جس کی ان حالات میں توقع کی جاسکتی تھی: جنگ ختم ہوچکی یا جاری ہے؟ دنیا کا کتنا حصہ تباہ ہوچکا ہے؟ باہر کے ملکوں سے رابطہ کیوں قائم نہیں ہورہا؟ ریڈیو اسٹیشن کیوں خاموش ہیں؟ ایک صاحب بڑے وثوق سے بولے: ''لڑائی بھی جاری ہے جی۔ روس امریکہ دونوں کے پاس سیکڑوں ایٹمی آب دوزیں ہیں، میزائلوں سے لیس۔ وہ ایک دوسرے پر برابر میزائل برسا رہی ہیں۔ ابھی بڑا خطرہ ہے۔ میرا بھتیجا فوج میں ہے، وہ کہہ رہا تھا۔''

ایک اور صاحب کہنے لگے: ''میرے ایک دوست ہیں۔ ان کے کسی جاننے والے نے آج سویرے اپنے ریڈیو پر کوئی اسٹیشن کیچ کیا۔ خدا جانے کون سی زبان بولی جارہی تھی۔ پلے کچھ نہ پڑسکا۔'' یہ کوئی نئی اطلاع نہ تھی۔ کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی آدمی اس بات کا دعوے دار تھا کہ اس کے کسی جاننے والے نے ایک ریڈیو اسٹیشن کی نشریات سنی ہیں جو کسی بدیسی زبان میں ہونے کی وجہ سے قطعاً ناقابلِ فہم ثابت ہوئیں۔

ایک طرف سے آواز آئی: ''صاحب، ہم تو اب یہاں قید ہوکر رہ گئے ہیں۔ شہر سے جو باہر نکلتا ہے اسے دیہاتی لوٹ لیتے ہیں۔ میرا خلیرا بھائی سائیکل پر گوجراں والے جارہا تھا کہ پل سے چار میل ادھر تین چار مسٹنڈوں نے سائیکل بھی چھین لی اور کپڑے بھی اتروا لیے۔ ان دیہاتیوں کی خوب بن آئی ہے۔ نہ جانے اب کی دشمنیاں نکال رہے ہیں۔ کوئی جائے تو کہاں جائے۔ پتا نہیں اضلاع میں کیا غدر مچا ہوا ہوگا۔''

اتنے میں حاضرین کو چائے پیش کی گئی جس کے ہمراہ بسکٹ، دال موٹھ اور ملا جلا خشک میوہ تھا۔ اس وقت چائے بڑی غنیمت معلوم ہوئی اور اتفاق سے تھی بھی لذیذ۔ چائے پی کر چند ایک حضرات رخصت ہوئے۔ باقی اسی شد و مد سے افواہوں، ذاتی اندیشوں او رامیدوں کے ملغوبے کو متھنے میں مشغول رہے۔ میں نے مرزا صاحب کے پاس جا کر کان میں کہا کہ اگر ممکن ہو تو میں ایک دو منٹ کے لیے صفیہ سے ملنا چاہتا ہوں۔ اس پر مرزا صاحب بولے کہ ''ہاں، ہاں، کیوں نہیں! وہ تو بھئی آپ کی شاگرد بھی ہے۔'' وہ اٹھ کر اندر چلے گئے۔



خواتین کی تعداد کم ہی معلوم ہوتی تھی۔ دو تین منٹ میں پردہ ہوگیا اور مرزا صاحب نے دروازے میں آ کر مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا، میری اس کمرے تک رہنمائی کی جہاں صفیہ دلہن بنی بیٹھی تھی اور الٹے پاؤں اپنے کسی واقف کار کو رخصت کرنے چلے گئے جو اس اثنا میں انھیں آواز دے کر بلا چکے تھے۔

صفیہ نے لال جوڑا پہن رکھا تھا اور وہ سر جھکائے، ڈوپٹے کا گھونگھٹ نکالے بیٹھی تھی۔ میں نے جاتے ہی جیب سے ہاتھی دانت کی ڈبیا نکال تو لی لیکن گڑبڑا سا گیا کیوں کہ مجھے معاً یہ خیال آیا کہ شادی کی مبارک باد دینا یا تحفہ پیش کرنا طنز کے مترادف یا مکمل بے حسی کی دلیل ہوگا۔ مجھے یہ بھی احساس ہوا کہ یہاں آنے سے پہلے اچھی طرح سوچ لینا چاہیے تھا کہ آخر کہنا کیا ہے۔ اب کیا ہوسکتا تھا۔ میں نے ہاتھی دانت کی ڈبیا اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: ''یہ ڈبیا میں تمہارے لیے لایا ہوں۔ اس پر بڑا نفیس کام ہے۔ والد صاحب نے کہیں سے خریدی تھی۔ شاید مصر سے۔ تحفے کے طور پر۔ یہ لو۔''

صفیہ نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ نہ وہ منھ سے کچھ بولی نہ اس نے ڈبیا لینے کے لیے ہاتھ آگے کیا۔ چند لمحے میری طرف دیکھ کر اس نے پھر سر جھکا لیا۔ میں نے گھبرا کر ڈبیا اس کے سامنے مسہری پر رکھ دی۔ صفیہ کے ردعمل سے میں اور بوکھلا گیا تھا۔ مجھے سچ مچ یہ لگا کہ میں پرلے درجے کا احمق ہوں۔ میں نے اپنی بے بسی سے توجہ ہٹانے کی کوشش میں بغیر سوچے سمجھے بولنا شروع کردیا: ''سب ٹھیک ہوجائے گا۔ ابھی ایک صاحب بتا رہے تھے کہ...... وہ تو خیر...... ہم نے ہزاروں مرغابیاں دیکھیں یہاں آنے سے پہلے۔ وہ جنوب کی طرف اڑی جارہی تھیں۔ پرندوں کو ہم سے زیادہ پتا ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ نازک وقت گزر چکا ہے۔ اب سب ٹھیک ہوجائے گا۔ ہوسکتا ہے صبح تک...... اچھا، میں چلتا ہوں۔''

میں دل ہی دل میں خود کو کوستا ہوا جلدی سے بیٹھک میں واپس آیا۔ تھوڑی دیر بعد ہم نے مرزا صاحب سے اجازت چاہی۔ وہ باہر تک ہمیں چھوڑنے آئے اور بڑے تپاک سے

ہمارے آنے کا شکریہ ادا کیا۔ ہم نے بھی انھیں مبارک باد پیش کرتے ہوئے کچھ زیادہ ہی جوش سے یہ امید ظاہر کی کہ خطرہ غالباً ٹل چکا ہے۔

ہم واپس بیڈن روڈ کی طرف چلے۔ اشفاق اور صابر ذرا آگے آگے، میں اور رفیق دس قدم پیچھے۔ آتی دفعہ راستے میں جگہ جگہ لوگ نظر آرہے تھے لیکن اب سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اشفاق اور صابر آہستہ آہستہ کچھ بات کررہے تھے۔ میں نے نظر آسمان پر ڈالی اور پھر رفیق سے کہنے لگا: ''ایسا لگ رہا ہے جیسے یہ سب خواب ہے۔ جیسے ہم کسی سفید اور کالے خواب میں چل پھر رہے ہیں۔ تمھیں پتا ہے رنگین خواب بھی نظر آتے ہیں مگر بیشتر خواب سیاہ اور سفید ہوتے ہیں۔'' میں نے جواب کا انتظار کیا لیکن رفیق سر جھکائے چلتا رہا۔ میں بولتا چلا گیا۔ ''شاید کسی لمبے عذاب میں مبتلا آدمی یا کسی مدتوں کے زندانی کو بھی کبھی کبھار یہ لگتا ہوگا کہ اس کی اٹل اذیت یا اس کی ہتھکڑیاں بیڑیاں محض خواب ہیں۔ وہ خواب دیکھ رہا ہے اور خواب ختم ہوجائے گا اور آنکھ کھلتے ہی وہ خود کو کہیں پہ آزاد اور صحیح سالم پائے گا۔ امید کی کوئی نہ کوئی کرن تو انتہائی کس مپرسی کے عالم میں بھی دل میں بھٹکتی ہی رہتی ہے۔ اس وقت یہ اندھیرا شہر، یہ ویران سڑکیں کوئی خواب ہے یا کوئی زندان ہے۔ ہم شاید ہر وقت قید ہی میں رہتے ہیں۔ ایک اسیری سے دوسری اسیری کی طرف۔ زندان اصغر۔ زندان اکبر۔ اور پھر کوئی ساری عمر اپنے کسی خواب میں مقید، کوئی اپنے ماضی کے کسی لمحے میں گرفتار۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو کچھ ہوا اچھا ہی ہوا۔ شاید دیواریں گر رہی ہیں یا نئی دیواریں......''

اتنے میں مجھے صابر نے آواز دی اور میں بات ادھوری چھوڑ کر آگے چلا گیا۔ صابر نے کہا: ''ہم دونوں یہ بات کررہے تھے کہ مرزا صاحب کے بارے میں دفتر میں مشہور تھا کہ ان کی جزرسی پر بسا اوقات بخیلی کا گمان ہوتا ہے۔ بال برابر فرق سمجھ لو۔ اب یہ جو شادی انھوں نے کی ہے لڑکی کی تو اشفاق کو اس میں بھی دال میں کالا نظر آرہا ہے۔ موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھانا شاید اسی کو کہتے ہیں۔ ہینگ لگے نہ پھٹکری والا معاملہ۔ تمھارا کیا خیال ہے؟''

میری سمجھ میں نہ آیا کہ میں کیا جواب دوں۔ ''میرا کیا خیال ہے؟ شک تو ہر کسی کی نیت پر کیا جاسکتا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ عام حالات میں مرزا صاحب شادی پر بہت خرچ کرتے۔



مجھے مرزا صاحب کی جزرسی یا موقع پرستی سے کوئی سروکار نہیں۔ جو لوگ شادی بیاہ کے موقع پر سو طرح کے الللے تللے کرتے ہیں وہ بھی داد کے کب مستحق ہیں۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جن کی شادی کی جارہی ہو کچھ خیال...... سب بے معنی باتیں ہیں۔ یہ اب رکھا ہی کیا ہے۔''

''کیا صفیہ خوش ہے؟'' اشفاق نے پوچھا۔

''پتا نہیں'' میں نے عمداً کوئی رائے ظاہر کرنے سے گریز کیا۔

''تم نے کوئی تحفہ دیا ہے اسے کیا؟'' صابر نے دریافت کیا۔

''ہاں، ہاتھی دانت کی ایک آرائشی ڈبیا میرے پاس پڑی تھی۔ اٹھا کر دے دی۔ عقلمندی کا ثبوت نہیں دیا۔''

''اس وقت کسی کو تحفہ دینا ایسا ہے جیسے کسی کا مذاق اڑانا۔ یہی بات ہوئی نا کہ یہ لو، یہ اب میرے بھی کسی کام کا نہیں، تمھارے بھی کسی کام نہ آئے گا۔ اس لیے تم لے لو۔ تحفہ!''

''اگر میں ہوتا تو دولہا دلہن کو صرف ایک ہی تحفہ دیتا۔'' اشفاق بولا۔

''کیا؟'' صابر نے پوچھا مجھے بھی کچھ تجسس ہوا۔

''دو شیشیاں خواب آور گولیوں کی۔''

''بکو مت!'' صابر نے چڑ کر کہا۔

کچھ دیر کے لیے ہم تینوں چپ ہوگئے۔ لکشمی چوک اب بھائیں بھائیں کررہا تھا اور گانے بجانے والوں کی منڈلی رفو چکر ہوچکی تھی۔ وہاں پہنچ کر میں نے دیکھا کہ رفیق ہمارے ساتھ نہیں۔ پتا نہیں وہ چپکے سے کدھر کھسک گیا تھا۔

''رفیق پتا نہیں کہاں غائب ہوگیا'' میں نے حیرانی کا اظہار کیا۔

''تم جو اس کے ساتھ چلتے ہوئے تقریر جھاڑ رہے تھے۔ اکتا کر چلا گیا ہوگا'' اشفاق بولا۔

ہم بیڈن روڈ پر گھر کے سامنے پہنچے تو صابر نے کہا کہ وہ اب گھر جائے گا۔ اشفاق کہنے لگا: ''ایک بازی اور ہو جائے۔ آخری بازی۔ دنیا میں شطرنج کی آخری بازی''۔ صابر نے کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کی اور ہاتھ ملا کر چلا گیا۔ اشفاق نے کہا: ''صابر خواب آور گولیوں والی بات سے کچھ خفا ہوگیا۔'' میں نے کہا: ''شاید''

اشفاق نے بھی مجھ سے اجازت چاہی۔ ہم نے ہاتھ ملایا اور یہ خدشہ بھی ظاہر کیا کہ ہوسکتا ہے یہ ہماری آخری ملاقات ثابت ہو گو ہمارا لب ولہجہ چغلی کھا رہا تھا کہ دونوں کو اس بات کا ذرا بھی یقین نہیں۔

جب میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچا تو مجھے پتا چلا کہ میں دروازہ کھلا ہی چھوڑ گیا تھا۔ میں نے اسے کھلا ہی رہنے دیا۔

میں بڑی دیر صحن میں کھڑا آسمان کو دیکھتا رہا۔ اوپر کچھ بھی نہ تھا۔ نہ ستارے نہ بادل نہ مرغابیاں۔ راکھ بھی بس ایک دفعہ برس کر رہ گئی تھی۔ سناٹا چھایا ہوا تھا جیسے سارا عالم بالا سانس روکے اگلے کسی منظر کا منتظر ہو۔ شہر میں جیسے گہری نیند سو چکا تھا۔ تپتی گرمیوں میں تھکے ہارے تونسے ہوئے مسافروں کو پانی کی طلب ہوتی ہے، اسی طرح میں اس لمحے ہوا کے لیے ترس رہا تھا۔ کوئی جھونکا آئے، کوئی جھکڑ چلے، کوئی آندھی اٹھے اور یہ ساری راکھ یہاں سے اڑا لے جائے۔ جبس سے میرا دم گھٹ رہا تھا۔ میں نے دعا کی: ''پروردگار، تھوڑی سی ہوا چلا دے، ہوا چلا دے۔''

کمرے میں جا کر میں نے موم بتی جلائی اور ٹرانزسٹر چلا کر پانچ دس منٹ سوئی ادھر سے ادھر گھمائی۔ وہی بیسیوں بار سنی ہوئی کھڑ بڑ، وہی بھاری بھاری سیٹیاں، وہی گنڈے دار گھمر گھمر، جیسے کہیں چکی چلی رہی ہو۔ میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔ میں نے ٹرانزسٹر بند کیا، موم بتی بجھا دی اور پلنگ پر لیٹ گیا۔ جب میں اونگھ رہا تھا تو خیال پڑتا ہے کہ کوئی آدمی، جو غالباً سائیکل پر ہوگا، میگا فون پر کچھ چلاتا ہوا سڑک سے گزرا۔ کوئی اور پیش گوئی، کوئی اور ڈراوا۔

منہ اندھیرے ہی میری آنکھ کھل گئی۔ میں برسوں سے صبح سویرے اٹھ کر سیر کرنے کا عادی ہوں اور چوں کہ باغ جناح میرے گھر سے دور نہیں اس لیے بلاناغہ وہاں کا چکر لگاتا ہوں۔ میں آنکھیں ملتا ہوا اٹھا اور جوتے پہن کر باہر والے کمری میں آیا تو دیکھا کہ رفیق دری پر لیٹا سو رہا ہے۔ وہ رات کو کسی وقت آیا ہوگا۔

غسل خانے میں بڑی بالٹی میں تھوڑا سا پانی ابھی موجود تھا۔ میں نے منہ پر ایک دو



چھینٹے مارے، کمرے سے چھڑی اٹھائی اور باہر نکل گیا۔ بیڈن روڈ پر اکا دکا لوگ نظر آرہے تھے۔ مال روڈ پر بھی یہی عالم تھا۔ البتہ مسجد شہداء میں خاصے لوگ جمع تھے۔ میں باغ کی طرف چل دیا۔ مال پر جا بجا دکانوں کی نیون سائینس ٹوٹی پڑی تھیں۔

میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا باغ جناح پہنچا۔ نیم تاریک، دھندلی فضا میں ہر طرف درخت سرمئی دھبوں کی طرح ساکت کھڑے تھے۔ مجھے یوں لگا جیسے میں کسی تصویر میں قدم رکھ رہا ہوں۔ سڑکوں پر، روشوں پر، قطعات میں، درختوں پر، راکھ ہی راکھ تھی۔ اور میں وہاں بالکل اکیلا تھا۔

لیکن اتنا اکیلا بھی نہیں۔ جب میں ٹہلتا ہوا کیفے ٹیریا کی طرف جانکلا تو مجھے ایک خاکروب نظر آیا جو جھاڑو ہاتھ میں لیے بے دلی سے سڑک سے راکھ ہٹا رہا تھا۔ مجھے آتا دیکھ کر اس نے جھاڑو دینی بند کردی اور ہاتھ اٹھا کر سلام کیا۔ میں اکثر صبح کو اسے جھاڑو دیتے اور وہ مجھے ٹہلتے دیکھتا تھا۔ اس لیے ہم دونوں صورت آشنا ضرور تھے۔ میں نے ہاتھ ہلا کر سلام کا جواب دیا اور اس کی سامنے جا کر رک گیا۔ میں حیران تھا کہ اس شخص کو آخر کام پر آنے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا اسے اپنے فرض کا اتنا احساس تھا؟ مجھے وہ اچنبھا معلوم ہوا۔ میں نے کہا: ''جھاڑو دینے سے کیا ہوگا؟ راکھ تو ہر جگہ ہے۔ شہر بھر میں کوئی آدمی کام نہیں کر رہا۔ تمھیں کیا سوجھی جو سویرے سویرے جھاڑو لے کر یہاں آدھمکے؟''

اس نے جواب دیا: ''سر جی، خالی بیٹھے بیٹھے میرا دل گھبرا گیا تھا۔ اٹھ کر ادھر چلا آیا۔ جھاڑو تو بہلاوا ہے۔ جیسے آپ کے ہاتھ میں چھڑی ویسے میرے ہاتھ میں جھاڑو۔ سر جی، اب تو وقت پورا کر رہے ہیں۔''

میں نے کہا: ''ہاں، آثار تو کچھ ایسے ہی ہیں۔ مگر، کیا پتا، خطرہ ٹل ہی چکا ہو۔''

یہ سن کر اسے کچھ تعجب ہوا اور وہ کہنے لگا: ''اچھا جی؟ رات تو لوگ کہہ رہے تھے کہ بس آج آخیرلا دن ہے۔ ساری دنیا لپیٹ میں آچکی ہے، ہم کیسے بچے رہیں گے؟ باقی جو رب کرے۔ بچا لے تو بچا لے۔ ویسے، سر جی، دنیا بڑی گندی ہوگئی تھی۔ یہی کچھ ہونا چاہئے تھا۔''

''ہاں، بڑے بڑے ملکوں پر تو جھاڑو پھر گئی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اور کوئی آیا؟''

"نہیں، سر جی، اور تو کوئی نظر نہیں پڑا۔"

میں وہاں سے چلنے کو تھا کہ سرسراہٹ ہوئی، ہر طرف پتے ہلے، راکھ اڑنے لگی۔ ہوا کا ایک تھپیڑا آیا، اتنا گرم جیسے مئی جون کی لو۔ میں ہکا بکا رہ گیا۔ بس ایک ہی جھونکا تھا حبس دوبارہ طاری ہوگیا۔

میں خاکروب کے پاس سے مڑا اور ابھی دو قدم ہی چلا تھا کہ کوئی بڑی سی چیز میرے سر کے پاس سے ہوتی ہوئی ایک کیاری میں جا گری۔ پہلا خیال جو میرے دل میں آیا وہ یہ تھا کہ خاکروب پاگل ہوگیا ہے اور اس نے جھاڑو پھینک کر ماری ہے۔ میرے جسم میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی۔ میں نے خاکروب کی طرف مڑنے سے پہلے کن انکھیوں سے کیاری کی طرف دیکھا اور مڑتے مڑتے رک گیا۔ کیاری میں ایک گدھ اپنے بڑے بڑے بھورے پر پھیلائے، پوٹا زمین پر ٹیکے، پڑا تلملا رہا تھا اس نے اپنی چونچ دو تین بار زمین پر رگڑی اور پھر پھڑک کر مرگیا۔ خاکروب میرے پاس آ کھڑا ہوا تھا۔ ہم دونوں تھوڑی دیر کھڑے گدھ کو دیکھتے رہے۔ پھر میں نے کہا:

"یہاں سے فوراً چلے جانا چاہیے۔" خاکروب نے پوچھا: "سر جی، کہاں؟" اس کا کوئی جواب میرے پاس نہ تھا۔ میں تیز تیز چلنے لگا۔ ذرا دور جا کر میں نے پیچھے دیکھا خاکروب وہیں گدھ کے پاس جھاڑو لیے کھڑا ایک طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے کوئی آدمی اپنے ذمے کا تمام کام نمٹا کر بےفکری سے اپنی کارگزاری کا جائزہ لے رہا ہو۔ میں خوف زدہ ہوکر اور بھی تیز چلنے لگا۔

یکا یک میں نے ایک آدمی کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں سفید چھڑی تھی اور اس نے کالی عینک لگا رکھی تھی۔ وہ بہت آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ اس نے سلیپنگ سوٹ پہن رکھا تھا۔ میں اس کے قریب پہنچا تو مجھے پتا چلا کہ وہ اندھا ہے۔ میری چاپ سن کر وہ رک گیا اور بولا: "کیا آپ بھی سیر کرنے آئے ہیں؟" میرا ارادہ رکنے کا نہیں تھا لیکن مجھے برا لگا کہ میں اسے جواب دیے بغیر گزر جاؤں میں نے کہا: "آیا تو تھا۔"

وہ کہنے لگا: "راستے میں مجھے کوئی آدمی ہی نہیں ملا میں ادھر لارنس روڈ پر رہتا ہوں۔ مجھے میرے لڑکے گھر سے اکیلے آنے جانے نہیں دیتے لیکن آج میں چپکے سے کھسک آیا۔ کسی



نے مجھے دیکھا نہیں یا شاید گھر والے کہیں گئے ہوئے ہیں۔" اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔ وہ بولتا رہا: "سنا ہے بہت بڑی لڑائی ہوئی ہے میں دوسری عالمی جنگ میں برما کے محاذ پر تھا۔ امپھال کا نام آپ نے سنا ہوگا۔ وہاں ہمارے سامنے جاپانی تھے۔ یہاں باغ میں کتنا سکون ہے۔ افسوس اب میں اسے دیکھ نہیں سکتا۔ اس کے حسن کو صرف محسوس کرسکتا ہوں۔ اس کا چپا چپا میری یاد میں محفوظ ہے۔ یہ خوب صورت جگہ ہے۔ ملایا میں بھی میں نے ایک بہت خوب صورت باغ دیکھا تھا۔ نام بھول گیا۔ شاید ابھی یاد آ جائے۔ میں یہاں بہت آیا کرتا تھا۔ میری نوجوانی کی بہت سی اچھی یادیں اس جگہ سے وابستہ ہیں۔ کاش میں اسے کسی طرح دوبارہ دیکھ سکتا۔ اس کی سرسبزی۔ اس کا حسن۔ لیکن اس کے حسن کا لطف اس وقت آتا ہے جب کوئی آپ کے ساتھ ہو۔" اس کی باچھیں کھل گئیں۔" میرا مطلب ہے کوئی حسین ساتھی۔ آپ خوش قسمت ہیں کہ اسے دیکھ سکتے ہیں۔"

میں نے باغ پر نظر دوڑائی۔ راکھ کے فرش اور گھاس کے ہرے تختوں سے درختوں کی پھنگوں تک ہر شے اس طرح دم سادھے کھڑی تھی جیسے کسی ان دیکھے جلاد کی تلوار کے سائے میں کوئی بھبھوت رمائے گردن زدنی میرے حواس متغیر ہونے لگے۔ راکھ پر مجھے بارود کا گمان ہوا۔ مجھے ہر طرف فتیلے بجھے نظر آئے جو دھیرے دھیرے سلگ رہے تھے۔

عین اسی وقت ایک اور زور کا جھونکا آیا، اتنا گرم جیسے سیدھا کسی تنور سے آیا ہو۔ میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے، جسم میں سوئیاں سے چبھنے لگیں، حلق خشک ہوگیا مجھے چکر آنے لگے۔ میرا جی چاہا کہ اپنے کپڑے پھاڑ ڈالوں۔ اندھے کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ اس نے حیران ہوکر پوچھا: "کیا یہاں کوئی چیز جلائی جارہی ہے؟"

میں جواب دیے بغیر وہاں سے دوڑ پڑا۔ دوڑنے کی عادت نہ ہونے کے وجہ سے جلد ہی میری سانس پھول گئی۔ مجھے رکنا پڑا۔ دو تین منٹ ستانے کے بعد میں ڈگ بھرتا ہوا گھر کی طرف چل دیا۔ میں جلد از جلد کسی اوٹ میں، دیواروں کے پیچھے کسی نہ کسی جائے پناہ تک پہنچنا چاہتا تھا تاکہ اگلے تھپیڑے سے بچ سکوں۔ مال روڈ پر چلتے ہوئے میں نے دیکھا کہ اندھیرا بڑھتا جارہا تھا۔ راکھ دوبارہ برسنی شروع ہوگئی تھی۔

# تنہائی کے مکان میں

ہم جو چار پہر کے دن کے عادی ہیں، ہمارے حسابوں سہ پہر ہوگئی ہے۔ لیکن یہاں سہ پہر میں ہی رات کا سماں ہے اور ہم روشنیوں، خوشبوؤں اور آوازوں کے درمیان ہیں اور ان آوازوں میں سب سے غالب آواز بن بری کی ہے۔

مہاتما بدھ نے کہا تھا کہ ''وہ ایک لفظ جسے سن کر انسان خاموش ہوجائے اور اُس کی جہتوں میں ڈوب جائے، وہ ان ہزار لفظوں سے بہتر ہے جو کوئی مفہوم ومعنی نہ رکھتے ہوں۔''
بن بری کو خاصے عرصے سے مہاتما بدھ کی کہی ہوئی باتیں دُہرانے کا شوق ہے، اُس نے یہ اشلوک مجھے کئی مرتبہ سنایا ہے لیکن اداکاری کرتے کرتے وہ شاید لفظوں اور جملوں کو محض دہرانے کا عادی ہوگیا ہے۔

وہ میز پر دونوں کہنیاں رکھ کر آگے کی طرف جُھکتا ہے۔ ''خواہشوں اور خوابوں کی دہلیز پر کھڑی ہوئی رات، ایک آنکھ سے روتی اور ایک آنکھ سے ہنستی ہے۔ وہ روتی ہے اور ہم غم کے سمندر میں اُترتے ہیں، وہ ہنستی ہے اور ہم لذت کے بادلوں کو اوڑھ لیتے ہیں۔''
ماسومی سر جھکائے اپنے لبریز پیالے کی سطح پر بنتے اور بگڑتے ہوئے عکس دیکھ رہی ہے۔ اس کے چہرے میں اور مہاتما بدھ کے اُس مجسمے میں کوئی فرق نہیں جو ہمارے اپارٹمنٹ کے سب سے اونچے طاق پر رکھا ہے اور جس کے قدموں میں کبھی ماسومی اور کبھی میں، تازہ پھول رکھ دیتے ہیں۔ ویسا ہی سمندر گہرا۔

ہماری برابر کی میز پر بیٹھا ہوا ایرانی لڑکا جو براڈ کاسٹنگ ہاؤس کی میوزک لائبریری کا انچارج ہے اور اکثر یہاں نظر آتا ہے، اچانک کھڑا ہوجاتا ہے۔ اُس کا ساتھی اسے بٹھانے کی





کوشش کرتا ہے لیکن وہ اُس کا ہاتھ جھٹک دیتا ہے اور اونچی آواز میں ایک نظم سنانے لگتا ہے۔

کوچوں میں لہو
اور غیظ وغضب گھروں کے اندر
اُنہوں نے پرانی قبروں میں
نوجوان کنواریوں کو دفنایا ہے
اور عشق سے پُر، خوش نما سینوں میں
گولی رہتی ہے
دہشت برسرِ بام گنگناتی ہے
اور موت جشن مناتی ہے

لڑکا آخری دو سطروں کو دہراتا ہے اور چہرے پر پھسلنے والے آنسوؤں کو ہاتھ کی پشت سے پونچھتا ہے۔ اُس کا ساتھی ابھی ہوش میں ہے، اس لیے جھینپ رہا ہے۔ آس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے ایک دو سر ہلا کر داد دیتے ہیں۔

بن بری گردن گھما کر اُس لڑکے کو دیکھتا رہتا ہے پھر ہماری طرف رخ کرتا ہے اور اپنی ہتھیلیوں کے پیالے میں اپنا چہرہ رکھ لیتا ہے۔ ''جشن میں تو روشنیاں ہوتی ہیں، رنگ ہوتے ہیں، موت بھلا کیسے جشن مناتی ہے؟ کون سا رنگ پہنتی ہے اور کون سی خوشبو لگاتی ہے؟''

''یہ مشکل مسئلے ہیں، تم نہیں سمجھو گے۔ ان مسئلوں کو ایرانیوں، ویت نامیوں اور افریقیوں کے لیے چھوڑ دو۔'' ماسومی کے لہجے میں ہلکی سی چبھن ہے۔

بن بری اُس کی بات پوری سنتا ہے جیسے سنی ہی نہ ہو۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوتا ہے۔
''سنو! کیا روشنی اب بھی ایک سیکنڈ میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار دو سو بیاسی میل کی رفتار سے سفر کرتی ہے؟''

''ہاں، اسکول میں تو یہی پڑھا تھا، ہوسکتا ہے اب اُس کی رفتار میں کچھ اضافہ ہوگیا ہو۔''
میں اپنے شک کا اظہار کرتی ہوں۔

''کبھی تم نے سوچا کہ رفتار کے ساتھ تصادم کا تصور اُبھرتا ہے تو پھر اس رفتار سے سفر

کرتی ہوئی روشنی آس پاس کی چیزوں کو تہس نہس کیوں نہیں کر دیتی؟ اچھا چلو، مانے لیتا ہوں کہ اس میں رفتار ہے، طاقت نہیں، تو پھر یہ گلیوں اور بازاروں میں، گھروں میں اور ماسومی کی آنکھوں میں ٹھہری ہوئی کیوں رہتی ہے؟ سفر کرنے والی چیزیں قیام تو نہیں کرتیں، نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔"

بن بری کا سوال مجھے بھی اُلجھا دیتا ہے۔ یہ شاید فزکس کا مسئلہ ہے یا شاید میتھمیٹکس کا؟...... میں ان دونوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتی اس لیے خاموش رہتی ہوں۔ ماسومی نگاہیں اٹھا کر بن بری کو دیکھتی ہے لیکن وہ بھی کچھ نہیں کہتی۔ بن بری تیسرے پیگ کے بعد جب کلام کرتا ہے تو ہم میں سے کوئی بھی اس کی بات کو دھیان سے نہیں سنتا۔ اس وقت یوں بھی سب اپنے اپنے خوابوں کو اپنے پیالوں میں ڈبو رہے ہیں۔ سب انہیں چھو رہے ہیں، چکھ رہے ہیں اور خواب، شراب کے گھونٹ کی طرح زندگی کے معدے میں اُتر رہے ہیں اور معدوم ہو رہے ہیں۔

میں پیالے کے لب پر لپ اسٹک کے مدّھم سے نشان کو دیکھتی ہوں اور ماسومی تو آج جانے کہاں ہے؟ اپنے آپ میں اس قدر گم تو میں نے اُسے کبھی نہیں دیکھا۔ یوں بھی آج وہ آئی کب ہے، زبردستی لائی گئی ہے۔

نیشنل تھیٹر بار میں اس وقت غضب کی ہماہمی ہے۔ لوگ کرسیوں پر اور صوفوں پر بیٹھے ہوئے ہیں، جنہیں کوئی نشست نہیں ملی وہ آلتی پالتی مار کر اپنے پیالے سامنے رکھ کر قالین پر ہی بیٹھ گئے ہیں اور بے تکان بول رہے ہیں۔ اُن کے ہونٹوں سے ادا ہونے والے لفظ سگریٹ کے دھوئیں اور تنفس کی گرمی پر ٹکے ہوئے ہیں اور ہر طرف نیلگوں دھند ہے۔

اس شور اور دُھند سے گھبرا کر میں باہر دیکھتی ہوں۔ شیشے کے دیوار کے ادھر لکڑی کی بنچیں اور مستطیل میزیں خالی پڑی ہیں۔ پھر ہم تینوں اپنے اپنے پیالے اٹھا کر فلپینو بار میڈ سے اجازت لیتے ہیں اور باہر چلے جاتے ہیں۔

ہوا دریا میں نہا کر آتی ہے اور اُس کا پنڈا ٹھنڈا ہے۔ وہ بدن سے لپٹتی ہے تو لحظہ بھر کے لیے کپکپی سی دوڑ جاتی ہے۔ ہم لکڑی کی بنچوں پر جا بیٹھتے ہیں۔ دریا کے اُس پار سینٹ پال ہے



جس کا گنبد اور کلس نیچے سے اوپر کی طرف سفر کرنے والی روشنیوں میں ڈوب کر چاندی میں ڈھل گیا ہے۔

ماسومی اپنے گلے میں پڑی ہوئی طلائی زنجیروں میں پروئی، ہوئی چھوٹی سی گھڑی کو جھلاتی ہے اور وہ پنڈولم کی طرح حرکت کرنے لگتی ہے۔ میں خاموشی سے اُس کی حرکت کو دیکھتی رہتی ہوں۔ ایک گھڑی اُس کی کلائی پر ہے جو چلتی رہتی ہے اور ایک گھڑی اُس کے گلے کی طلائی زنجیر میں ہے، جس کے ننھے سے ڈائل پر رومن ہند سے ہیں۔ اس کا رنگ اُڑا ہوا ہے اور اُسے میں نے آج تک چلتے نہیں دیکھا۔

ہم تھوڑی دیر لکڑی کی بنچوں پر بیٹھے رہتے ہیں، پھر بن بری اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ "دریا تو اب بھی دُور ہے۔ وہ ہمیں آوازیں دے رہا ہے۔ آؤ ہم چل کر اُس تک جائیں اور اُسے سلام کریں۔"

بن بری کی باتیں اسی وضع کی ہوتی ہیں۔ کوئی اجنبی اُسے کلام کرتے ہوئے سنے تو مجذوب جانے۔ اسٹیج پر غیر اہم کردار ادا کرتے ہوئے وہ اہم کردار کرنے کے خواب دیکھتا ہے۔ اُس کی باتیں بھی گویا مکالمے ہیں جن کی ادائیگی میں وہ آواز کے زیر و بم کا خیال رکھتا ہے۔ اسٹیج پر اداکاری کے جوہر دکھانے والوں کو اُن کے ناظرین نہیں ٹوکتے، ورنہ وہ مکالمے بھول جائیں، اسی لیے ماسومی اور میں، ہم دونوں اُس سے بحث نہیں کرتے۔ اس وقت بھی ہم کچھ کہے بغیر اپنی نشستوں سے اٹھ کر پختہ فرش پر چلتے ہوئے اُس دیوار تک جاتے ہیں جس کے سائے میں دریا آرام کرتا ہے۔

میں جھک کر نیچے دیکھتی ہوں، ٹیمز کے چوڑے سینے میں رات ٹھہری ہوئی ہے اور اُس کے حاشیوں پر دُودھیا اور عنبریں روشنیاں ہیں۔ دریا کے تنفس کے ساتھ ہی روشنیاں بھی سانس لے رہی ہیں اور ہماری آنکھوں کی پتلیوں میں پگھلتی ہوئی چاندی اور گھلتے ہوئے سونے کے رنگ اُتر رہے ہیں۔

بن بری دیوار کی منڈیر پر جھک جاتا ہے پھر وہ ہونٹوں کے گرد ہاتھوں کا پیالہ بناتا ہے اور بلند آواز سے دریا کو سلام کرتا ہے۔ اُس کی آواز کچھ دور جا کر کھو جاتی ہے، بس کنارے سے

دریا کی لہروں کے ٹکرانے کی مدّھم آواز رہ جاتی ہے۔

"سنو، دریا ہم سے کلام کرتا ہے۔" بن بری مُڑ کر ماسومی سے مخاطب ہوتا ہے۔

"درست کہتے ہو، دریا ہم سے کلام کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے میرا پانی گیہوں کی بالیوں میں، سنگتروں کی قاشوں میں اور بادلوں کے ٹکڑوں میں رہتا ہے۔ تمہاری پیاس مجھ سے بجھتی ہے، تمہاری غلاظت مجھ سے دُھلتی ہے اور اس کے عوض تم مجھے برباد کرتے ہو، مجھ میں زہر انڈیلتے ہو، مجھے لاشوں سے بھر دیتے ہو۔"

ماسومی کے جملوں سے شہد ٹپکتا ہے، لیکن آج اس کی آواز حنظل کا پکا ہوا پھل ہے۔ میں اور بن بری چونک کر اسے دیکھتے ہیں اور دیکھتے ہی رہتے ہیں۔ اس کی طبیعت شاید زیادہ ہی خراب ہے۔ تب ہی آج شام وہ ہمارے ساتھ آنے کے لیے رضا مند بھی نہ تھی لیکن بن بری کے آگے کسی کی ایک نہیں چلتی اور ماسومی پر تو یوں بھی وہ ڈرامائی انداز میں فدا ہے۔ ماسومی پر ابھی تک اُس کی وارفتگی کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ اُس کے لیے ایک گوشۂ رعایت رکھتی ہے۔

بن بری اور ماسومی کے درمیان اکثر میں بھی خود کو کسی ڈرامے کا کردار محسوس کرتی ہوں۔ کسی وکٹورین ڈرامے کی "شیپر ان" وہ اس کے ساتھ ریستورانوں میں جاتی ہے، ڈرامے دیکھتی ہے، چہل قدمی اور شراب نوشی کے لیے نکلتی ہے لیکن ان تمام محفلوں اور یکجائیوں میں، میرا ساتھ ایک ایسی شرط ہے جس پر میں شرمسار رہتی ہوں اور بن بری مطمئن۔ میں نے کئی مرتبہ اس مثلث کا ایک ضلع بننے سے انکار کیا لیکن ماسومی اُس کے لیے تیار نہیں اور بن بری کو بھی بظاہر اس صورت حال پر کوئی اعتراض نہیں۔ شاید وہ جانتا ہے کہ ان محفلوں کا میرے بغیر ہونا ممکن نہیں، چنانچہ یہ تکون تقریباً سال بھر سے نہایت استقامت سے قائم ہے اور اُس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ماسومی اور میں، دونوں ایک ہی فلیٹ میں رہتے ہیں اور ایک ہی ادارے میں کام کرتے ہیں۔

اس وقت ماسومی کی آواز کا حنظل ہم چپ چاپ کھا لیتے ہیں اور شاید ہماری خاموشی اُس سے بہت کچھ کہہ جاتی ہے۔ تب ہی چند لمحوں کے بعد وہ ہم سے معذرت کرتی ہے اور ہم اُس کی معذرت کو بھی خاموشی کی چادر میں لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیتے ہیں۔



ہم تینوں اپنے اپنے خیالات میں گم ہیں اور دریا کی لہروں کو، روشنیوں اور سایوں کو دیکھ رہے ہیں، پھر ہم وہاں سے روانہ ہوجاتے ہیں۔ بن بری نے ہمارے لیے کسی فلم کی بکنگ کروا رکھی ہے۔ یہ تو ہمیں لیسٹر اسکوائر پہنچ کر معلوم ہوتا ہے کہ بکنگ FULL METAL JACKET کی ہے جس کے سارے شہر میں دھوم ہے اور جس کے ٹکٹ دُگنے اور تگنے داموں ل رہے ہیں۔

ہم سیڑھیاں اُتر کر پکچر ہال میں داخل ہوتے ہیں تو فلم شروع ہو چکی ہے اور اسکرین پر قدم سے قدم ملا کر بہت سے نوجوان چل رہے ہیں۔ ان میں سے بہتوں کی ابھی مونچھیں بھی ڈھنگ سے نہیں نکلیں۔ ہم اندھیرے میں ٹٹولتے ہوئے نشستوں پر بیٹھ جاتے ہیں۔ وہ لڑکے جن کی انگلیاں زندگی لکھنے کے لیے تھیں، اُن کی وہی انگلیاں رائفل کی لبلبی پر ہیں اور موت سے کھیلنے کے لیے بیتاب ہیں۔ وہ کوئی رومانی گیت گنگنانے کے بجائے میکانکی آواز میں چیختے ہوئے باغ سے گزر رہے ہیں۔ اُن کی کھوکھلی آوازیں سارے ہال میں گونج رہی ہیں۔

دنیا میں یوں تو اور بہت سی رائفلیں ہیں
لیکن یہ میری رائفل ہے
یہ میری اپنی ہے
یہ میری زندگی ہے
یہ میرے دشمن کو ہلاک کرے گی
میں اس کے عشق میں گرفتار ہوں
اس کے ساتھ میں شب بسری کرتا ہوں

ہم تینوں زومبیوں کی طرح اسکرین کو دیکھ رہے ہیں، جہاں شہر جل رہے ہیں، انسانوں کے چیتھڑے اُڑ رہے ہیں، آٹھ اور نو برس کے بچے فوجیوں سے اپنی بہنوں، ماؤں اور بیوہ بھاوجوں کا سودا کر رہے ہیں اور انسان کسی کونے میں گھٹنوں میں منہ چھپائے بیٹھا ہے اور غیر انسانی آواز میں رو رہا ہے۔

انٹرول ہوتا ہے لیکن ہم تینوں میں سے کوئی اپنی جگہ سے نہیں ہلتا۔ ہم نے لاشوں کے جتنے عکس دیکھے ہیں، اُس کے بعد کھانا محال ہے۔ ہم نے جتنی چیخیں سنی ہیں اُس کے بعد بولنا ممکن نہیں۔ کچھ منظر آپ سے کلام کی صلاحیت چھین لیتے ہیں۔ کیا کلام کریں؟ کس سے کلام کریں؟ کلام انسانوں سے کیا جاتا ہے اور یہاں چلتی پھرتی لاشیں ہیں، بولتے ہوئے مُردے ہیں۔ باتیں انسانوں سے کی جاتی ہیں اور یہاں زومبیوں کی قطاریں ہیں۔ ہم ہر چیز کو دیکھتے ہیں اور اس کے پیچھے اصل چہرے ڈھونڈتے ہیں۔ بھیڑیوں، لکڑبگھوں، شیروں، چیتوں اور گھڑیالوں کے چہرے۔

فلم شہروں اور انسانوں کی موت پر ختم ہو جاتی ہے۔ ہم ہال سے باہر آتے ہیں۔ سیڑھیوں کے ساتھ کی دیوار آئینوں سے ڈھکی ہوئی ہے۔ ہم ان آئینوں کی طرف نہیں دیکھتے۔ کہیں ہم سے اپنا آپ نہ پہچانا جائے۔ ہم چُپ چاپ چلتے رہتے ہیں۔ ماسوی گھر واپس جانا چاہتی ہے لیکن بن بری کا کہنا ہے کہ اُس نے ہمارے لیے کھانے کا اہتمام کیا ہے، سو ہم اس کے فلیٹ چلیں۔ آخر کار ہم دونوں ہار جاتے ہیں اور لیسٹرا اسکوائر سے ناردرن لائن میں سوار ہو جاتے ہیں، مارننگٹن کریسنٹ کے لیے، جہاں سے بن بری کا فلیٹ چند منٹ کے فاصلے پر ہے۔

یہاں ہم اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ آ چکے ہیں، اس لیے فلیٹ کی وہ دیوار ہمارے لیے اجنبی نہیں جس پر طرح طرح کے مکھوٹے آویزاں ہیں۔ میں دو قدم آگے بڑھ کر دیکھتی ہوں تو میری نظر اُس دائرہ نما ڈائننگ ٹیبل پر پڑتی ہے جو چار افراد کے لیے ہے اور جس کے گرد بیٹھ کر ہم نے کئی مرتبہ بن بری کے پکائے ہوئے کھانے کھائے ہیں۔ آج اس ڈائننگ ٹیبل پر سفید لیس کا بہت خوبصورت میز پوش بچھا ہوا ہے۔ اس تمام سفیدی کے درمیان گلابی آئسنگ کا ایک کیک ہے جس پر گہرے گلابی رنگ سے کچھ لکھا ہوا ہے۔

میں ذرا حیرت سے آگے بڑھ کر شکر کی اس تحریر کو پڑھتی ہوں اور ہنستے ہوئے بن بری کی طرف بڑھتی ہوں۔

”کمال ہے، تم دونوں نے مجھے کچھ بتایا ہی نہیں۔ یہ تو زیادتی کی بات ہے۔“ میرا لہجہ شکایت آمیز ہے اور پھر میں سوالیہ انداز میں ماسوی کو دیکھتی ہوں۔



ماسوی کی آنکھوں میں اُلجھن تیر جاتی ہے۔ وہ آگے بڑھ کر سفید میز پر رکھے ہوئے گلابی کیک اور سفید پھولوں کو دیکھتی ہے۔ اچانک اُس کا چہرہ سفید پڑ جاتا ہے۔

”تمہیں کیسے معلوم ہوا؟ بتاؤ کیسے معلوم ہوا تمہیں؟“ ماسوی ایک جھٹکے سے بن بری کی طرف مڑ جاتی ہے اور اُس لحظہ اُس کی آواز قطعاً غیر انسانی ہے۔

”میں نے تمہارا پاسپورٹ دیکھا تھا ماسوی! لیکن ڈیر......“ بن بری اُس کی آواز کی اجنبیت سے گھبرا جاتا ہے۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ سفید لیس سے ڈھکی ہوئی میز پر رکھا ہوا گلابی کیک بتاتا ہے کہ آج ماسوی کا جنم دن ہے۔ میں اُس کی طرف دیکھتی ہوں۔ اس کی مٹھیاں بھنچی ہوئی ہیں اور وہ کیک کو عجیب انداز سے دیکھتی ہے۔

اُس لمحے مجھے احساس ہوتا کہ کہیں کوئی سنگین گڑبڑ ہے۔ ماسوی کو میں بازو سے تھام کر صوفے کی طرف لے چلتی ہوں۔ ”آؤ پہلے یہاں بیٹھ تو جاؤ۔“

بن بری میری طرف شکر گزار نظروں سے دیکھتا ہے اور منہ سے ایک لفظ نکالے بغیر، ہماری طرف پیٹھ کر کے دیوار گیر کیبنٹ سے وائن کی بوتل اور پیالے نکالنے لگتا ہے۔ چند لمحوں بعد وہ سرخ وائن کے پیالے بڑھاتا ہے۔ ماسوی پیالہ تھام لیتی ہے اُس کی مرتعش سطح کو غور سے دیکھتی ہے۔ پھر سر اٹھا کر بن بری پر نظر ڈالتی ہے۔

”میں تمہیں اس قدر بے حس اور سنگدل نہیں سمجھتی تھی۔“ اُس کا لہجہ ٹھنڈا اور اجنبی ہے۔

بن بری گڑبڑا کر اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن ماسوی اُس کا جملہ کاٹ دیتی ہے۔ ”تمہیں میرے پاسپورٹ میں لکھی ہوئی تاریخ پیدائش تو یاد رہی لیکن اُس میں دوسری باتیں بھی تو لکھی ہوئی تھیں۔“ اُس کا لہجہ کٹیلا ہے۔

کٹہرے میں کھڑے ہوئے مجرم کی سی کیفیت بن بری کے چہرے پر ہے۔ میں قدرے جھنجلا جاتی ہوں۔ ”تم نہ جانے کن پہیلیوں میں بات کر رہی ہو۔ آخر بن بری سے ایسا کون سا جرم سرزد ہو گیا ہے؟“

”اگر کوئی نہ سمجھنا چاہے تو سامنے کی باتیں بھی پہیلیاں بن جاتی ہیں۔“

ماسوی کا لہجہ کڑوا ہے اور اُس کی انگلیاں گلے کی زنجیروں میں پڑی ہوئی گھڑی کو ہلا رہی ہیں اور وہ پرانی اور بند گھڑی کسی پنڈولم کی طرح حرکت کر رہی ہے۔

''اس گھڑی کو دیکھ رہی ہو؟ یہ ایک بند گھڑی ہے۔ بہت پرانی، میری سالگرہ کا آخری تحفہ۔ اس میں ہمیشہ سوا آٹھ بجتے ہیں۔ رات کے نہیں، صبح کے سوا آٹھ۔'' اُس کی آواز پر ہر کیفیت اور ہر جذبے سے عاری ہے۔

''میں نے اس کے بارے میں تم سے کئی مرتبہ پوچھنا چاہا، لیکن پھر اچھا نہیں لگا۔'' میں اُس گھڑی کو غور سے دیکھتی ہوں، وقت جس میں ٹھہرا ہوا ہے۔

''بن بری، آؤ میرے سامنے بیٹھ جاؤ۔ تم ڈرامے کے عاشق ہو، سو میں آج تمہیں ایک ڈراما سناتی ہوں۔ تاریخ کی راہداری میں کھیلی جانے والی ایک ٹریجڈی۔'' وہ بن بری کو اشارہ کرتی ہے اور وہ کسی معمول کی طرح اُس کے سامنے جا بیٹھتا ہے۔

''نہیں شاید میں نے غلط کہا۔ میں تمہیں ڈراما نہیں، زندگی، سنانا چاہتی ہوں۔ کہانیاں یا ڈرامے، زندگی کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ ان کے رنگ، ان میں سانس لیتا ہوا خوف اور ان کا ڈرامائی عنصر سب پھیکا نظر آتا ہے۔ زندگی سے بڑا ڈراما تو آج تک تحریر ہی نہیں ہوا۔'' وہ جیسے خود کلامی کر رہی ہے۔

''اُس روز صبح سے گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ شام کو میری سالگرہ تھی، اس لیے میں منہ اندھیرے اُٹھ گئی تھی۔ ماں نے گزشتہ رات میرے گلابی لباس پر گہرے گلابی پھول ٹانکے تھے اور اب منہ اندھیرے سے وہ کیک بنانے میں مصروف تھی۔ باپ نے دفتر جانے سے پہلے مجھے پیار کیا تھا اور میرے گلے میں ایک زنجیر پہنا دی تھی جس میں ایک چھوٹی سے گھڑی تھی۔ بڑے بھائی بہن اسکول چلے گئے تھے لیکن میری طبیعت ٹھیک نہ تھی اس لیے میں گھر پر تھی۔ سب کے جانے کے بعد گھر پر گہرا سناٹا چھا گیا۔ میں آدھا دھڑ کھڑکی سے باہر نکالے ہوئے پچھواڑے کے باغ میں جھانک رہی تھی کہ اچانک بوندا باندی شروع ہوگئی۔ میں نے آواز دے کر ماں کو یہ بات بتائی تو وہ الگنی پر پڑے ہوئے کپڑے اُتارنے کے لیے باہر چلی گئی۔

''میں نے ماں کو جلدی جلدی کپڑے سمیٹتے ہوئے دیکھا، پھر میں نے سر اُٹھا کر بادلوں کو




دیکھنا چاہا۔ وہاں بادلوں کے ساتھ ساتھ تین بڑے غبارے تیر رہے تھے، اچانک سارا آسمان گلابی روشنی سے بھر گیا اور روشنی رنگ بدلنے لگی۔ نیلا، گلابی، سرخ، بھورا، زرد اور کاسنی۔ اُسی لمحے میں نے ماں کی چیخ سُنی۔ میں نے دیکھا اُس کے ہاتھ میں سمٹے ہوئے کپڑے جانے کہاں چلے گئے تھے اور وہ خود سوکھی ہوئی لکڑی کی طرح جل رہی تھی۔ میں نے چیخنا چاہا لیکن میرے اندر آواز نہیں رہی تھی۔ میری کہنیوں کے نیچے سے کھڑکی کی چوکھٹ کہیں چلی گئی تھی اور میں اڑ رہی تھی۔ پھر میں سبزے پر ماں کے قریب جا گری۔ آگ میرے بدن کے اندر سے گزر رہی تھی۔''

ماسوی اپنی ماں کے اور اپنے بارے میں اس لاتعلقی سے باتیں کر رہی ہے جیسے کسی اور پر گزرے ہوئے واقعات دہرا رہی ہو۔ سچ کا سورج ہم پر طلوع ہو رہا ہے اور ہماری آنکھوں کی بینائی چھین رہا ہے۔ میرے ہاتھ میں پیالہ کانپنے لگتا ہے میں اُسے غور سے دیکھتی ہوں۔ اُس میں خون چھلک رہا ہے میرے ہاتھوں کی لرزش بڑھ جاتی ہے اور اُس میں سے چند قطرے قالین پر گر جاتے ہیں۔

ایک گہری سانس لینے کے بعد ماسوی کہتی ہے۔ ''میری آنکھ کھلی تو میں سیاہ سبزے پر تھی۔ میرے گھر کی دیواریں نہیں تھیں۔ چھت نہیں تھی۔ ماں نہیں تھی۔ آس پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ بس آگ تھی، دُھواں تھا۔ میں نے اُٹھ کر چلنا چاہا تو میرے پاؤں جلے ہوئے تھے اور آنکھیں سوج کر آدھی بند ہوگئی تھیں۔ گلی جانے کہاں چلی گئی تھی۔ راستے بھی نہیں رہے تھے۔ لوگ بے نور آنکھوں سے دیکھتے ہوئے اور جھلسے ہوئے پیروں سے چلتے ہوئے، سر جھکائے کسی ایک طرف جا رہے تھے۔ شاید وہی راستہ تھا۔ اُن لوگوں کے بدن پر کپڑے نہیں چیتھڑے تھے۔ لاوے کی طرح اُبلتا ہوا گوشت، چہروں، ہاتھوں اور پیروں سے لٹکتی ہوئی کھال۔ میرے بدن پر بھی کچھ نہ تھا، بس یہ گھڑی تھی جو میری گردن سے لپٹی ہوئی تھی۔ میں اپنے باپ کے ہاتھ کی طرح، اپنی ماں کی انگلی کی طرح اسے اپنی مٹھی میں دبائے اندھوں کی طرح چلتی رہی۔ میں پیاس سے مر رہی تھی، سب ہی پیاس سے مر رہے تھے۔ میں پانی کے لیے رو رہی تھی۔ سب ہی پانی کے لیے رو رہے تھے اور اندھوں کی طرح بغیر دیکھے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ میرے شہر میں سات دریا بہتے تھے لیکن ہمارے اندر ایسی پیاس بھڑکتی تھی کہ اُن کا پانی بھی اُسے بجھانے

کے لیے کافی نہ تھا۔ تمہارے لیے ٹیمز میں روشنیاں اور خوشیاں تیرتی ہیں اور میں نے پانی کے لیے ترستے ہوئے اور تپش سے جھلستے ہوئے لوگوں کی لاشوں سے بھرے ہوئے دریا دیکھے ہیں۔"
ماسومی آواز جھرجھرا رہی ہے اور آنکھیں خشک ہیں۔ اُس کے آنسو بن بری کی اور میری آنکھوں سے بہہ رہے ہیں۔

وہ اُٹھتی ہے اور اُس گول میز تک جاتی ہے جس پر گلابی کیک ہے اور جس کے چہرے پر گہری گلابی شکر سے ماسومی کا نام اور "سالگرہ مبارک" کڑھا ہوا ہے۔

بن بری اُسے وہاں کھڑا دیکھ کر دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپالیتا ہے۔ اُس کے شانے لرز رہے ہیں اور میری آنکھوں کی دُھندلاہٹ گہری ہوجاتی ہے۔ اُس دُھند میں لفظ تیرنے لگتے ہیں۔

ماں! میں بن شعلوں کی آگ میں جلی
میں نے ایک ایسے زخم کا درد سہا
جس سے خون نہیں بہتا
ماں! میرا کھانا پینا
ذائقوں سے ناآشنا تھا
اور میری شب بسری
لذتوں سے ہمکنار نہ تھی
اور ماں! میری زندگی
زندہ تو تھی لیکن مکمل موت تھی

یہ نظم ماسومی کے کمرے کی دیوار پر آویزاں ہے اور اسے میں نے اتنی مرتبہ پڑھا ہے کہ مجھے ازبر ہوگئی ہے۔

ماسومی ہماری طرف مُڑتی ہے۔ "جب میں ٹوکیو میں تھی تو مجھ سے پہلی بار محبت کی گئی۔ اُس شام ہم دونوں چہل قدمی کے لیے نکلے تھے۔ شام ہو رہی تھی اور ہم سبزے پر چل رہے تھے جس پر پیڑوں سے گرے ہوئے سفید پھول بچھے ہوئے تھے، اچانک اُس نے مجھے اپنی



باہنوں میں سمیٹ کر میرا بوسہ لیا۔ ہم اُس بوسے کی گہرائی میں ڈوب گئے۔ پھر اچانک ایک جھٹکے سے وہ مجھ سے الگ ہوگیا۔ میں نے آنکھیں کھول کر اُسے دیکھا میری نظر اُس کے ہونٹوں پر پڑی، وہ سرخ تھے۔ اُن میں خون لگا ہوا تھا۔
"میں ٹھنڈی پڑگئی، مجھے اپنے منہ میں نمکین ذائقے کا احساس ہوا۔ بوسے کی شدت نے میرے مسوڑھوں کے زخم کو کھول دیے تھے۔ مجھے ڈاکٹر کی ہدایات یاد آئیں۔ میں نے بے اختیار زمین پر تھوک دیا اور سبز گھاس پر سفید پھولوں کے درمیان میرا خون پھول کی طرح کھل اٹھا۔ وہ چند لمحوں تک مجھے یوں دیکھتا رہا جیسے اُس نے کسی چڑیل کو دیکھ لیا ہو۔ اُس پر لرزہ طاری تھا، پھر وہ "ہیبا کوشا...... ہیبا کوشا" کہتا ہوا وہاں سے بھاگتا چلا گیا اور میں مسوڑھوں سے بہتے ہوئے خون اور سبزے پر تھوکے جانے والے بوسے کے ساتھ تنہا رہ گئی......"

تنہائی کے مکان میں رہنے والی ماسومی ہنستی ہے اور میرے کانوں میں آگ ٹپکنے لگتی ہے۔ "جانتے ہو بن بری جاپانی میں ایٹمی حملے سے متاثر ہونے والوں کو "ہیبا کوشا" کہا جاتا ہے۔ مجھ میں زہر گھلا ہوا ہے۔ میں اپنے بعد کی نسلوں کو بھی زہر بانٹوں گی۔"

میں بن بری کو اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے دیکھتی ہوں، وہ شاید ہم سے اپنی اُبکائیاں چھپانا چاہتا ہے۔ اُس کے سٹنگ روم کی دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کی کھڑکی کھلتی ہے۔ کھڑکی میں سے ایک ننھی سی چڑیا سر نکالتی ہے۔ میں پنڈولیم کی زنجیر کو ہلتے ہوئے اور چڑیا کو چہکتے ہوئے سنتی ہوں۔ ۶ااگست کے ختم ہونے میں بس ایک گھنٹہ رہ گیا ہے، لیکن یہ دن زندہ کہاں رہا ہے، یہ تو برسوں پہلے قتل کیا جاچکا۔ اس کے ٹھٹھری ہوئی لاش اس وقت بھی ماسومی کے گلے میں جھول رہی ہے اور اُس کی کھلی ہوئی آنکھیں مجھے تک رہی ہیں۔ میں گھبرا کر اپنی آنکھیں مُوند لیتی ہوں۔ اُس مقتول دن کی کھلی ہوئی آنکھوں سے کوئی نگاہیں کیسے چار کرسکتا ہے؟

ایک دفعہ میری بیوی نے راز داری کے ساتھ مجھ سے کہا: ''میں سمجھتی ہوں کہ ہم بھی غلام پیدا کرنے والے ہیں۔''

میری باچھیں کھل گئیں اور میں نے کہا، ''تم مادّی حالتوں کا ہمیشہ غلط اندازہ کرتی ہو۔ اس مرتبہ بھی غلطی پر ہو، نیک بخت۔''

کہنے لگی، ''یقین جانو میں غلطی پر نہیں ہوں۔ اس مرتبہ غلام میرے پیٹ میں پہنچ چکا ہے۔'' مجھے اب بھی اس کا یقین نہیں تھا۔ میں نے کہا ''زہرہ فونا نے ایسی ہی ہوائی اُڑاتی تھی۔ تم پر زہرہ فونا کا سایہ تو نہیں پڑ گیا ہے؟''

وہ روٹھ گئی اور کہنے لگی ''تم نہیں مانتے، ٹھہرو میں آتی ہوں۔''

وہ یہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

میں نے پوچھا ''بخت آور کدھر؟''

کہنے لگی ''دائی کے پاس''

''وہ کیا بلا ہوتی ہے؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

وہ ہنستے ہوئے کہنے لگی۔ '' بالکل بے وقوف ہو۔ دائی بھی نہیں سمجھتے؟''

میں نے کہا ''میرے بے وقوف ہونے میں کوئی شک نہیں، تبھی تو تم سے نبھا کرتا چلا آرہا ہوں''

وہ آہستہ سے کہنے لگی ''وہ جو غلام کو پیٹ سے نکل کر میدان میں آنے میں مدد کرتی ہے۔''

میں نے کہا ''لیکن تم اس وقت اُس ہول سیل کے بیوپاری کے پاس کیوں جا رہی ہو؟''

''تصدیق کرانے'' یہ کہہ کر وہ چلی گئی اور میں اُس کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد وہ واپس آئی تو بہت خوش نظر آ رہی تھی۔

میں نے پوچھا ''ہول سیل کے بیوپاری نے کیا کہا؟''

وہ خوشی سے چہک اٹھی ''ہاں، ہم بھی غلام پیدا کریں گے''

''سچ!'' میں نے اُسے بانہوں میں بھر لیا۔

رحمت اللہ مانجھوٹی

ترجمہ

مسعود احمد

# جھولا

اس بڑے میدان میں میرے اور میری بیوی جیسے، ہزاروں مرد اور عورتیں رہتے ہیں۔ ہم اور یہ ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں انسان سب ایک ہی آقا کے غلام ہیں۔ اس بڑے میدان میں آسمان کی چھت کے نیچے بڑے آرام اور سکون سے رہتے ہیں (کیونکہ ہم اس کے عادی ہوگئے ہیں) میں اور میری بیوی کبھی بھی پڑوسیوں کی طرف نہیں دیکھتے کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ وہ بھی دوسروں کی طرف نہیں دیکھتے اور یوں کوئی بھی کسی کی طرف نہیں دیکھتا۔ سب ایک دوسرے سے بے خبر رہتے ہیں۔ ہم جو ایک دوسرے سے اتنے بے خبر اور بے پرواہ رہتے ہیں تو وہ فائدہ مند ثابت ہوتا ہے۔ یہی فائدہ اٹھاتے ہم اپنے جیسے غلاموں میں اضافہ رہتے ہیں اور نتیجے میں ہم کو ہمارے آقا کا خوشی سے بھرپور قہقہہ سننے کو ملتا ہے اور ہم بھی دانت نکوس کر تالیاں بجاتے ہیں۔ ہم تھوڑا سا بھنبھناتے ہیں تو وہ بھی آقا سن لیتا ہے اس لیے ہم سوچ سمجھ کر بھنبھناتے ہیں کہ کہیں ہماری آخری بھنبھناہٹ ثابت نہ ہو۔

ہم اپنے اکلوتے آقا کے لیے غلاموں کی تعداد بڑھانے میں فخر محسوس کرتے ہیں لیکن میں اور میری بیوی اب تک کوئی بھی غلام نہیں بڑھا سکے تھے۔ جس کا دکھ ہم دونوں کو تھا مگر ہم مایوس نہیں ہوئے تھے اور غلام پیدا کرنے کے لیے ہاتھ پیر مارتے رہتے تھے۔

پھر میں اور میری بیوی انتظار کرنے لگے نئے غلام کا۔ بہت مہینوں کے بعد ایک دن میری بیوی کی طبیعت خراب ہوگئی۔ میں پریشان ہوگیا اور پوچھا ''بخت آور، یہ اچانک کیوں تکلیف ہوگئی؟''

تکلیف میں ہوتے ہوئے بھی اس کے چہرے پر مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ اور وہ کہنے لگی ''آج میں غلام کو جنم دوں گی۔ تم جاؤ!'' وہ اس کے آگے بول نہ سکی۔ اس کے منہ سے کراہیں نکلنے لگیں۔

میں نے بے صبری سے پوچھا ''ہاں میں کہاں جاؤں، یہ بتاؤ۔''

وہ کہنے لگی ''دائی کے پاس۔''

''لیکن کیا خبر کہ وہ کمبخت کہاں ہوگی؟''

اس نے کہا ''میدان کے مشرق کی طرف آقا کی توپ کے پاس۔''

میں نے کہا ''وہاں تو بہت ساری توپیں رکھی ہوئی ہیں۔''

کہنے لگی ''اُس بڑی توپ کے پاس جس کے منہ پر آقا نے بٹیر باندھ دیا ہے۔ مگر جاؤ، جلدی کرو۔''

میں بھاگتا دوڑتا، میدان میں پڑے ہوئے لوگوں کو پھلانگتا ہوا، توپ کے پاس پہنچا جس کے منہ پر بٹیر بندھا تھا۔ میں نے بٹیر کی طرف دیکھا۔

اُس کی زبان باہر نکل آئی تھی اور وہ ہانپ رہا تھا۔ میں نے وہاں پڑی ہوئی عورتوں میں سے دائی کو تلاش کیا اور اُسے جلدی جلدی اپنی بیوی کے پاس لے آیا۔ وہ میری بیوی کے پاس بیٹھی اور میں اُدھر ایک کونے میں کھڑا ہوکر آسمان کی چھت کی طرف دیکھنے لگا۔ آسمان کی چھت میں لوہے کے تار لٹک رہے تھے جن میں چاول جیسے بڑے دانے بندھے ہوئے تھے (وہ بڑے دانے چاولوں کی شکل جیسے تھے بھی یا نہیں، لیکن چونکہ مجھے بھوک لگی تھی اس لیے مجھے چاولوں جیسے لگ رہے تھے۔) دانوں کو دیکھنے سے میری بھوک تیز ہونے لگی۔ اس لیے وہاں سے نظریں ہٹا کر میں میدان میں پڑی ہوئی عورتوں اور مردوں کو دیکھنے لگا جو ایک دوسرے سے بے خبر اور بے نیاز بیٹھے تھے یا پڑے ہوئے تھے۔ اتنے میں ہول سیل کا بیوپاری پکار اٹھا ''مبارک ہو!''



''کس کی؟'' میں نے حیرت اور خوشی سے پوچھا۔

میں نے دوڑ کر دائی سے کپڑے میں لپٹا ہوا بچّہ گود میں لے لیا۔ دائی نے کہا ''میں آقا کے پڑوس میں گئی تھی۔ بچّہ پیدا ہوا تو اُس کے بڑے بھائی نے کہا آ گیا شیطان، بابا کی ملکیت میں سے آدھا حصہ بانٹنے والا!''

میری ہنسی چھوٹ گئی اور میں نے کہا ''لیکن اگر اس کا بھائی ہوتا تو کہتا خوش آمدید، میرے ساتھی! محنت میں میرا ساتھ دینے والا! ہم دونوں مل کر آقا کے لیے محنت کریں گے۔''

یوں کہہ کر بچے کو سنبھالا اور میں نے جیب سے پیسے نکالے اور دائی کو دے دیے۔ وہ چلتی بنی۔ میں نے بچّے کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ وہ دنیا کے سب بچّوں سے حسین اور پیارا تھا۔ مجھے بہت حیرت ہوئی۔ بچّے کو بیوی کے پاس لٹا کر میں نے کہا ''دیکھو یہ دنیا کے سب بچّوں سے پیارا ہے کہ نہیں؟''

اُس نے بچّے کو غور سے دیکھا۔ اُس کے چہرے پر ممتا امڈنے لگی۔ وہ کہنے لگی ''یہ نہ صرف دنیا کے سارے بچّوں سے خوبصورت اور پیارا ہے بلکہ اس جیسا بچّہ ابھی تک نہ دنیا میں پیدا ہوا ہے نہ ہوگا۔''

مجھے اُس کا جواب سن کر بڑی خوشی ہوئی۔ میں نے کہا ''بخت آور، تم نے زندگی میں پہلی مرتبہ عقل کی بات کی ہے۔''

وہ کہنے لگی ''میں تو ہمیشہ ایسی باتیں کرتی ہوں۔ تم میں عقل ہو تو سمجھو۔''

ہم دونوں کچھ دیر بچّے تک کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ اچانک بچّے نے رونا شروع کیا۔ میں نے پوچھا ''بخت آور، دنیا کا یہ حسین سے حسین تر بچہ روتا کیوں ہے؟'' اس میں نہ جانے کون سی بات تھی، میری بیوی بہت ہنسی۔ پھر کہنے لگی ''اب یہ سونا چاہتا ہے۔'' میں نے کہا ''پورے نو مہینے سویا ہے۔ کیا اب بھی سوئے گا؟''

وہ ہنس پڑی اور بولی ''لیکن ہم اسے سلائیں کس میں؟'' اُس کے چہرے پر پریشانی ظاہر ہونے لگی۔ میں نے کہا ''اس میں پریشان ہونے والی کون سی بات ہے؟ میرے پاس یہ چادر ہے۔ اس سے جھولا بنا لیتے ہیں۔''

''جھولا تو بنالیں لیکن باندھیں کس میں؟'' مجھے تب جا کر اُس کی پریشانی کی اصل وجہ معلوم ہوئی کہ میدان میں ایسی کوئی شے نہ تھی جس پر جھولا باندھا جاسکے۔ اچانک ہم دونوں کی نگاہ ایک ہی وقت میں اُوپر اُٹھ گئی۔ ہم دونوں آقا کے بنائے ہوئے لوہے کے تار میں جھولتی ہوئی چاولوں کی شکل والی چیز کی طرف دیکھنے لگے۔ ہمارا مسئلہ حل ہوگیا۔ میں نے خوشی خوشی چادر کا ایک کونا جھلاتے ہوئے دانے میں باندھا اور دوسرا کونا دوسرے دانے میں۔

پھر میں نے دنیا کا حسین ترین بچہ، میرا پیارا بچہ جھولے میں لٹا دیا اور اُس کے اوپر چادر ڈال دی۔ میں نے دانوں پر لکھے ہوئے الفاظ پڑھنے کی کوشش کی۔ میرے ہوش اُڑ گئے۔ ایک دانے پر نیوٹران اور دوسرے پر ایٹم بم لکھا تھا۔ میں نے گھبرا کر دنیا کے حسین ترین بچے کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے پر مُسکان تھی اور وہ سکون سے سو رہا تھا میں نے اِدھر اُدھر دیکھا تو حیران ہوگیا۔ سینکڑوں ہزاروں جھولے اُن دانوں میں لٹک رہے تھے۔ میں دوڑ کر ہر جھولے میں لیٹے ہوئے بچے کو (اُس کے ماں باپ کی نظروں سے) دیکھتا رہا۔ ہر بچّہ دُنیا کا حسین ترین بچّہ تھا۔ ہر بچّے کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ اُن کو پتہ نہ تھا کہ وہ نیوٹران اور ایٹم بم کے جھولوں میں جھول رہے ہیں۔ میں دیوانوں کی طرح دوڑتا ہوا ایک جھولے سے دوسرے جھولے کے پاس آیا اور پھر دوڑ کر اپنے بچّے کے جھولے کے پاس آیا۔ وہ اطمینان سے سو رہا ہوا تھا۔ میری بیوی میری حرکتوں کو تعجب سے دیکھ رہی تھی۔ وہ کہنے لگی ''خوشی سے پاگل ہوگئے ہو کیا؟''

میں نے کہا ''بخت آور، اس بڑے میدان کے سب بچّے ایٹم بم اور نیوٹران کے جھولوں میں جھول رہے ہیں۔''

بخت آور کے چہرے پر زردی کھنڈ گئی۔ اس نے تقریباً چیختے ہوئے کہا ''لیکن ہم پھر کیا کریں؟''

میں نے کہا ''ہماری بھنبھناہٹ بھی آقا سن لیتے ہیں۔''

''آؤ ہم اُس سے التجا کرتے ہیں۔'' میں نے دیکھا میری بیوی نے ہاتھ باندھ لیے۔ میں نے بھی ہاتھ باندھ لیے۔ میں نے التجا کی ''آقا، خدارا ایٹم اور نیوٹران بموں کو قابو میں رکھنا۔ ان نیوٹران اور ایٹم بموں میں بندھے ہوئے جھولوں میں دنیا کے حسین ترین اور پیارے



بچے جھول رہے ہیں۔ آقا ہم پر رحم کرو!''

پھر ہم دونوں نے آقا کے قہقہے سنے۔ ہم سہم کر رہ گئے۔ مجھے معلوم نہیں کہ آقا ہماری التجا قبول کرتا ہے کہ نہیں۔

(سندھی سے)

سوزوکی تاکیشی

# ہیروشیما

یہ رپورتاژ رسالہ "سات رنگ" کراچی کے شمارے مارچ، اپریل ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا تھا۔ ایک جاپانی شہری کی پاکستان کے لوگوں کو خبردار کرنے کی یہ کوشش آج پہلے سے زیادہ معنی خیز معلوم ہوتی ہے۔ مصنف کے تعارف کے لیے "سات رنگ" میں مضمون سے پہلے یہ عبارت شائع ہوئی تھی:

"سوزوکی تاکیشی جاپان کے ایک ہونہار طالب علم ہیں۔ اردو زبان اور ادب سے ان کی دلچسپی یہاں تک بڑھی کہ پاکستان آئے تاکہ اپنے شوق کی تکمیل کر سکیں۔ آج کل کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں زیر تعلیم ہیں۔ پاکستان سے واپسی پر ان کا ارادہ ہے کہ وہ جاپان میں اردو زبان اور ادب کے درس تدریس کا سلسلہ شروع کریں گے۔

یہ رپورتاژ انھوں نے بہت سے ملنے والوں کے سوالات پر لکھا ہے اس رپورتاژ سے ان کی عالمی ہمدردی اور انسانیت پرستی کا اظہار ہوتا ہے۔ تاکیشی صاحب نے وعدہ کیا ہے کہ وہ آئندہ "سات رنگ" کے لیے جاپانی ادب کے بارے میں لکھیں گے اور جاپان میں اردو کے موضوع پر بھی۔" (مرتب)

ممکن ہے کہ اس بیسویں صدی میں بھی کوئی ایسا آدمی ہو جس نے ٹوکیو کا نام کبھی نہیں سنا ہو لیکن شاید ہی کوئی شخص ہوگا جس نے ہیروشیما کے متعلق کچھ نہ سنا ہو۔ ہیروشیما اس جگہ کا نام



رہتی دنیا تک ہے جس کو دوسری جنگ عظیم کے خاتمہ کے ایک خوف ناک واقعے کے ساتھ انسان کی تاریخ کے صفحہ پر ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔ آج سے سولہ سال پہلے اگست کی چھ تاریخ کی صبح اسی شہر کے اوپر پھینکے ہوئے ایک ایٹمی بم نے ایک لاکھ شہریوں کو موت کی نیند سلا دیا اور ایک بڑے شہر کو ایک دم سطح زمین سے مٹا دیا اور اسی دن سے بنی نوع انسان ایٹمی بم کے خوف میں مسلسل مبتلا ہے۔ ہیروشیما کا نام تمام امن پسند پاکستانیوں کو خوب معلوم ہے لیکن اس کی واقعی حالات سے تو وہ بہت کم واقف ہیں۔ مثلاً ایک صاحب پوچھتے ہیں کہ کیا ہیروشیما میں اب تک کوئی آدمی بھی رہ سکتا؟ دوسرے کا سوال یوں ہے کہ "سنا ہے کہ وہاں گھاس واس بھی اگائی نہیں جا سکتی۔" میں اس چھوٹے سے مضمون میں آج کے ہیروشیما پر روشنی ڈالتے ہوئے آپ لوگوں کو اس بات سے واقف کرانا چاہتا ہوں کہ سولہ سال پہلے کے ایک ایٹمی بم کا اب تک لوگوں پر زبردست اثر ہے۔ اور اس کے ساتھ اس بات پر زور دینا چاہتا ہوں کہ ہمیں ہیروشیما کے دردناک واقعہ کو آئندہ کبھی اپنی زمین پر دوہرانے نہ دینے کی حتی المقدور کوشش کرنی چاہیے۔

ہیروشیما ٹوکیو سے مغرب جنوبی طرف کوئی ۵۵۰ میل کے فاصلہ پر چیوگوکو ضلع کا صنعتی اور تعلیمی مرکز ہے اور اس کی آبادی اب کچھ کم تین لاکھ ستر ہزار ہے۔ چوں کہ ۶ر اگست ۱۹۴۵ء کے خوف ناک واقعہ پر بہت کچھ کتابیں اور مضامین لکھے جا چکے ہیں اس لیے میں اس کو یہاں نہیں دہراؤں گا، بلکہ اس کے متعلق صرف اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ وہ انسان کی تاریخ میں سب سے خوف ناک اور خونریزی حرکت تھی، جو انسان نے انسان کے اوپر کی۔ اس خون ریزی کے لیے ایک آدمی جس کا نام ٹرومن تھا اور اس نے سمندر پار بہت دور سے ایٹمی بم استعمال کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کا حکم دے دیا۔ اس کے حکم کے مطابق بی ۲۹ بمبار طیارہ کے ایک ہوا باز کے لیے بم چھوڑنے کا بٹن دبانا بھی کافی تھا۔ اس خون ریزی کی یہی خصوصیت تھی کہ اس میں گویا کسی نے براہ راست ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔ ایک نے صرف دور سے حکم دیا، دوسرے نے بٹن دبایا، اس خصوصیت کے لیے قاتل نے شاید اس انسان دشمنی پر توبہ نہ کی ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایٹمی بم کا اصل خوف صرف اس کے تجربہ یافتہ لوگ سمجھ سکتے ہیں اور اس کو استعمال کرنے والوں اور بنانے والوں کو اپنی انسانیت کے خلاف حرکت گویا محسوس نہیں ہو سکتی۔ آج کل کے

حالات دیکھیے کہ ادھر لوگ عالمی امن کے لیے مسلسل کوشش کرتے رہتے ہیں، ادھر چند لوگ ایٹمی ہتھیار بنانے میں مصروف ہیں اور یہ عالمی امن کے لیے انسانی کوشش کو ناکام اور بے بنیاد بنا رہے ہیں۔ امریکہ، روس، برطانیہ اور فرانس جو کہ ایٹمی کلب کے اعزازی ممبر ہیں ہر روز اپنے ایٹمی بموں کے محفوظ ذخیرہ میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کرنے کے کوشاں ہیں اور اس حماقت کے نتیجہ پر غور کرنا بھول گئے ہیں، اس طرح وہ ہر وقت اپنی جان پر کھیل رہے ہیں۔

عوامی جمہوریۂ چین بھی اس ایٹمی کلب کا پانچواں ممبر بننے کے لیے بے تاب ہے۔ امریکہ کے مشہور ماہر طبعیات ڈاکٹر رائف راپ کے خیال کے مطابق عوامی جمہوریہ چین آئندہ ایک سال کے اندر پہلا ایٹمی تجربہ کرے گا۔ فرانس کے مشہور اشتراکیت پسند ہفتہ وار رسالہ اپر بٹوار نے لکھا ہے کہ مغربی ممالک کے ماہرین اس خیال پر متفق ہیں کہ عوامی جمہوریۂ چین اگلے سال کے آخر میں پہلا ایٹمی تجربہ کرے گا اور جو ماہرین اس خیال کے مخالف ہیں ان کو بھی اس نظریہ سے اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ اگر کوئی خاص سیاسی تبدیلی نہ ہوئی تو چین میں پہلا ایٹمی تجربہ سنہ ۶۴ء تک ضرور ہوجائے گا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ایٹمی کلب کا چھٹا اور ساتواں ممبر کون ہوگا۔ ذرا غور کیجیے ایٹمی ہتھیار استعمال کرنے کا نتیجہ خوف ناک خون ریزی اور مکمل تباہی کے سوا اور کیا ہوگا؟ کس کی تباہی؟ بنی نوع انسان کی۔ آج کل جب کہ امریکہ اور روس دونوں ممالک کے پاس ہزاروں ایٹمی اور ہائیڈروجن بم موجود ہیں اور ان کو دوسرے ملکوں پر برسانا بھی کچھ مشکل کام نہیں رہ گیا ہے تو اب یہ سخت دشوار نہیں بلکہ ناممکن ہے کہ خود نقصان اٹھائے بغیر دشمن کو تباہ کیا جائے۔ پچھلے دنوں روس نے دنیا کے امن پسند لوگوں کے پرزور احتجاج کو نظر انداز کر کے پچاس میگا ٹن کا ایٹمی تجربہ کردیا۔ اس کی تباہ کن قوت ہیروشیما پر پہلے ایٹمی بم کے مقابلہ میں ڈھائی ہزار گنا ہے۔ ذرا فرض کیجیے کہ ہیروشیما پر پہلے ایٹمی بم نے ایک دم لاکھوں آدمیوں کو ختم کردیا اور اب تک لوگ ایٹمی امراض سے مر رہے ہیں تو اگر اس کا ڈھائی ہزار گنا طاقتور بم گرایا گیا تو ہمارا کیا حال ہوجائے گا؟ حربی لحاظ سے اتنے زبردست بم کی ضرورت نہیں ہے کیوں کہ اس کے لیے کوئی مناسب نشانہ زمین پر نہیں ملتا۔ دنیا کے سب سے بڑا شہر ٹوکیو کو تباہ کرنے کے لیے صرف دو میگا ٹن ایٹمی بم کافی ہیں۔



اب دوبارہ ہیروشیما کے حالات پر نظر ڈالیے کہ ایٹمی بم گرنے کے بعد امریکی فوجی حکام نے اعلان کیا تھا کہ آئندہ چہتر سال ہیروشیما میں نہ گھاس اگ سکتی ہے نہ کوئی پودا۔ اور انھوں نے ایٹمی تابکاری کے اثر کے اندیشہ سے ۱۹۵۴ء کے آخر تک ہیروشیما میں امریکی فوج کا داخلہ منع کردیا تھا اور یہ اقدام بلاوجہ نہیں تھا۔ پھر ہیروشیما کے شہریوں نے اپنے عزیز وطن کو چھوڑنے سے انکار کیا اور شہر کی بحالی کا کام حیرت انگیز تیزی کے ساتھ شروع کیا گیا۔ یہ اصل میں بحالی نہیں تھی بلکہ بالکل ایک نئے شہر کی تعمیر تھی، کیوں کہ ہیروشیما کی سطح زمین پر کچھ باقی نہیں رہ گیا تھا۔ توقع کے خلاف زمین پر بہت جلدی گھاس اگنے لگی گویا زمین پر ایٹمی تابکاری کا زیادہ اثر نہیں پڑا تھا، لیکن آدمیوں پر اس کا اثر ضرور سخت پڑ گیا۔ ان لوگوں کا تو کہنا ہی کیا جو کہ اس قیامت انگیز موقع پر ہیروشیما میں موجود تھی اور بال بال بچ گئے، وہ لوگ بھی ایٹمی تابکاری سے بری طرح متاثر ہوئے جو ایٹمی بم پھٹنے کے بعد اپنے رشتہ داروں یا گمشدگانوں کی تلاش میں یا امدادی کارروائی کے لیے شہر میں داخل ہوئے۔ ان کے سامنے ایک صرف ایک راستہ تھا۔ جس پر ان کو خواہ مخواہ چلنا پڑا۔ یہ راستہ موت کا راستہ تھا۔

اب ایٹمی تابکاری سے متاثر لوگوں کے حالات بیان کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، اگر چہ دوسری جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد سولہ سال ہوچکے ہیں مگر ان ایٹمی امراض میں مبتلا مریضوں کے لیے جنگ اب تک ختم نہیں ہوئی ہے اور اب آئندہ بھی کبھی ختم نہیں ہوگی۔ جتنے اصحاب نے مجھ سے ہیروشیما کے متعلق سوالات پوچھے انھوں نے ہیروشیما ایٹمی بم کے آثار کے متعلق ضرور سوال کیا۔ اب اس کے بارے میں لکھنا بے جا نہیں ہوگا۔ ہیروشیما میں ایٹمی بم سے متاثر لوگوں کے لیے خاص طور پر ایک ہسپتال قائم ہوا ہے جس کا نام ہیروشیما گیدبا کو (ایٹمی بم) ہسپتال ہے۔ یہ ہسپتال ایٹمی امراض کے علاج کے لیے جاپان کے مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس ہسپتال میں پچھلے سال اگست سے اس سال اگست تک پورے ایک سال کے اندر ایٹمی امراض سے مرنے والوں کی تعداد ۴۴ تک پہنچی۔ جس میں گیارہ HEPATITIS سے، آٹھ ANEMIA اور LYMPHATITIS ہے۔ سات LEUKEMIA سے، پانچ پھیپڑوں کے سرطان سے اور پانچ دوسرے ایٹمی امراض سے ہلاک ہوگئے۔ پچھلے ایک سال میں ایٹمی

امراض سے اس ہسپتال میں داخل ہونے والے مریضوں کی تعداد ڈھائی سو تھی جن میں سے مذکورہ بالا امراض سے ۴۴ آدمی ہلاک ہوگئے۔ ان کے علاوہ چودہ آدمی ایسے بھی اس ہسپتال میں ہلاک ہوئے ہیں جن کے متعلق مصدقہ طور پر یہ کہا نہیں جاسکتا کہ ان کی موت کی براہ راست وجہ ایٹمی تابکاری تھی، حالاں کہ اس میں ذرا شک نہیں کہ ایٹمی تابکاری نے ان کی صحت پر بہت خراب اثر ڈال دیا تھا۔ یوں گزشتہ ایک سال میں ہیروشیما گیبا کو ہسپتال میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد ۵۸ تک پہنچ گئی ہے۔ شرح اموات LEUKEMIA میں سب سے زیادہ ہے اور اس کے بعد LYMPHTITIS پھیپھڑوں کے سرطان کا نمبر آتا ہے۔ ہیروشیما یونیورسٹی کے ایٹمی شعاع کے طبی تحقیقاتی ادارہ کے صدر ڈاکٹر وتانابے نے اس نتیجہ پر توجہ دلاتے ہوئے کہ گزشتہ دس سال میں ہیروشیما کے ایٹمی مریضوں میں ہر سال گیارہ یا بارہ کی تعداد میں LEUKEMIA کے نئے مریض پیدا ہوگئے تھے، مگر پچھلے ایک سال میں صرف آٹھ افراد LUEKEMIA بن گئے ہیں۔ اس امید کا اظہار کیا ہے کہ آئندہ LEUKEMIA کم ہوجائے گا۔ البتہ پچھلے ایک سال میں LEUKEMA کے مقابلہ میں HEPITITIS مریضوں کی شرح بڑھ رہی ہے اس کے متعلق اس ہسپتال کے صدر ڈاکٹر تسکیٹو نے بتایا ہے کہ آئندہ سرطان کے علاج پر زیادہ زور دیا جائے گا۔ یہاں میں نے صرف ان لوگوں کے متعلق بیان کیا جو ہیروشیما گیبا کو ہسپتال میں ہلاک ہوگئے، لیکن ہمیں ان لوگوں کی طرف بھی توجہ دینی چاہیئے جو ہسپتال کے باہر علاج کراتے ہیں یا ہیروشیما سے باہر چلے گئے ہیں اور وہاں صاحب فراش ہوگئے ہیں۔

اب ایٹمی بم سے متاثر دوسرے شہر ناگاساکی کا حال ملاحظہ فرمائیے۔ ناگاساکی ہیروشیما سے کوئی دو سو میل مغرب پر جزیرۂ کیرشیو کے مغربی ساحل پر ایک قدیم شہر ہے۔ موجودہ آبادی تین لاکھ چالیس ہزار سے کچھ زیادہ ہے۔ اس پر امن شہر کے اوپر ۱۹۴۵ء اگست کی نو تاریخ ہیروشیما پر پہلے ایٹمی حملہ کے تیسرے دن انسان کے اوپر دوسرا ایٹمی بم گرایا دیا گیا تھا۔ تب سے یہاں بھی بہت سے لوگوں کی زندگی صرف موت کے انتظار کا دوسرا نام بن گئی ہے، اگست ۱۹۶۰ء سے اگست ۱۹۶۱ء تک کے ایک سال میں ناگاساکی میں ایٹمی امراض سے مرنے والوں کی



تعداد ۳۰ تک پہنچی۔ غرض پچھلے ایک سال میں ایٹمی امراض سے ہلاک ہونے والوں کی تعداد ہیروشیما اور ناگاساکی دونوں شہروں میں ۴۷ تک پہنچ چکی ہے۔ اگر ایٹمی امراض کے علاج کے دوران دوسری بیماری سے مرنے والوں کو بھی شمار کیا جائے تو کل تعداد کوئی ایک سو تک پہنچ جائے گی۔ سولہ سال پہلے پھٹے ہوئے دو ایٹمی بموں سے اب تک بے قصور آدمی مر رہے ہیں۔ مرنے والوں میں معصوم بچے بھی شامل ہیں، جو اس وقت اس دنیا میں پیدا نہیں ہوئے تھے، کیوں کہ یہ بہت ممکن ہے کہ ایٹمی تابکاری سے متاثر شدہ ماں باپ سے پیدا ہونے والی آئندہ نسلوں پر ان کا موروثی اثر پڑے۔ خدا جانے ان بچوں نے کیا برا کام کیا جس کی وجہ سے انھیں اپنی جان دینی پڑی۔

آج جو صاحب ہیروشما کا دورہ کریں گے وہاں ان کو صاف سڑکیں، اونچی عمارتوں کی قطاریں، پر رونق بازار اور ہنس مکھ باشندے نظر آئیں گے اور ان کو دیکھ کر سولہ سال پہلے کے اس خوف ناک واقعہ کا سراغ لگانا ناممکن ہے، لیکن جب وہ شہر کے مرکز میں ایک عمارت کے کھنڈر کے سامنے جس کو اسی زمانہ کی یادگار کے طور پر ویسا ہی رکھا گیا ہے، کھڑے ہوجائیں اور ایک بینک کے دروازے پر لگے ہوئے ایک آدمی کے کالے سائے کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں جو وہاں بیٹھے ہوئے ہیں ایک دم جل کر مر گیا تھا اور اس کے بعد پتھر پر صرف کالا سایہ چھوڑا اور ایٹمی بم کے یادگاری عجائب خانہ کا دورہ کریں اور آخر ہیروشیما گیبا کو ہسپتال میں مریضوں کی مزاج پرسی کریں تو آپ خدا سے یہ دعا مانگے بغیر نہیں رہ سکیں گے کہ سولہ سالہ پہلے ایک ملک کے صدر کے حکم کے مطابق بنی نوع انسان کی تاریخ میں بے نظیر، اس خوفناک ترین خونریزی کو آئندہ اس سطح زمین پر کبھی دہرایا نہ جائے، اور آپ کا یہ یقین زیادہ پختہ ہوجائے گا کہ موجودہ ایٹمی ہتھیاروں کی بندش اور ایٹمی طاقت کے پر امن استعمال کو جلد از جلد عملی جامہ پہنانے کے لیے حتیٰ المقدور جدوجہد کرنا موجودہ نسلوں کا فرض ہے۔

ہیروشیما کے امن وامان کے یادگاری مینار کے تختہ پر آپ یہ جملہ پڑھیں گے کہ یہ قصور کبھی دہرایا نہیں جائے گا، الامن والسلام علیکم۔

آخر یہ کس کا قصور تھا؟

شیخ ایاز

ترجمہ

فہمیدہ ریاض

# ہیروشیما

یہ کون کھڑا ہے پربت پر؟
حیران ہوا میں ہنستا ہے!
اور تکتا نیچے دھرتی پر

یہ کیسی آگ لگی جل میں......
کیا اپنا موتی ساتھ لیے
ہر سیپ جلی ہے ساگر میں؟

کس نے ہلکی مئے نوشی میں
'میں تیری ہوں' 'میں تیرا ہوں'
کل رات کہا سرگوشی میں!

اُس لہجے کی جھنکار کہاں؟
جو پیت کی آنچ سے کھلتی تھیں
ان سچوں کی مہکار کہاں؟



یہ کس نے کہا، ہے پیار امر!
دوجی ہر شے آنی جانی

اس آگ میں کچھ بھی امر نہیں
اور تجھ میں لیے ترا موتی
جل گئی کوئی سوندھی سیپی
بجھ گئی ترے جی کی جوتی
اور میری پیت گنوائی ہے
اپنی ہر آس امرتا کی
ایسی ارتھی اٹھوائی ہے

یہ کون کھڑا ہے پربت پر
یہ دیکھ، یہ میں ہوں، تو وہ ہے
جو امن نہ لائے دھرتی پر
یہ اپنی ارتھی آئی ہے
اور اس ارتھی پر پھول چڑھا
کیا ہم نے آگ لگائی ہے!

# ایٹم بم

امن کا دشمن، جان کا دشمن — دھرتی اور دہقان کا دشمن
کھیت کا اور کھلیان کا دشمن — پیارے پاکستان کا دشمن
ایٹم بم انسان کا دشمن

بچوں اور ماؤں کا بیری — پیروں کی چھاؤں کا بیری
سندر آشاؤں کا بیری — ہر دل کے ارمان کا دشمن
ایٹم بم انسان کا دشمن

جب یہ کبھی غصے میں آئے — مندر، مسجد، سب کو ڈھائے
دریاؤں میں آگ اگائے — دھرم کا اور ایمان کا دشمن
ایٹم بم انسان کا دشمن

(بچوں کے لیے)

(اکتوبر ۱۹۵۲ء)



# نارمن موئر

واشنگٹن مینار کے نیچے
میں نے اس پاگل کو
اپنے سامنے مرتے دیکھا ہے

اس نے کہا تھا
ایٹمی ہتھیاروں کا بنانا بند کرو
اس نے کہا تھا
ہنستے بستے شہروں پر شعلے برسانا بند کرو
اس نے کہا تھا
ناگاساکی، ہیروشیما کو دہرانا بند کرو
ورنہ میرے جسم میں جو انگار بھرا ہے
ورنہ مری دین میں جو بارود بھرا ہے
واشنگٹن مینار کو آگ سے بھر دے گا
ایک دھماکہ شہر کو خاکستر کر دے گا۔
اہلِ حکم کے ایوانوں پر
موت کی خاموشی چھائی تھی
اور کچھ دور

سفید عمارت کی سب حشمت
دُودِ ہراس سے گہنائی تھی
مہلک ہتھیاروں کے تاجر خوف زدہ تھے
انسانی خوں کے سوداگر خوف زدہ تھے
سارے شہر پہ سکتہ سا تھا
سب سفاک تھے ایک طرف
اور اک دیوانہ تن تنہا تھا
امن کی خوشبو، پیار کے سازوں کی خاطر
پھول سے بچّوں کی آوازوں کی خاطر
لیکن اس دمساز کو کب زندہ رہنا تھا
سچ کی اس آواز کو کب زندہ رہنا تھا
شام ہوئی
جب سورج رین بسیرے میں تھا
یہ دیوانہ جلّادوں کے گھیرے میں تھا
دیکھتے دیکھتے اس کا لہو پیوندِ زمیں تھا
وین کے اندر ذرّہ بھر بارود نہیں تھا
لیکن اس کے ہاتھوں میں جو بینر تھا
سب کہتے ہیں
وہ بارود سے بڑھ کر تھا۔



سحر انصاری

# نسلِ زیاں گزیدہ

وہ عہد جس میں ہماری نسلِ زیاں گزیدہ نے بار پایا
زمیں کی آنکھوں نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا
اس آدمِ عہدِ نو کو دیکھو
کبھی سمندر میں ہے یہ رقصاں
کبھی ہے صحرا میں پا بجولاں
کبھی خدائے فضائے عریاں
ہے اک ہتھیلی پہ ہیروشیما تو دوسری پر قمر فروزاں
زمین اور آسمان کے درمیان جو کچھ چھپا ہوا ہے
سب اس کے دامن میں آ رہا ہے
ہم ایک نسلِ زیاں گزیدہ
کہیں ہمارا نشاں نہیں ہے
اس ارتقا کے سفر میں ہم گردِ کارواں ہیں
ہماری حیرت، ہمارے لمحے
ہمارے رشتوں پہ نوحہ خواں ہیں......

(طویل نظم سے اقتباس)

## حصہ سوئم

# پوکھرن اور چاغی

## جرأت انکار

وہ جن کی کہ ذرات کے دل تک ہے رسائی
صد حیف کریں یوں درِ دولت کی گدائی
شیطان سے خدائی کے سب اسرار تو سیکھے
افسوس کہ اک جرأت انکار نہ پائی

ضیا جالندھری

# عرض داشت

اک بھیانک گرج اور اچانک
دھوئیں کے شجر
خاک سے اوجِ افلاک تک چھا گئے
ایک دھماکا ہوا
اور زمین کے پرخچے اڑے
بحروبر، کوہ و دشت
آگ کے دیو ہیکل پرندوں کی صورت
خلاؤں میں گرتے بھٹکتے ہوئے بجھ گئے
اور آدم کی اولاد کا آخری کارنامہ مکمل ہوا

عین اس وقت ابلیس نے عرش پر حاضری دی
نگاہوں میں شوخی کا موہوم پرتو
لبوں پر تبسم کی ہلکی جھلک تھی
بڑے عجز سے سر جھکائے ہوئے عرض کی
یاد تو ہوگا انکار سے اوّلیں روز ہی
قدسیوں نے یہ اندیشہ ظاہر کیا تھا
کہ نوعِ بشر فتنہ جو، فتنہ پرداز ہوگی



سو دیکھا کہ یہ خاک زاد آج تک
کیسے کیسے بہانوں سے
اپنی بہیمانہ خصلت کو تسکین دیتا رہا

میں تو بدنام ترغیب تھا ہی مگر
اس کی ہر طرز ایجاد میرے لیے درسِ استاد تھی
خیر کے نام پر
قتلِ انصاف و خونِ عبث
زور و زر کی ہوس
دل کی پرفن سیاہی
جنگ، وحشت، تباہی
تو اب میری درخواست ہے
پھر کوئی ایسی تخلیق پیشِ مشیت اگر ہو
تو اس جنسِ نو کو
کوئی ایسا جوہر ملے
جو مجھے بھی فنا کر سکے

# تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

## واجپائی کی نظم ''ہم جنگ نہ ہونے دیں گے'' کے جواب میں

واجپائی جی!
تم بھی کوی ہو، میں بھی کوی ہوں،
قلم کے ناتے پوچھ رہا ہوں،
تم نے اپنی اک کویتا میں
کہا نہیں تھا ''جنگ نہ ہونے دیں گے
ہم جنگ نہ ہونے دیں گے''
لیکن اب پردھان منتری کی گدی پر
بیٹھ کے اپنے عہد کو تم نے بھلا دیا ہے
اپنے اندر کے شاعر کو سلا دیا ہے
اپنی فکر کو پرتھوی اور اگنی کی حد سے
ملا رہے ہو!
پنچ شیلا کے ماننے والے دیس میں اب تم
ایٹم بم کے پانچ دھماکے کر کے
ترنگے کے سائے میں بیٹھے
جنگ کے نقشے بنا رہے ہو!



بھول چکے ہو...... تم نے کہا تھا
''ہم نے چھیڑی جنگ بھوک سے، بیماری سے''
...... کیا تم بھوک اور بیماری سے جیت چکے ہو؟
بتلاؤ کیا لاکھوں کروڑوں
محنت اور مزدوری کرنے والوں کو
دو وقت کی روٹی ملتی ہے؟
کیا گھاٹ پہ گہرے پانی میں جا کر
اک ساڑھی کو دھو کر پہننے والی کو
اب دوسری ساڑھی ملتی ہے
کیا بیماری اور بنا علاج کے مرنے والوں کی
سنکھیا میں کچھ کمی ہوئی ہے؟
بستی بستی، گلیوں گلیوں پھرنے والے
لاکھوں کروڑوں بچوں کو کیا
تم نے بستے دلا دیے ہیں
اگر نہیں تو...... پھر کیوں آج تمہارے ہاتھ
قلم کے بدلے ننگی تیغ کو لہراتے ہیں
کاش تمہارے ہاتھ
دوبارہ قلم اٹھائیں اور لکھیں
ہم جنگ نہ ہونے دیں گے!
ہم جنگ نہ ہونے دیں گے!!

انور احسن صدیقی

# چاغی اور پوکھرن

ہماری آنکھوں میں کتنے ہی گفتنی و ناگفتنی فسانے
چھپے ہوئے ہیں
ہزاروں محرومیوں کے داغوں سے تن ہمارے
سجے ہوئے ہیں
ہماری دریوزہ گر نگاہیں
کبیر شیخوں، امیر سوداگروں کے در کھٹکھٹا رہی ہیں
ہر اک دستک پہ کتنی ذلت اٹھا رہی ہیں
ہماری لکنت زدہ زبانیں
ہمارے خالی شکم کا نوحہ سنا رہی ہیں
ہماری ہاتھوں میں ہے وہ کشکول
جو ہماری وجودِ جاں کی دلیل بن کر
ہماری پہچان بن چکا ہے
طلب کی میزان بن چکا ہے
ہماری سوکھے گلے جو آزارِ تشنگی سے چیخ رہے ہیں
کہ آبِ سادہ کی سادہ نعمت بھی ان کی تقدیر میں نہیں ہے
ہمارے سینے اجاڑ صحراؤں کی تپش سے تڑخ رہے ہیں
ہمارے بچے



غذا سے عاری، دوا سے محروم
زندگی کے نحیف و بیمار بازوؤں میں سسک رہے ہیں
فسون و تعویذ و ساحری میں
ہم ان کے سارے دکھوں کا درماں تلاش کرتے
دعاؤں کا سرد ہاتھ تھامے
سیاہ اندھی گلی میں کب سے بھٹک رہے ہیں۔
ہم ان کے معصوم، مردہ چہروں کو
اپنے اشکوں سے دھو رہے ہیں
خود اپنے خونِ جگر سے اپنے
دریدہ دامن بھگو رہے ہیں
ہمارے سر پر شکستہ چھت میں ہیں اتنے سوراخ
جن سے ہو کر
ہر ایک موسم کی سختیاں ہم پہ قہر بن کر برس رہی ہیں
سکوں کی اک مہربان ساعت کی آرزو میں
ہزار ناکام التجائیں
ہماری آنکھوں میں بس رہی ہیں۔

مگر ہمارے لیے ہے یہ امر کس قدر باعثِ مسرت
سکونِ قلب و جگر کی دولت
نشاط افزا سبیلِ راحت
کہ ہم نے اپنے نحیف جسموں میں برق سوزاں کا وہ ذخیرہ
اسیر کر کے چھپا لیا ہے
کہ جب بھی چاہیں

جلا کے اک دوسرے کو فوراً ہلاک کر دیں
نحیف جسموں کو خاک کر دیں
خود اپنے ہاتھوں سے اپنے قصّے کو پاک کر دیں
خودی کو اتنا بلند کر دیں
کہ خودکشی ہی مآل ٹھہرے
ہماری اس خواہشِ جنوں کا
فنا ہی روحِ کمال ٹھہرے۔



## چھٹا منٹ

اک جنگی دانش ور نے کہا
"ہم پانچ منٹ میں دشمن کے
ہر شہر کو راکھ بنا دیں گے
سب کچھ مٹی میں ملا دیں گے
ہر ذرہ شے کو جلا دیں گے"

اک دیوانہ یہ سن کر ہنسا
پھر عالمِ وحشت میں بولا:
"اے جنگی دانش ور، یہ بتا
جب پانچ منٹ مٹ جائیں گے
پھر چھٹے منٹ میں کیا ہوگا؟
وہ چھٹا منٹ کس کا ہوگا؟"

# ہندوستانی دانش وروں کے نام

## بم دھماکے کے بعد

جو ہاتھ میں نے بڑھایا تھا دوستی کے لیے
وہ ہاتھ صرف کسی بے نوا کا ہاتھ نہ تھا
اس ایک ہاتھ میں وہ بے شمار ہاتھ بھی تھے
جو میرے ساتھ تھے جب کوئی میرے ساتھ نہ تھا

یہ ہاتھ غنچہ بکف حرفِ آرزو لے کر
گیا تھا کوچۂ یاراں میں نامہ بر کی طرح
یہ ہاتھ سازِ رفاقت تھا چاہتوں کا سفیر
یہ ہاتھ جو تھا محبت کی رہگذر کی طرح

بہت سے دوست مری اس ادا سے خوش بھی نہ تھے
محبتوں کے سفر میں اداسیاں بھی ملیں
نہیں تھا کرشن نگر میں نے نے نوازی کی
سو راکھشش بھی ملے دیو داسیاں بھی ملیں



کسی کے ہاتھ میں پتھر کسی کے ہاتھ میں پھول
کسی کے لب پہ دعائیں کسی نظر میں غبار
کسی کے حرف میں انداز دلربائی کے
کسی کی موجِ تبسم میں طعن و طنز کی دھار

جو لوگ صاحبِ دل تھے وہ ہمنوا تھے مرے
جو بے قرار تھے تجدیدِ دوستی کے لیے
جو چاہتے تھے کہ دونوں کے گلستانوں میں
گلاب کھلتے رہیں امن و آشتی کے لیے

مگر میں آج جو لوٹا ہوں اپنے گھر کی طرف
تو جیسے کوچۂ قاتل سے ہو کے آیا ہوں
میں مسکراؤں تو کیسے کہ میری آنکھوں سے
عیاں ہے صاف کہ میں خون رو کے آیا ہوں

میں اپنے لوگوں سے کیسے بیاں کروں کہ وہاں
جوابِ نغمۂ دل ایٹمی دھماکے ہیں
میں اپنا ہاتھ ندامت سے ہوں چھپائے ہوئے
کہ اس میں غنچہ و گل کے بجائے آبلے ہیں

# پیمان وفا کس سے کہاں کیجیے جا کے

(چاغی کے حوالے سے)

جب میرے کالے بال سفید ہوئے
تو میرے ملک کی بھوری چٹانوں نے زردی پہن لی
میری سرزمین جس میں محبت کی بجائے
بارود کی بو پھیل رہی ہے
یہاں کچھ نہیں رہے گا
میرے بچوں کے لیے بھی کچھ نہیں رہے گا
انگلی کے ناخن سے بھی زیادہ تیزی سے
جنون پھیل رہا ہے
زر کا، جنگ کا اور نفرت کا
گھڑی کو چابی دے دی گئی ہے
سیٹلائٹ، طبل جنگ کی طرح
گونج رہا ہے
مگر ہم نے کھلی آنکھوں پہ
پٹی باندھ لی ہے
ہم مسلسل وہ سن رہے ہیں
جو سننا نہیں چاہتے



ہم مسلسل وہ بول رہے ہیں
جو بولنا نہیں چاہتے
وہ وقت نہ آ جائے
جب ہمارے پاس گنوانے کو بھی کچھ نہ رہے
لفظ بھی نہیں
میرے پاس تو مخالفت کرنے کے لیے
صرف لفظ ہیں۔

# پوکھرن اور چاغی

زمین کی کوکھ کو انسان نے جلا ڈالا
اور اب خوشی سے خلاؤں میں رقص کرتا ہے۔
حسیں پہاڑ کو اک آن میں مٹا ڈالا
خدا کے سامنے طاقت پہ ناز کرتا ہے۔
''بنایا تو نے جسے میں نے کر دیا برباد''
چلے ہیں طائفے گاتے ہوئے مبارکباد۔
یہ کوہ طور نہ تھا جل کے جو ہوا سرمہ
تم آنکھ میں اپنی لگا نہیں سکتے
تم اس سے اپنی بصیرت بڑھا نہیں سکتے
وگرنہ جشن کا یہ اہتمام کرتے کیوں؟
مقامِ گریہ سے ہنستے ہوئے گزرتے کیوں؟
کلیم کوئی نہیں یہاں کلام کیا کیجے
خدا کا جلوہ نہ تھا اسی کا نام کیوں لیجے
یہاں ہواؤں میں اب گرم راکھ اڑتی ہے
کوئی گڈریا یہاں اب کبھی نہ آئے گا
فرازِ کوہ پہ جو بکریاں چرائے گا
کوئی پرندہ بھی اس سمت اب نہ جائے گا



کوئی کسی کو نہ پانی یہاں پلائے گا
اٹھے گا ابر تو برسے گی زہر کی بوچھار
گرج کی گونج سے آئے گی نیستی کی پکار
زمیں کے سینے میں جس شے نے ڈال دی ہے دراڑ
چیخ گئی ہیں ہوائیں جلا دیا ہے پہاڑ
بس اک ثبوت ہے انسان کی شقاوت کا
بس اک مہیب نشاں دہر کی ہلاکت کا

پہاڑ،
تیرہ نصیب،
یہ چند اشک ہیں اک دردمند کی سوغات
بہت طویل تھا یہ دن، بڑی اداس ہے رات۔

# ہوا کا رقص

ہوا بہت تیز چل رہی ہے
برہنہ تن شاخ ہر شجر کی
زمین پہ رقصندہ زرد پتوں کو
کتنی حسرت سے تک رہی ہے۔
ہوا نے مٹھی میں خاک لے کر
برہنہ تن پر اچھال دی ہے
وہ ایک چٹکی جو بچ رہی تھی
ہماری آنکھوں میں ڈال دی ہے۔
گلی میں کوڑے کے ڈھیر، ان پر
طواف کرتی ہوئی چڑیلیں
ہماری جانب لپک رہی ہیں
مگر وہ اک اسم نامبارک
وہ زہر ہم نے بھی پالیا ہے
کئی تہوں میں چھپالیا ہے
جسے ہوا میں اگر اچھالا
پہاڑ آتش فشاں بنیں گے
سمندروں سے دھواں اٹھے گا



نیم کی بستیوں کا نام ونشاں بھی باقی نہیں رہے گا
زمین کا خاکستری بچھونا
کسی نئی فصل باد و باراں کا تا ابد منتظر رہے گا
یہ زہر باہر نکال تو دوں
میں سوچتا ہوں، اسے صف دشمناں کی جانب اچھال تو دوں
مگر ہوا تیز چل رہی ہے
کوئی بگولا ہماری جانب پلٹ پڑا تو؟

# یوم تقصیر

(۲۸/مئی ۱۹۹۹ء)

رہے ہمیشہ یوں ہی بے نیاز سود و زیاں
رہا ہے گرچہ سدا سلسلہ عذابوں کا
وتیرہ اپنا رہا ہے حقیقتوں سے گریز
شعار اپنا تعاقب رہا سرابوں کا
جو راز جہدِ بقا تھے وہ راز راز رہے
خرد کے باب میں اندیشے بے جواز رہے

حدِ نگاہ کے اس پار ہے نظر اپنی
تصورات میں خوش فہمیوں کی جنت ہے
متاعِ زیست لٹا کر سجی ہے بزم نشاط
جلا کے رختِ سفر منزلوں کی چاہت ہے
یہ مستعار لہو تابہ کے رگ و پے میں
یہ کس نے گھول دیا زہر ساغرے میں

بڑے خلوص سے ہم ہیں اسیرِ دامِ فریب



بڑے وثوق سے جاری ہے آگہی کا سفر
جنون و جہل کی مشعل ہے اپنے ہاتھوں میں
یہ روشنی کا سفر ہے کہ تیرگی کا سفر
یہ بے خودی کا سفر ہے کہ گمرہی کا سفر
یہ زندگی کا سفر ہے کہ خودکشی کا سفر؟

شاہد نقوی

# خودکشی

(پاک و ہند ایٹمی دھماکے کے تناظر میں)

معطّر خواب، خوشبو جسم، رنگیں آئنہ خانے
شباب و شعر، صہبا و سبو، رقص و طرب کی بزم دل آرا کے کاشانے
جنوں خیز و جنوں ساز و جنوں انگیز نقدِ جاں کے پیمانے
وہ قصے تار داماں کے، وہ چاکِ دل کے افسانے
گل و لالہ کا فرش احمریں، زریں قبا، گلپوش خس خانے
چہار اطراف طاقوں پر وہ چوبی شمع دانوں کی ضیا پاشی وخیرہ ساز ضوباری
منقش بام و در، دالان، محرابوں کی گل کاری
تلطف اور تکلف کا سماں، وہ ناز برداری
فضائے دلبری میں، خوش نوائی سے وہ سرشاری

وہ فقروں کا ترشّح، گفتگو کی تیز بارش کی کراماتیں
وہ خوش فکری کے لمحے، خوش ادایادوں کی باناتیں
طرح داری کی بزم ناز، لب پر کچھ مچلتی سی مناجاتیں
وہ صبح و شام کے معمول، وہ ارماں بھری راتیں
خیالوں کے تموج پر، غنا باری کا نازک ریشمی سا عکس لہراتا
وہ استھائی کتھک کی، جسم بھارت ناٹیم کے بھاؤ بتلاتا



کوئی گدرایا تن، سازوں پہ اپنا روپ برساتا
مدھر آواز میں، محفل میں کوئی میر و غالب کی غزل گاتا
کوئی مکھڑا، لہریا آنچلوں کی اوٹ میں رہ رہ کے شرماتا
رہس ناٹک و نوٹنکی سے کوئی جی کو برماتا
کوئی پنگھٹ پہ آتا اور ہزاروں روپ بکھراتا
نمو کی کونپلوں کے نور و نکہت سے یہ گلشن رشک فرماتا

کسی جانب ادب، تاریخ، منطق پر بحث، تشر تحسیں
جدلیاتی عمل کی شرح و بسط، عصری مسائل، ان کی توضیحیں
کہیں پر انقلابی اور تہذیبی رویوں کی کشاکش اور توجیہیں
اشاروں اور کنایوں کی علاماتی وہ تشبیہیں
کہیں زیر زمیں روپوشیوں کے جانکسل لمحے
سروں پر روز و شب لٹکی ہوئی تلوار کی دہشت کے وہ چرچے
فراق دوستاں کے تذکرے، بزم حریفاں کے گلے شکوے
بنی نوع بشر کی بہتری کے خواب، مستقبل کے منصوبے
نئی دنیا کے پیکر میں، محبت امن خوش حالی کے روشن باب اور نقشے
خرد و افروز سنگت، اک مہذب بزم کے خاکے
نہ جانے اور ایسے کتنے موضوعات ہیں جن سے
غذا ملتی ہے ذہنوں کو، تصور کو توانائی، لبوں کو اذن گویائی
مجھے...... خود سے...... شناسائی!

مگر یہ ایکا ایکی
کن قیامت خیز آوازوں سے ہیں ارض و سما لرزاں
دھوئیں کے سیاہ مرغولے ہیں کیوں اطراف میں رقصاں
دھواں، اندیشہ ہر گھر کا، دھوئیں کی زد پہ ہر امکاں
دھواں دست صبا، ذہن رسا، تقدیر کا حرماں

دھواں معبد، دھواں گنبد، دھواں مندر، دھواں گرجا
دھوئیں کے بادلوں میں کار ہائے حضرت شیطاں
یہ کیسی گڑگڑاہٹ ہے کہ سر لگتا ہے پھٹتا ہے
وہ کاری ضرب کا گھاؤ، کلیجہ جس سے کٹتا ہے
یہ کیسا خوف جس سے دل زمیں تک کا دہلتا ہے
ہوئے جاتے ہیں اعضا سن، لہو آنکھوں سے رستا ہے
کھسکتی جا رہی ہے کیوں زمیں پیروں تلے اپنے
یہ کیوں اک دم بکھر کر رہ گئے سارے حسین سپنے
تلاطم ہے کوئی کہرام یا طوفان ہے جس نے
تہہ و بالا ہی کر کے رکھ دیا ہے نظمِ ہستی کو
نہ یہ کہ قریۂ جاں کو، ہلا کر رکھ دیا ہے دل کی بستی کو

دھمک وہ ہے کہ جس سے کوہ فولادی چٹخ جائیں
وہ شق الارض کا نقشہ کہ خود جلاد شرمائیں
وہ خوں گشتہ تمنائیں لہو آنکھوں کو رلوائیں
بتائیں کوئی تو آخر کہاں خوابوں کو لے جائیں
زمیں انسان پر کیوں تنگ کر دی ناخداؤں نے
یہ کیسی آگ برسائی ہے ان ظالم ہواؤں نے

یہ خوں آشام آندھی، یہ تباہی اور بربادی
کوئی ہیروشیما دیکھے کہ جواب تک ہے فریادی
کوئی قرب و جوار ناگاساکی ہو کے تو آئے
کہ اس انساں کشی میں کون آخر لے گیا بازی
زمیں کے قلب کو دیکھے، لہو روتی ہے جواب بھی
یہ کیسا فخر کہ خلقِ خدا کے ہو گئے قاتل
یہ کیسا رشک، انساں دشمنی میں ہم بھی ہیں شامل!



## سعیدہ گزدر

# ایٹم بم کے بعد

امرتا نے کہا تھا مجھ سے
اپنا خیال رکھنا، سب کا خیال رکھنا
گمبھیر دن ہیں جاناں
ہر سمت ہے اندھیرا
ایٹم بموں کی پوجا
قوموں کا ہے وتیرہ
اپنا خیال رکھنا، سب کا خیال رکھنا!

یہ بم کہاں گرے گا؟
یہ وسوسہ ہے دل کو
یہ بم جہاں گرے گا
انسان بھسم ہوگا
رنگ و نسل نہ مذہب
پہچان بن سکے گی
بے جاں، نہ جانداروں میں
تفریق ہو سکے گی
اک راکھ کا سمندر

بن جائے گا مقدر
اپنا خیال رکھنا، سب کا خیال رکھنا!

خود سوزی، خود فریبی
کا جشن ہم منائیں؟
کیوں نفرتوں کی فصلیں
دھرتی پہ اب اگائیں
امن و امان کی کلیاں
کب آگ میں کھلی ہیں!
بھوک اور پیاس، غربت
صرف جنگ میں پلی ہیں
ہے وقت اب بھی باقی
کچھ اور کھو نہ دینا
گمبھیر دن ہیں جاناں
اپنا خیال رکھنا، سب کا خیال رکھنا!



ڈاکٹر ہلال نقوی

## قتلِ زمیں کا مرثیہ

نہ کوئی رنگ، نہ خوشبو، نہ آئینہ پہنے
تمام جسم ہے، افلاس کی قبا پہنے
افق پہ دور تلک تیرگی ہے محوِ سخن
نہ روشنی نہ کرن
زمیں کو ڈوبتی شاموں کی سُرخیوں نے دیے
تجلیوں کے کفن
شکستہ فکر، دریدہ بدن — تمام وطن

وہ سرحدوں کے اِدھر ہوں کہ سرحدوں کے اُدھر
کوئی بھی نسل ہو
مقروض ہیں سبھی نسلیں
ہم ارتقا کے ہیں وارث،
یہ خود پسندی کیا
عمارتوں کی بلندی سے سربلندی کیا
یہ زندگی کا ہے جھول
حکومتوں کی نظر سے ضمیر کو نہ تول

یہ جتنے ہاتھ ہیں
یہ ہاتھ ہاتھ نہیں ہیں، یہ ہاتھ ہیں کشکول
سلگ رہا ہے جو بارُود کے جگر میں دھواں
عیاں و نہاں
یہ ہر خیال کو ہر آ گہی کو ڈس لے گا
بڑا عذاب یہ قحط اُلرجال ہے لیکن
زمیں کا قحط ہر اک زندگی کو ڈس لے گا
کوئی حیات کے اُن قاتلوں سے یہ کہہ دے
اگر تمہارے جنوں نے
زمیں کو قتل کیا
تو پھر زمیں پہ نہ تم ہو گے اور نہ ہم ہوں گے
رعایا پاؤں میں پہنے ہے بیڑیاں......لیکن
ابھی یہ ہاتھ میں میرے، قلم تو زندہ ہے
اب عنقریب،
کہ یہ ایٹمی جنوں جاگے
میں اپنے ہاتھ سے خود اپنا مرثیہ لکھ لوں۔



صبا اکرام

# گوتم کے لیے ایک نظم

بدھ، تو نے سنا
تیرے بھگتوں کی دھرتی کے
سینے میں
اک بان اگنی کا
اُترا تھا جو قہر بن کر
وہی بیج شعلوں کا
اب تیری اپنی زمینوں
کی چھاتی میں بھی بو رہا ہے۔
سنا، بدھ تو نے سنا
آخری ہچکیوں کا یہ کورس
جو اِک غول نے
لال پیلے پرندوں کے گایا،
جلے برگدوں کی سیہ ڈالیوں سے
جدا ہوتے پتّوں کی
تالی کی دُھن
اور دُھویں میں نہائی چراگاہ میں

بھیڑ بکریوں کی چیخوں کا نغمہ،
یہ تیاریاں ہیں اُسی فصل کے
جشن کی
اپنے بچے جو کاٹیں گے
فردا کے کھیتوں سے
جیون کے شمشان سے،
بدھ، تو نے سنا!



عذرا عباس

# یہ کیسے ہوسکتا ہے؟

آپ کہتے ہیں
کہ ہم ایک نظم لکھیں
جو ایٹم بم کے خلاف ہو
یہ کیسے ہوسکتا ہے؟
ہم تو سرکار کا کھاتے ہیں
ہم نے تو اس عہد نامے پر دستخط کیے ہیں
جس میں ہم نافرمانی نہیں کریں گے
اور جس کے عوض
روٹی اور کپڑا اور مکان
کی سہولت حاصل کریں گے۔
یوں تو
ساری زندگی کرایے کے مکان میں رہتے ہوئے بھی
ہم نے کبھی نافرمانی نہیں کی
یہ الگ بات ہے کہ
کپڑے کے بغیر ہم خود نہیں رہ سکتے
اور جب تک ہماری دُم نہیں نکل آتی
ہم بے لباس نہیں ہوسکتے۔

عہد نامے کی رو سے
روٹی تو ہمیں ملتی رہے گی
لیکن اس میں وفاداری شرط ہے۔
تو جناب، اتنے عیش سے ملنے والی روٹی پر
ہم کیسے لات ماردیں،
جو گذشتہ دو دہائی سے ہمیں بغیر
نانے کے ملتی رہی ہے۔
یوں تو ہم ہمیشہ سے ایٹم بم کے خلاف رہے ہیں۔
اس وقت سے

جب ہم اپنے باپ کو ناگاساکی اور
ہیروشیما کے بموں کے خلاف بولتے ہوئے
منھ سے جھاگ اڑاتے دیکھتے تھے
تب سے ہمارے خون کی ایک ایک بوند
ایٹم بم سے نفرت پر آمادہ ہے۔
لیکن اب کیا کیا جائے
اس نفرت میں ہم کیسے شامل ہوں،
اور کیسے لکھیں ایک نظم
جو ایٹم بم کے خلاف ہو؟



ن۔م۔ دانش

# ایک نظم کی موت

چھوٹی چھوٹی چیزوں سے اک نظم بنائی ہے میں نے
چھوٹی چھوٹی چیزیں
جن کے گہرے دکھ ہیں

سگریٹ کی خالی ڈبیا
جس میں پینے والوں کے
سب درد بھرے ہیں

کاغذ کا اک ٹکڑا
جس میں آوازیں، الفاظ، حروف
اور تاریخ میں بہنے والا خون جما ہے

اک بچے کے خالی ہاتھ
جس میں مابعدالطبیعاتی جیون کا
اک بوجھ دھرا ہے

ایک کھلونا جس کی گردن

اور اک بازو کٹے ہوئے ہیں

اک مکھی
جو مکڑی کے جالے کا حصہ بنی ہوئی ہے

ماچس کی اک تیلی
جس سے کم از کم اک گھر
اور بہت سے خواب جلائے جاسکتے ہیں

دن کا ٹکڑا
جو خوابوں کا بوجھ اٹھائے
شب کی گود میں اوندھے مُنھ
بیزار پڑا ہے

آدھی رات کا اک حصہ جو
سناٹے اور خوف سے سہما چیخ رہا ہے

ایک پہاڑ
جس کی رنگت بدل چکی ہے

اور اک نظم
جو ساری چیزوں کے دکھ کو جھیل رہی ہے



اپنے اندر رنج، تاسف
نفرت اور غصہ لے کر
جب لوگوں کے پاس یہ نظم
احساس دلانے جاتی ہیں
ان کے دل میں رنج
تاسف، نفرت، غصہ
کچھ نہیں ہوتا

وہ اس نظم کو سنتے ہیں
خوش ہوتے ہیں
واہ واہ کرتے ہیں
تالیاں پیٹتے
اس نظم کو موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔

ن۔م۔ دانش

# ہمیں پھول درکار ہیں

دنیا کہاں جا رہی ہے؟
جب جوہری طاقتیں
زیست کا استعارہ بنیں
تو سمجھ لو
کہ دنیا کہاں جا رہی ہے!

اپنی مٹھی میں تم پھول لے کر
جہاں کو بچانے چلے ہو
یہی سوچ کر
حسن دنیا کو آخر بچا لے گا......لیکن
اک الجھن ہے
کیا حسن اب بھی......؟

ایسا لگتا ہے
کہ آسماں کی یہ تاروں بھری رات
اب دوسری ہی زمیں کے لیے ہے
ہمارا مقدر





فقط تیرگی ہے۔

خلقت بے نوا
ایک اندوہ میں مبتلا
خوف و مایوسی کے
بند کوچوں میں سہمی ہوئی
غم کی ماری ہوئی
بھوک، افلاس کی گود پالی ہوئی

ان کی حسرت زدہ آنکھوں میں
صبحِ امید کے خواب کی کرچیاں
ڈھیر ہیں۔
ان کے سر پر کھڑی
آتشیں موت ہے،
موت انبوہ کی،
موت انسان کی۔

ہم کو بے معنی لاحاصل جنگوں نے جو کچھ دیا ہے
اسے دیکھتے خوف آتا ہے
کیا امن اور حسن دھوکا
کہیں واہمہ تو نہیں ہیں؟

مگر زندگی اتنی بے دست و پا تو نہیں ہے

کہ وہ موت سے آخری جنگ بھی ہار جائے۔
حیات و نمو جب تک امکاں میں ہیں
زندگی ہے،
بقا ہے۔

ہمیں پھول درکار ہیں
استخواں اور قبروں کی خاطر نہیں
مسکراتی جواں لڑکیوں کے لیے
بھولے بچّوں کی بھولی ہنسی کے لیے
زندگی کے لیے
اک نئی زندگی کے لیے۔



## ذی شان ساحل

# دنیا

ہائیڈروجن کے ایک ایٹم میں
کتنے نیوٹران، کتنے پروٹان اور
کتنے الیکٹران ہوتے ہیں؟
وہ ہم سے پوچھنا چاہتے ہیں۔

اور ہمیں بتانا چاہتے ہیں کہ
ایٹم کا نیوکلیئس کہاں ہوتا ہے؟

نپولین کا گھوڑا آخری بار
کہاں دیکھا گیا؟
جوپیٹر کی سطح پر موجود پانی
ہمیں کبھی نہیں ملے گا؟
وہ تمہاری آنکھوں کے بارے میں
کوئی بات نہیں کرتے
وہ ہمارے آنسوؤں کے بارے میں
کچھ نہیں جانتے
لوگوں کی زندگی کے بارے میں

کوئی اندازہ نہیں لگاتے

اُنھیں یقین ہے دنیا ان کی موت سے پہلے
کبھی ختم نہیں ہوگی
ان کی ہنسی سے ہمارا کوئی تعلق نہیں
صبح سے شام تک جو محبت
ہمیں زندہ رکھتی ہے
جو خواب ہمیں زندگی دیتے ہیں
ان کی دنیا اس سے
بہت پہلے ختم ہو جاتی ہے۔



## توقیر چغتائی

### بم

ہم اس دیس کے بھوکے ننگے
اور اُس دیس کے بھوکے ننگے
بم پہنیں گے
بم کھائیں گے
اور بم اوڑھ کے سو جائیں گے۔
گلیوں سے جب ہم نکلیں گے
پیچھے پیچھے بم نکلیں گے
مدرسوں سے قلم دوات تو کم نکلیں گے
بم نکلیں گے
ہم اِس دیس کے بھوکے ننگے
اور اُس دیس کے بھوکے ننگے
کاٹ کے پیٹ اپنے بچوں کا
میزائل تیار کریں گے
بھوک کا کاروبار کریں گے
دہلی سے لاہور تلک
ممبئی سے کراچی تک
ساری آبادی
ہیروشیما بن جائے گی
ناگا ساگی کہلائے گی۔

علی محمد فرشی

# تماشائی حیرت زدہ رہ گئے

تماشا گروں نے
کبوتر نکالے تھے
شیشے کے خالی کنستر سے!
ماچس کی تیلی سے
بجلی کا کھمبا بنایا تھا،
رسّی پر چلتی ہوئی ایک لڑکی
ہوا میں اڑائی تھی،
بندر کے اندر سے
انسانی بچّہ نکالا تھا،
سب لوگ حیران تھے
کیسے جادوگروں نے
پرندے کو راکٹ بنایا،
پتنگے کی دم سے اسٹنگر نکالا
طلسماتی ہاتھوں نے
گیندوں کی مانند ایٹم بموں کو اچھالا!
تماشائی حیران تھے
کیسے جادوگروں نے
زمیں
راکھ کی ایک مٹھی میں تبدیل کر دی!



مصطفیٰ ارباب

# سائرن بج رہا ہے

سائرن بج رہا ہے
اور میں
فنا سے پہلے
ایک نظم لکھ رہا ہوں۔
مجھے نہیں معلوم
کوئی اس نظم کو پڑھ پائے گا۔
پھر بھی
میں لکھنا چاہتا ہوں
ایک نظم
جس کا نصف حصہ
سرحد کے پار
کوئی سر جھکائے
میرے ساتھ
لکھ رہا ہے۔
میں جانتا ہوں
سائرن وہاں بھی بج رہا ہے۔

# انگلیوں پر گنتی جتنے لوگ

انہوں نے دھماکے کیے
ادھر والے نے
اُن سے زیادہ دھماکے کیے
وہ
ان کے ہاتھوں مارے جائیں گے
ہم
اُن کے ہاتھوں نابود ہوں گے۔
موت کا دائرہ کار
لامحدود کردیا گیا ہے۔
اب
ماؤں کی دعائیں بھی
نہیں بچاسکتیں
وہ بھی
ماری جائیں گی۔
انگلیوں پر گنتی جتنے لوگ
زندگی سے پُر
دوملکوں کو
یرغمال بنا چکے ہیں۔



# چاغی کا پہاڑ گواہی دیتا ہے

بہت پہلے
کہیں ایک بدصورت آدمی پیدا ہوا،
دادی اماں کہانی سناتی ہیں۔
وہ
مکمل طور پر
ایک بدصورت آدمی تھا۔
اس نے
کبھی اپنے خدوخال نہیں دیکھے
اسے سامنے پاکر
آئینے ٹوٹ جاتے تھے
اور
چشموں کا پانی گدلا ہوجاتا تھا۔
چاغی کا پہاڑ گواہی دیتا ہے،
آئینے اب بھی ٹوٹتے ہیں
اور پانی
اب بھی گدلا ہوتا ہے۔

## پوکھرن سے چاغی تک

یہ کیسی روشنی چمکی سرحد افق جس نے
مری آنکھیں جلا ڈالیں
مری آنکھوں میں سپنے تھے
گلابوں میں بسے رنگوں رچے صحنوں کے
صحنوں میں برستی جھلملاتی بارشوں کے
بارشوں میں کاغذی کشتی پہ ان جانے جزیروں کے لیے
خوشبو بھری سانسوں کا تحفہ بھیجتے معصوم بچّوں کے لیے
مری آنکھوں میں سپنے تھے
مری آنکھیں جلا ڈالیں

کچھ ایسی روشنی چمکی سرحد افق جس نے
مری آنکھیں بجھا ڈالیں
یہ کیسی خامشی اتری سرِ شہرِ صدا جس میں
چٹختے بام و در، گرتی فصیلوں، کرچیاں ہوتے دریچوں میں بپا
شورِ قیامت سے بھی سناٹا نہیں جاتا
جھلستے بازوؤں، جلتے پروں کے ساتھ اڑتی
آشیانہ ڈھونڈتی چڑیا سے اپنا پیڑ پہچانا نہیں جاتا



مری پوریں پگھلتی ہیں، مگر چیخا نہیں جاتا
یہ کیسی آگ ہے، جس میں
ازل کی دائمی یخ بستگی میں منجمد کہسار جلتے ہیں
ابد کے سرد خانے میں پڑی لوحِ شکست پر لکھے اسرار جلتے ہیں
صحیفوں میں رقم افکار جلتے ہیں
مگر پھر بھی
بجھا سورج نہیں جلتا
اندھیرا کم نہیں ہوتا
یہ کیسی روشنی ہے۔

عثمان قاضی

## جوہری جاڑا☆

اب نیا صحیفہ ریت پہ لکھا جائے گا
نہ پیڑوں کی چھالوں پر
نہ ہرنوں کی کھالوں پر
نہ کاغذ کے صفحوں پر۔

اب پیڑ یہاں ناپید ہوئے
اور ہرن ہوس کے صید ہوئے
کاغذ کی حرمت ختم ہوئی

اب سینۂ صحرا لہو سے دھویا جائے گا
اب نیا صحیفہ ریت پہ لکھا جائے گا۔

---
☆Nuclear Winter



عطیہ داؤد

## دھماکے کی موسیقی

میری بیٹی سہائی
لتا کے گیت سنتے سنتے سو گئی ہے
خواب میں مسکراتے ہوئے
نہ جانے کیا سوچ رہی ہے۔
وہ کیا جانے ہند کیا ہے، سندھ کیا ہے
کشمیر کی حسین وادی میں
اڑتے ہوئے پنچھیوں کا مذہب کیا ہے
نور جہان کس کی، لتا کس کی ملکیت ہے۔
وہ نہ تو اخبار پڑھ سکتی ہے
اور نہ ٹیلیویژن کا پرچاری خبرنامہ سمجھ سکتی ہے۔
وہ تو ڈش پر مادھوری کے ساتھ ہم رقص ہو جاتی ہے،
ہندو پاک کی سیاست سے بے خبر
ہر وقت شاہ رخ سے ملنے کے سپنے دیکھتی رہتی ہے۔
اور آج ڈھولک کی تھاپ پر ایٹم بم کی تصویر نچاتے ہوئے
باغ میں پھولوں کے درمیان چاغی کا پہاڑ دیکھ کر
پوچھتی ہے، یہ کیا ہے؟

پھول، پتھر، خوشبو، ریت، موسیقی اور ایٹم بم کا
آپس میں کیا رشتہ ہے؟
قدیر خان سے بھی مشکل کام ہے میرا
ماں کے سینے سے ہونٹوں تک الفاظ کا گزر مشکل
ہے
ہاں، تمہارے جیسے کروڑوں معصوموں کے قیمے سے بنتا ہے چاغی کا پہاڑ۔
آشا اور اقبال بانو کی آوازیں ریت بن کر اڑ جاتی ہیں۔
''ایٹمی دھماکا مبارک، ایٹمی دھماکا مبارک،''
کہنے والوں کی روح صدیوں تک رقص کرے گی
ہیروشیما اور ناگاساکی جیسی دھرتی پر!

(سندھی سے، ترجمہ از شاعر)



## ایک دھماکے کا جشن

ایٹمی اظہار کے جشن کا شور
کر رہا ہے اہتمام
کہ تنہا کر کے مجھے
مار ہی ڈالے۔
میں تو اب تک
تتلی سے اڑتے پھرتے بوسے
کے انتظار میں تھا
جو تمہارے کھلتے ہونٹوں سے اُڑے
گلِ سرخ پر بیٹھ جائے۔
میں اس تتلی لمس کو
یاد میں جگانے
احساس میں پھول کھلانے
کی کوشش میں تھا
کہ چونکا دیا گیا مجھے۔
اپنی بربادی کے اس جشن میں
رقص کرنے پر مامور کر دیا گیا مجھے۔

ان کو سمجھانا چاہا میں نے
کہ جوہری تاب کاری
کسی بھی طرح کی
خوشی کا سبب بن نہیں سکتی۔
لیکن ان کو سمجھانے میں
خود کو
خلا میں لٹکتا ہوا پایا میں نے
یوں لگا مجھے
کہ میری زبان کے لفظ
اجنبی بن گئے ہیں،
مجھے ہر بات اب
اشاروں سے سمجھانا ہوگی۔
یوں میں اس خلقت سے کٹ گیا
جو تالیوں، قہقہوں میں گم تھی۔
اب اس ہجوم کے سامنے
مجھے شرمندگی کے احساس کے ساتھ رہنا ہے۔

یہ احساس آخر کار مجھے مار ہی ڈالے گا
میں کہ جسے
تمہارے چہرے کے اجالے سے بڑھ کر
زندگی میں کسی آسائش
کی تمنا بھی نہیں۔
مجھے اب



ایٹمی تاب کاری
اور حقارت بھرے روّیوں،
چبھتی ہوئی نظروں
کے عذاب میں
جینا پڑے گا۔

(سندھی سے، ترجمہ از شاعر)

# راسکوہ سفید کفن اوڑھ کر مر گیا

بھیانک گرج
دھوئیں کے شجر
خاک سے اوج افلاک
تک چھا گئے
راسکوہ جل کر خاک ہوا

صحرا جبل و دشت
تپتی دھول کے
دیو ہیکل پرندوں کی صورت
خلاؤں میں
گرتے بھٹکتے ہوئے
بجھ گئے

راسکوہ سفید کفن اوڑھ کر مر گیا

جنگی جنون، وحشت، تباہی



زمیں کا دامن
ہر جوگ سے
زرد ہوئے
چمن طرازوں کے عالم افروز چہرے
علم گرد ہوئے
اہل درد، اہل فکر و اہل نگاہ

چیخ اٹھے
چاغی کے سب کوچہ و بام
جل اٹھے
کیچ کے زخموں کے چراغ
ویران ہوئے خاران کے دیہات
کھیت برباد

اپاہج ہوئے گلنگور کے بے شمار پودے
ان گنت انکھوے
لاتعداد بیج
دیوار دھواں،
کھو گئے در،
جھلسانے لگے سایے
فغان درد اور صدا کے سیل تند رو میں
ڈوب چکے تو کنڈی کے ساز،
دھل، سرنا، دو چاپی

مل گئی تسکین
جنونیوں کی بہیمانہ
خصلت کو

راسکوہ سفید کفن اوڑھ کر مرگیا

(بلوچی سے، ترجمہ از شاعر)



زاہد حسن

# جنگ کی کوکھ سے جنمی نظم

میں نے پوچھا اس سے، اس کے شہر اور شہر میں آباد لوگوں کے بارے میں
میں نے پوچھا اس سے بارش، ہوا اور رنگوں کی بارے میں
میں نے پوچھا اس سے اس کے جیون اور جیون میں رچے دکھوں کے بارے میں
میں نے پوچھا اس سے شہر کی بے سود بڑھتی بھیڑ
اور پچھلے برس چھڑی جنگوں کے بارے میں
میں نے پوچھا اس سے میک اپ کی دکانوں، رنگ برنگے کپڑوں،
اور لڑکیوں کے بارے میں
میں نے اس سے نیلے سمندروں، دہکتے صحراؤں
اور گہرے جنگلوں کے بارے میں پوچھا
میں نے اس سے ہر اس شے کے بارے میں پوچھا
جو ہمارے ماضی میں آباد دنیا کا
بہت عرصے تک خواب بنی رہی۔
اس نے میری نظروں میں جھانکا
اس نے میرے وجود کو ٹٹول کے دیکھا۔
اور میرے سینے سے لگ کے رونے لگی۔

(پنجابی سے، ترجمہ از شاعر)

حارث خلیق

# چاغی اور پوکھرن

ایک صبحِ بدنہاد و جنگجو،
دودھ، شکر اور آٹے میں گندھے
خوابوں پہ ہوتی ہے طلوع
کون جانے کس طرف
خشک آوازوں کے مالک گاؤں والے چل پڑے
جن کے کپڑے اور جوتے جیسے صحرائی اتار
سخت رو، تڑخے ہوئے
بے دریغانہ ہوا اک جنگ کا آغاز ہے
اُمید فردا کے خلاف!

(انگریزی سے، ترجمہ از شاعر)

انتظار حسین

# میرے اور کہانی کے بیچ

اس روز میں نے افسانہ لکھنے کی نیت سے قلم اٹھایا تھا۔ ویسے تو میں یکسو ہو کر بیٹھا تھا۔ مگر اتفاق سے کمرے میں رکھا ہوا ٹی وی کھلا رہ گیا تھا۔ خیر میں ٹی وی کے نشہ بازوں میں سے نہیں ہوں۔ قبول عام حاصل کرنے والے ٹی وی پروگرام بھی مجھے کچھ نہیں کہتے۔ بے شک وہ جاری رہیں۔ کمرے میں میں ان سے بے تعلق رہ کر اپنے لکھنے یا پڑھنے کے کام میں مصروف رہ سکتا ہوں۔ مگر اس وقت صورت دوسری تھی۔ نہ کوئی سیریل چل رہا تھا نہ کوئی ہنسی دل لگی والا پروگرام ہو رہا تھا۔ اس وقت ایک نہایت سنجیدہ پروگرام ہو رہا تھا۔ ایک ایسا قومی مظاہرہ جس میں ہماری قومی بقا کی ضمانت مضمر جانی گئی ہے۔ پاکستان کے ایٹمی تجربوں کی فلم چل رہی تھی۔ دھما کا ہوا۔ زمین دوز گڑگڑاہٹ۔ پھر میں نے دیکھا کہ پہاڑ میں ہلکی سی لرزش ہوئی اس کے ساتھ ہی پہاڑ کی رنگت بدلنی شروع ہوگئی۔ کچھ اس طرح سے جیسے چہرے کا رنگ فق ہوتا ہے۔ اس آن میں نے قلم رکھ دیا۔ یا شاید وہ خود ہی چلتے چلتے رک گیا اور میرے لیے اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ میں قلم رکھ دوں۔ مجھے اپنے بچپن کا زمانہ یاد آ رہا ہے۔ جب سورج کو یا چاند کو گرہن لگتا تھا تو میرے والد اپنے باقی کام موقوف کر دیتے اور جانماز بچھا کر بیٹھ جاتے۔ اس وقت وہ وہ نماز پڑھتے جسے وہ نماز خوف بتاتے تھے۔ کہتے کہ اس وقت چاند پر آزمائش کی گھڑی ہے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ سے چاند کے لیے دعا کرنی چاہیے کہ اس کی مشکل آسان ہو اور آزمائش کی گھڑی خیریت سے گزر جائے۔ شاید اس وقت پاکستان کے ایک پہاڑ پر ایسی ہی آزمائش کی گھڑی آئی ہوئی تھی۔ اس بھاری وقت میں اس پہاڑ نے کمال ہمت سے کام لیا کہ وہ دھما کہ جو ہیبت اپنے جلو میں لے کر آیا تھا اس سب کو اس نے اپنی جان پر لے لیا اور پاکستان کے جاندار وں کو گزند

نہیں پہنچنے دیا۔ اسے اس عالم میں کس اذیت سے گزرنا پڑا اور اندازہ اس سے لگاؤ کہ یہ اذیت جھیلتے ہوئے وہ پہاڑ ایسی ہستی لرز اٹھی اور اس کا رنگ متغیر ہوگیا۔ اب اس کا اپنا قدرتی رنگ کبھی واپس نہیں آئے گا۔

ایٹم بم کل تک ہمارے لیے دور کی شے تھی، ایک نادر و نایاب قیامت خیز ہتھیار جو سمندر پار کی بڑی طاقتوں کے اسلحہ خانوں کی زینت تھا۔ چشم زدن میں وہ ہمارے ہاتھوں میں آ گیا۔ عجب، ثم العجب۔ تو اب ہم ایٹمی طاقت ہیں۔ ایٹمی طاقت تو بڑی طاقت ہوتی ہے۔ اور بڑی طاقت کون بننا نہیں چاہتا۔ سو ہندوستان کے لوگ بہت خوش ہیں۔ پاکستان کے لوگ بھی بہت خوش ہیں۔ فکر مند بڑی طاقتیں ہیں۔ انہوں نے آپس میں بہت عہد معاہدے کیے تھے کہ چاہے کچھ ہوجائے ہم یہ ہتھیار استعمال نہیں کریں گے۔ اب وہ پریشان ہیں کہ یہ تو بندروں کے ہاتھ میں استرا پہنچ گیا ہے۔ ان کا کیا اعتبار کب بٹن دبا دیں اور اپنے ساتھ ساری دُنیا کو لے ڈوبیں۔

مجھے اِن دنوں کتنی کہانیاں یاد آ رہی ہیں جو میں نے بچپن میں اپنی نانی اماں سے سنی تھیں۔ ایک کہانی اس طرح تھی کہ ایک شہزادہ قسمت کا مارا ایک دیو کے چنگل میں پھنس گیا۔ اس دیو کا اپنا ایک عالی شان قلعہ تھا۔ شہزادے کو لے جا کر اس قلعہ میں چھوڑ دیا اور ہدایت کی کہ اس قلعہ کے اندر تو ہر طرح آزاد ہے۔ یہاں سات در ہیں۔ چھ در کھولنا۔ ان میں طرح طرح کی نعمتیں ہیں۔ ان نعمتوں کے مزے لوٹنا۔ لیکن ساتواں در مت کھولیو۔ وہ کھولے گا تو تو اپنے سر تباہی لائے گا۔ شہزادے نے کتنے دنوں اس ہدایت پر عمل کیا۔ چھ دروں میں سے جو در کھولتا اسے نعمتوں سے مالا مال پاتا۔ ہر طرح کی لذت ہر طرح کا عیش۔ مگر آخر اس کی ان لذتوں سے نیت بھر گئی۔ ایک دِن اس کے دماغ میں کیا سمائی کہ ساتواں در کھولو اور دیکھو کہ وہاں کون سی نعمتیں ہیں۔ ساتواں در کا کھولنا تھا کہ اس کے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔

ہمارا زمانہ بھی ایک دیو کے چنگل میں پھنسا ہوا ہے۔ یہ ہے سائنس اور ٹیکنالوجی کا دیو۔ چھوٹے ملکوں میں کیا پتہ چلتا ہے۔ مغرب کے بڑے ملکوں میں جا کے دیکھو۔ سچ مچ یہی لگتا ہے کہ کہیں الٰہ دین کے چراغ سے دیو نکل کر یہ عالی شان قلعہ تعمیر کیا ہے۔ جس در کو کھولو ایسی



نعمتوں اور آسائشوں سے مالا مال نظر آئے گا کہ عقل دنگ رہ جائے۔ مگر اس قلعہ میں ایک ساتواں در بھی اب نمودار ہوگیا ہے۔ ویسے تو جنات نے یہی طے کیا ہے کہ ہم اپنے اپنے قلعہ کے سب در کھولیں گے مگر ساتواں در نہیں کھولیں گے۔ مگر میں سوچتا ہوں کہ اگر کسی گھڑی کسی سنکی شہزادے کے دماغ کی پھرکی گھوم گئی اور اس نے ساتواں در کھول دیا تو...

بڑی مشکل یہ ہے کہ یہ سائنس اور ٹیکنالوجی کا زمانہ ہے اور میں تکیہ کرتا ہوں پرانی کہانیوں پر، دیو مالائی قصوں پر۔ یار کہتے ہیں کہ یہ پرانی قصہ کہانیاں، یہ دیو مالائیں انسانیت کے بچپن سے یادگار ہیں جب آدمی کی عقل کچی تھی اور اوہام کا دور دورہ تھا۔ اب عقل و شعور کا چلن ہے اور سائنس کا زمانہ ہے۔ اور میں پوچھتا ہوں کہ کیا واقعی بچہ بالغ ہوگیا ہے۔ سنا تو یہی ہے کہ مغرب میں سائنس اور فلسفہ کی گود میں پل کر وہ خیر سے بالغ ہوگیا ہے اور عقل کا پتلا بن گیا ہے۔ ایٹم بم بھی اسی کی عقل کی کارستانی ہے مگر ہیروشیما بھی تو اسی کے شعور کا کرشمہ ہے۔

خیر تو اب عقل و شعور کا دور دورہ ہے اور ٹیکنالوجی اپنے عروج پر ہے اور جنگل صحرا سمندر پہاڑ چرند پرند سب بہت مصیبت میں ہیں۔ میرے دوست کہتے ہیں کہ بھائی یہ تو تسخیر فطرت کا عمل ہے اور پھر اقبال کے شعروں سے اس عمل کے حق میں دلیلیں لاتے ہیں۔ اتفاق سے اقبال کے شعر جہاں تہاں سے مجھے بھی یاد ہیں۔ دو شعر حاضر خدمت ہیں:

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزر گاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

بلکہ زندگی کی شب تاریک تو اس کے بعد اور تاریک ہوگئی۔ ہوتی ہی چلی جا رہی ہے۔ اگر کہیں امید کی کرن باقی بھی رہ گئی تھی تو اسے ایٹم بم نے آ کر بجھا دیا۔

لیجیے یہ تو میں اپنے پرانے رونے گانے پہ آ گیا۔ اور اب مجھے یاد آ رہا ہے کہ یہ میرا رونا گانا کب سے شروع ہوا۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی کے اوائل میں جب پنجاب یونیورسٹی کے گیٹ کے برابر کھڑا بلند و بالا پیپل کا پیڑ کاٹا گیا تو مجھے یوں لگا کہ شہر میں قتل کی کوئی واردات ہوگئی ہے اور

بستی کے سر سے کسی ولی کا سایہ اٹھ گیا۔ میں نے آتے جاتے کب کب اس گھنے پیڑ کی چھاؤں میں نوخیز طلبا اور طالبات کو چہکتے مہکتے دیکھا تھا۔ اس چہک مہک کے پیچھے کیا کہانیاں تھیں وہ تو اس درخت ہی کو معلوم تھیں۔ وہ اب ان ساری کہانیوں کو اپنے سینے میں چھپائے مال پر اوندھا پڑا تھا۔ میں نے ان دنوں ''مشرق'' میں کالم نگاری کرتا تھا۔ سیاسی مسائل سے منہ موڑ کر بس لوگوں درختوں پرندوں کے چھوٹے موٹے معاملات پر لکھا کرتا تھا۔ سو اس شہادت پر بھی ایک کالم قلمبند کیا۔ پھر حلقہ اربابِ ذوق کے جلسہ میں جا کر دہائی دی۔ اِن دنوں حلقہ کے جلسوں میں رجعت پسند اور ترقی پسند دونوں قسم کے ادیب مل بیٹھ کر ادبی مسائل پر بحثیں کیا کرتے تھے۔ رجعت پسند ادیبوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ ایک درخت کے کٹنے کو ایک انسانی واردات اور ایک ادبی مسئلہ بنا کر کیوں پیش کیا جا رہا ہے۔ ادھر ترقی پسند دوستوں نے میری فریاد کو عین رجعت پسندی اور ترقی دشمنی قرار دیا۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ پاکستان صنعتی عہد میں داخل ہو رہا ہے۔ سو درخت تو کٹیں گے۔ اس کے بغیر ملک ترقی کیسے کرے گا۔

بس پھر شہر میں درخت اندھا دھند کٹتے چلے گئے۔ اور ایک روز مجھے ایک عجب فون آیا۔ بیگم حجاب امتیاز علی بول رہی تھیں ''انتظار صاحب، کیا آپ کو اس کا پتہ ہے کہ اب کے برس کوئل اس شہر میں خاموش ہے۔ جون شروع ہو چکا ہے اور ابھی تک کسی طرف سے کوئل کی کوک سنائی نہیں دی۔ آپ بتائیے آپ نے کوئل کی کوک سنی ہے۔''

میں نے جناح باغ میں اپنی صبح کی سیروں کو یاد کیا اور حیران ہوا کہ کوئل کے کوکنے کا موسم تو شروع ہے۔ مگر ابھی تک قریب یا دور سے اس کی کوک سنائی نہیں دی ہے۔ مگر مجھے اس کا احساس کیوں نہیں ہوا تھا۔

''آپ بجا فرماتی ہیں۔ میں نے بھی ابھی تک کوئل کی کوک نہیں سنی ہے۔''

''پھر آپ نے اس پر کالم کیوں نہیں لکھا لوگوں کو اس واقعہ کا علم ہونا چاہئے۔ انتظار صاحب، لکھیے۔ لوگوں کو بتائیے کہ یہ بہت تشویش کی بات ہے۔ تو آپ لکھیں گے۔''

''جی لکھوں گا۔''

یہ واقعہ یقیناً ایسا تھا کہ اس پر لکھنا چاہئے تھا۔ اور یہ واقعہ میری تو سمجھ میں آتا تھا۔ آخر



درختوں کے قتل عام پر عالم فطرت کے کسی گوشے سے تو احتجاج ہونا تھا۔ یہ احتجاج کوئلوں کی طرف سے ہوا۔ ہمارے یہاں احتجاج کوئلوں کی طرف سے ہوا۔ اور اس طور ہوا کہ انہوں نے چپ سادھ لی اور ہمیں اپنی سریلی آواز سے محروم کر دیا۔ اور ابھی مجھے ''سویرا'' کا تازہ شمارہ موصول ہوا ہے۔ صلاح الدین محمود نے اپنے مضمون میں بتایا ہے کہ دُنیا کے مختلف علاقوں میں چڑیاں، تتلیاں اور مچھلیاں اجتماعی خودکشی کر رہی ہیں۔ ناصر کاظمی نے کہا تھا:

اڑ گئے یہ شاخ سے کہہ کر طیور
اس گلستاں کی ہوا میں زہر ہے

مگر اب وہ اُڑ کر کہاں جائیں۔ آدمی کے ہاتھوں ساری دُنیا کی ہوا میں زہر گھل چکا ہے۔ چڑیاں اور تتلیاں ظالم و جاہل آدمی کے ہاتھ کو نہیں پکڑ سکتیں کہ ہوا میں زہر مت گھولو اور اللہ کی زمین پر زندگی کو اجیرن مت بناؤ۔ وہاں تو مقدور اتنا ہی ہے کہ کوئلیں ناخوش ہو کر کوکنا بند کر دیں۔ چڑیاں اور تتلیاں اس مسموم فضا سے بیزار ہو کر خودکشی کر لیں۔ ایک حساس تتلی اور ایک چہکتی چڑیا انسان کے ظلم و جہل کا ویسے تو کوئی جواب دے نہیں سکتی۔ اس کے پاس تو کوئی deterrent نہیں ہے۔

مگر پھر وہی بات کہ ہمارے رونے گانے سے کیا ہوتا ہے۔ ارے ہم کس کھیت کی مولی ہیں۔ اس وقت تو کلنٹن صاحب کی کوئی نہیں سنتا۔ وہ ہائیں ہائیں کرتے رہ گئے۔ کس نے ان کی سنی۔ ہندوستان اور پاکستان کی ایٹمی دھوں دھاں میں امریکا کی فاں فوں دھواں بن کر اُڑ گئی زمانے کا یہ انقلاب بھی دیدنی ہے۔ ہم نے پاکستان میں دو بڑوں کے رعب میں آنکھ کھولی تھی۔ دونوں سپر پاور۔ دونوں کا جلال الاماں۔ چھوٹی قومیں دونوں کے جلال سے پناہ مانگتی تھیں۔ کوئی چھوٹی قوم ایک کی معتوب ہوتی تو سہم کر دوسرے کے دامن میں پناہ ٹٹولتی۔ دوسری لال پیلی نظروں سے دیکھتی تو پہلی کی آغوش میں چلی جاتی اور اپنے تئیں محفوظ جانتی۔

سویت روس کے ڈھے جانے سے رعب داب کا یہ توازن بگڑ گیا۔ معلوم ہے دبیر کے انتقال پر انیس نے کیا کہا تھا۔ افسوس سے کہنے لگے کہ اب مرثیہ کہنے کا لطف جاتا رہا۔ ٹھیک کہا۔ شعر و ادب ہو، سیاست ہو، اکھاڑہ ہو، کرکٹ کی فیلڈ ہو، کوئی بھی میدان ہو صاحب کمال

کے جوہر اسی صورت کھلتے ہیں اور اسی صورت اس کا دبدبہ قائم رہتا ہے کہ مقابل میں کم و بیش اتنا ہی بڑا صاحب کمال ہو۔ امریکا نے اس نکتہ کو سمجھا نہیں۔ تو پھر کیا ہوا۔ آگے تو نافرماں بردار بچے نافرماں برداری کے بعد بھی فرماں بردار رہتے تھے۔ ایک بڑے کے حکم کی نافرمانی کرتے تھے تو دوسرے کے فرماں بردار بن جاتے تھے۔ فرماں برداری کی وضع بہرحال قائم رہتی تھی۔ مگر اب تو لے دے کر ایک ہی بڑا رہ گیا ہے۔ جو اس کی حکم عدولی کرے گا وہ پھر کسی کا کہنا مانے گا۔ تو اب بچے بے کہے ہوگئے ہیں، سرکشی بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ مگر کس طرح۔ آگے تو بائیں بازو کے دانشوروں نے سرکشی پر کمر باندھی ہوئی تھی۔ اس سرکشی کی عجب صورت تھی کہ اس کے طفیل بائیں بازو کے دانشور کو ایک وقار حاصل ہو جاتا تھا۔ اور ادھر امریکا کا دبدبہ بھی بدستور قائم رہتا تھا۔ اب یہ مخلوق پاکستان میں ناپید ہے۔ سوویت روس کے زوال کے بعد پوری دنیا ہی میں یہ جنس کمیاب ہوگئی ہے۔ مگر اس سے امریکا کو کیا فائدہ پہنچا۔ نہیں، بلکہ اُلٹا نقصان پہنچا۔ امریکا دشمنی کا فریضہ مولوی ملاؤں نے سنبھال لیا۔ اس سے ہوا یہ کہ اس سے مولولی ملاؤں کو تو وہ بائیں بازو کے دانشور والا وقار حاصل نہیں ہوا۔ مگر امریکا بے وقار ہوگیا۔ اس کا جو رعب داب تھا یا دلّی کے کرخنداروں کے محاورے میں جو رعاب شعاب تھا وہ ختم ہوگیا۔ اس فرق کو یوں بھی سمجھ سکتے ہیں کہ تحریک مزاحمت میں جو بائیں بازو والوں کا طریقہ واردات تھا بڑی طاقت کا دبدبہ آہستہ آہستہ غیر محسوس طریقہ پر کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ اسی تناسب سے مزاحمت کرنے والوں کا وقار بڑھتا چلا جاتا ہے۔ دہشت گردی میں جو موخر الذکر گروہ کا طریقہ واردات ہے بڑی طاقت کا رعاب شعاب دیکھتے دیکھتے ختم ہو جاتا ہے۔ مگر دہشت گردوں کو وقار حاصل نہیں ہوتا۔ بس ان کی دہشت دلوں پر بیٹھ جاتی ہے۔

خیر تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ بچے بے کہنے ہوگئے ہیں، سرکشی بڑھتی چلی جا رہی ہے اور جو بڑے بنے بیٹھے تھے ان کا دبدبہ قائم نہیں رہا۔ ایسے میں ایٹم بم چھوٹوں کے ہاتھوں میں آ گیا تو کیا گل کھلائے گا۔

خیر آگے کیا ہوگا، یہ تو حالات بتائیں گے۔ فی الحال تو ہمارا سر فخر سے بلند ہوگیا ہے۔ مگر دیکھیے اسی ہنگام ہمارے دوست انور سجاد نے کیا شگوفہ چھوڑا ہے۔ عین اس وقت جب پیپلز پارٹی



والے لوگوں کو یاد دلا رہے تھے کہ ایٹم بم کے کام کا آغاز اصل میں بھٹو صاحب نے کیا تھا تو انور سجاد نے اپنی تحقیق سے یہ انکشاف کیا کہ پاکستان کے لیے ایٹم بم کا خواب سب سے پہلے منٹو صاحب نے دیکھا تھا۔ حوالہ ان تحریروں کا دیا جو منٹو صاحب نے چچا سام کے نام خطوط کی صورت میں لکھی تھیں۔ یہ مضمون اس یار نے ایک اخبار کی طرف سے ہونے والے ایک مذاکرے میں پڑھا اور ازراہ عنایت مجھے پڑھنے کے لیے دیا۔ میں نے یہ مضمون پڑھا اور ورطہ حیرت میں غرق ہوا کہ اچھا منٹو صاحب نے ایسا خواب بھی دیکھا تھا۔ انور سجاد کا کہنا تھا کہ منٹو صاحب کا یہ خواب کسی صاحب عمل کا منتظر تھا۔ اس مرد عمل نے ذوالفقار علی بھٹو کی صورت میں ظہور کیا جس نے اس خواب کو جامہ عمل پہنایا۔

مجھے چچا سام کے خطوط ایک مرتبہ پھر پڑھنے پڑے۔ اور یہ خطوط پڑھ کر میں نے ایک مرتبہ پھر دریائے حیرت میں غوطہ لگایا۔ یہ غوطہ انور سجاد کے نام کا تھا۔ منٹو صاحب نے کیا لکھا تھا اور اس عزیز نے کیا سمجھا۔ منٹو صاحب انور سجاد برانڈ کا تجریدی افسانہ تو نہیں لکھتے تھے کہ جس کے جیسے مزاج میں آیا ویسے معنی نکال لیے۔ وہاں تو سیدھا سادھا طنزیہ انداز ہے۔ چچا سام سے پوچھا جا رہا ہے کہ یہ ہائیڈروجن بم کیوں بنایا جا رہا ہے۔ کس کس ملک کو صفحہ ہستی سے مٹانا مقصود ہے۔ اور اگر یہ ہے تو ایک چھوٹا سا ایٹم بم اپنے بھتیجے کو بھی عنایت ہو۔ وہ استنجے کے ڈھیلے والوں سے بہت تنگ ہے۔ ان کا قصہ چکا دیا جائے۔ لیجیے مجھے تقسیم سے فوراً پہلے کی بنی ہوئی بمبئی کی ایک فلم ''آٹھ دن'' یاد آ گئی۔ منٹو صاحب نے اس میں کام کیا تھا۔ شاید اس کا اسکرپٹ بھی انہوں نے ہی لکھا تھا۔ انہوں نے ایک ایسے نیم دیوانے کا کردار ادا کیا تھا جس کے ہاتھ میں ایک گولا ہے۔ اسے وہ ایٹم بم بتاتا ہے اور بار بار دھمکی دیتا ہے کہ کہو تو ایٹم مار دوں۔ لیجیے اس فلم کے خیال نے مجھے اور ڈرا دیا۔ خیر میں تو بزدل ہوا۔ ویسے اس وقت برصغیر کے لوگ بالعموم ایٹم بم کے سحر میں ہیں۔ بعض کے یہاں اندیشہائے دور دراز ہیں۔ مگر بہت سے ایسے ہیں جو خوش ہیں کہ کیا شئے مٹھی میں آئی ہے۔ تو ذہنوں پر اثرات الگ الگ قسم کے ہیں۔ مجھ پر اثر یہ ہوا کہ افسانہ نہیں لکھ پا رہا۔ انور سجاد پر دوسرے ہی قسم کا اثر ہوا۔ عجب، ثم العجب... اس نے مار کسی انقلاب کو سلام کیا اور نظامِ محمدی کا کلمہ پڑھنے لگا۔ اس مضمون میں اس نے قوم سے اپیل

کی ہے کہ ہم ایٹمی طاقت تو بن گئے ہیں۔ اب ہمیں پاکستان کو محمدی فلاحی مملکت بنانے کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے:

یہ انقلاب مبارک ہو مومنوں کے لیے

مگر یہ دیکھیے کہ اس نئی صورتِ حال میں بھی انور سجاد نے اپنے لیے ایک بڑا مقصد تلاش کرلیا۔ میں پھر پیچھے رہ گیا۔ مجھے کہانی لکھنے کے چھوٹے سے مقصد سے آگے کوئی مقصد ہی نظر نہیں آتا۔ اور اب میری کہانی بھی ایک بحران سے دوچار ہے۔ جب قلم اٹھاتا ہوں تو وہی چاغی کا پہاڑ میری آنکھوں کے سامنے آن کھڑا ہوتا ہے۔ پہلے اس میں ہلکی سی لرزش ہوتی ہے۔ پھر اس کا رنگ متغیر ہونے لگتا ہے۔ اور ادھر میرا قلم چلتے چلتے رک جاتا ہے۔ قصہ حاتم طائی میں ایک پہاڑ بھی آتا ہے جو کوہِ ندا کہلاتا ہے۔ اس پہاڑ سے ہر تھوڑے عرصے کے بعد ایک پکار سنائی دیتی ہے جس سے لوگوں پر ایک ہیبت طاری ہوجاتی ہے۔ پوری بستی کوہِ ندا کی ہیبت میں سانس لے رہی ہے۔ یہاں کوئی پکار سنائی نہیں دیتی۔ بس اچانک پہاڑ کا رنگ متغیر ہونے لگتا ہے۔ مگر مجھ پر تو اس کا اثر وہی کوہِ ندا کی پکار والا ہوتا ہے۔ تو میری صورت یہ ہے کہ ایٹم بم کے سحر میں نہیں ہوں۔ میں اس پہاڑ کی اذیت بھری ہیبت میں سانس لے رہا ہوں۔ اس اذیت سے لبریز ہیبت سے نکلوں تو کہانی لکھوں۔ میرے اور کہانی کے بیچ یہ درد رسیدہ پہاڑ آن کھڑا ہوا ہے۔



# مورنامہ

اللہ جانے یہ بدروح کہاں سے میرے پیچھے لگ گئی، سخت حیران اور پریشان ہوں۔ میں تو اصل میں موروں کی مزاج پرسی کے لیے نکلا تھا۔ یہ کب پتا تھا کہ یہ بلا جان کو چمٹ جائے گی۔

وہ تو اتفاق سے اس چھوٹی سی خبر پر میری نظر پڑ گئی ورنہ اس ہنگامے میں مجھے کہاں پتا چلنا تھا کہ وہاں کیا واردات گزر گئی۔ ہندوستان کے ایٹمی دھماکے کی دھماکا خیز خبروں کے ہجوم میں کہیں ایک کونے میں یہ خبر چھپی ہوئی تھی کہ جب یہ دھماکا ہوا تو راجستھان کے مور سراسیمگی کے عالم میں جھنکارتے، شور مچاتے اپنے گوشوں سے نکلے اور حواس باختہ فضا میں تتر بتر ہوگئے۔

ویسے تو میں نے فوراً ہی ایک کالم لکھ کر اپنی دانست میں مور دوستی کا حق ادا کیا اور فارغ ہوگیا مگر فارغ کہاں ہوا۔ اس چھوٹی سی خبر نے میرے ساتھ وہی کیا جو منوجی کے ساتھ ان کے ہاتھ آجانے والی چھنگلیا جیسی مچھلی نے کیا تھا۔ وہ تو اسے گھڑے میں ڈال کر نچنت ہوگئے تھے مگر وہ تو پھیلتی چلی گئی۔ منوجی نے اسے گھڑے سے ناند میں، ناند سے کنڈ میں، کنڈ سے تلیا میں، تلیا سے ندی میں منتقل کیا مگر پھر وہ ندی میں بھی نہیں سمائی۔ پھر انھوں نے اسے اٹھا کر سمندر کا رخ کیا تو وہ چھوٹی سی خبر بھی یا وہ واقعہ جسے اخبار والوں نے ایک کالمی سرخی والی دو سطری خبر سمجھا تھا، میرے تصور میں پھیلتا چلا گیا۔ آغاز ان موروں کی یاد سے ہوا جنھیں میں نے جے پور کے ایک سفر کے دوران دیکھا تھا۔ سبحان اللہ، کیا ترشا ترشایا گلابی گلابی شہر تھا۔ اس شہر میں میں نے دوپہر میں قدم رکھا تھا۔ ان اوقات میں تو کسی وجود کا احساس نہیں ہوا تھا لیکن جب دن ڈھلے میں نے اس دلہن ایسے سجے سجائے ریسٹ ہاؤس میں اپنے کمرے کی کھڑی

کھول کر باہر جھانکا تو کیا دیکھتا ہوں کہ سامنے پھیلے ہوئے صحن میں، فوارے کے اردگرد چبوترے، پھر منڈیروں پر مور ہی مور۔ کتنے سکون کے ساتھ اور کتنی خاموشی سے اپنی نیلی چمکیلی لمبی دموں کے ساتھ ایک شاہانہ وقار کے ساتھ چہل قدمی کر رہے تھے۔ ان کی اس چہل قدمی میں شاہانہ وقار کے ساتھ کتنی شانتی تھی۔ اس آن وہ سارا دیار مجھے شانتی کا گہوارہ نظر آیا۔ شانتی کا، حسن کا اور محبت کا۔

اگلی شام جب میں اس شہر سے نکلنے لگا تو جس ٹیلے، جس پہاڑی پر نظر گئی وہاں موروں کا ایک جھرمٹ نظر آیا۔ اسی طرح خاموش۔ ان کی چہل قدمی میں وہی وقار، ویسی ہی شانتی۔ تھوڑی ہی دیر میں شام کا دھندلکا پھیل گیا اور پوری فضا موروں کی جھنکار سے لبریز ہوگئی۔ میں نے جانا کہ یہ مسافر نواز میری ہی خاطر یہاں آس پاس کے ٹیلوں اور درختوں پر اترے ہوئے تھے۔ اب وہ اپنے مہمان کو الوداع کہہ رہے ہیں۔

اور اب جب میں نے اس سفر کو یاد کیا تو میری ساری فضائے یاد موروں سے بھر گئی اور میں حیران ہوا کہ اچھا وہاں اتنے موروں سے میری ملاقات ہوئی تھی، جیسے راجستھان کے سارے مور میرے اردگرد اکٹھے ہوگئے ہوں۔ مگر اب وہاں کیا نقشہ ہوگا۔ میں دھیان ہی دھیان میں پھر اس دیار کی طرف نکل جاتا ہوں۔ میں حیران و پریشان بھٹکتا پھر رہا ہوں۔ نہ کوئی مور دکھائی پڑ رہا ہے نہ ان کی جھنکار سنائی پڑ رہی ہے۔ وہ سب کہاں چلے گئے، کس کھوہ میں جا چھپے۔ دور ایک ٹیلے پر نظر گئی۔ ایک نچا کھسٹا مور بیٹھا دکھائی دیا۔ میں تیز قدم اٹھاتا اس طرف چلا مگر میرے پہنچنے سے پہلے اس نے ایک ہراس آمیز آواز نکالی، اڑا، اور فوراً ہی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

وہ مور اڑ کر کدھر گیا؟ یہاں اکیلا بیٹھا کیا کر رہا تھا؟ اس کے سنگھی ساتھی، موروں کے جھرمٹ کے جھرمٹ، وہ سب کہاں گئے؟ وہ اس طرح ویرانی کی تصویر بنا کیوں نظر آ رہا تھا؟ اتنا اجڑا اجڑا، اتنا نچا کھسٹا کیوں نظر آ رہا تھا؟ ویرانی کی اس تصویر سے میرا دھیان ویرانی کی ایسی ہی ایک اور تصویر کی طرف چلا گیا جسے میں بھلا بیٹھا تھا اور جو اس وقت اچانک میرے تصور میں ابھر آئی تھی۔ سمندر کے شفاف پانی میں گھلتا ہوا گاڑھا گاڑھا پٹرول، پانی کی رنگت



بدلتی چلی جا رہی ہے، پٹرول کی آلودگی سے کچھ سیاہی مائل نظر آ رہا ہے اور اجاڑ ساحل، یہ ایک اکیلی مرغابی اس آلودہ پانی میں نہائی ہوئی ساکت بیٹھی حیرت سے سمندر کو تک رہی ہے۔ جو پانی کل تک اس کے لیے امرت کا مرتبہ رکھتا تھا آج زہر بن گیا ہے۔ اس کے پر بھاری ہوگئے ہیں کہ اب وہ اڑنے جوگی نہیں رہی اور زہر جیسے نس نس میں اتر گیا ہو۔ عراق امریکا جنگ کی ساری ہولناکی اس آن میرے لیے اس مرغابی میں مجسم ہوگئی تھی۔ مجھے دکھ ہوا کہ یہ مرغابی اس وقت کتنی اذیت میں ہے اور حیرانی ہوئی کہ آدمیوں نے اس ہنگام جو کچھ ایک دوسرے کے ساتھ کیا، صدام حسین نے عراقیوں کے ساتھ، عراقیوں نے کویتیوں کے ساتھ، امریکا نے عراقیوں کے ساتھ اس سارے عذاب کو اس غریب مرغابی نے اپنی جان پر لے لیا ہے۔ عجب بات ہے جب بپھری وقت پڑتا ہے تو بڑے بڑے جان بچا کر نکل جاتے ہیں۔ کوئی ننھی سی جان اذیت کے اس بارگراں کو اکیلی سنگھوا لیتی ہے۔ اس گھڑی وہ مرغابی مجھے ایک جلیل القدر داستانی پرندہ نظر آئی، جیسے اس میں کسی پیغمبر کی روح سما گئی ہو کہ اس زور پر اس نے انسانی امت کا سارا عذاب ایک امانت جان کر اپنے کاندھوں پر لے لیا ہے۔

میری کم نظری تھی کہ میں نے اس مرغابی کے مرتبے کو نہیں پہچانا۔ احساس ہی نہیں ہوا کہ یہ مرغابی تو ایک پیمبرانہ شان رکھتی ہے۔ ہمارے عہد کی علامت ہے۔ آدمی اس زمانے میں جو آدمی کے ساتھ کر رہا ہے اور اپنے زعم آدمیت میں جو کچھ فطرت کے ساتھ کر رہا ہے، یہ اس سب کی کہانی سنا رہی ہے۔ مجھے خیال ہی نہیں آیا کہ مجھے اس پر کہانی لکھنی چاہیے۔ کتنی آسانی سے میں نے اس مرغابی کو فراموش کر دیا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ بے چاری صرف مرغابی تھی اور مور جن پر میں کہانی لکھنے کے لیے بے چین ہوں صرف مور نہیں ہیں۔ فرض کرو کہ اس مرغابی کی جگہ کوئی راج ہنس ہوتا۔ راج ہنس، مگر راج ہنس اب اس دنیا میں کہاں ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ اس برصغیر کی وشال دھرتی پر دو پرندے راج کرتے تھے اور یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ پرندوں کا راجا کون ہے، راج ہنس یا مور۔ اب وہ راج ہنس کہاں ہیں اور وہ موتی ایسی جھیلیں کہاں ہیں جہاں وہ اترا کرتے تھے اور مور راج کماریاں کہاں ہیں جو اپنے محل کی فصیل پر اتر آنے والے راج ہنس پر عاشق ہو جایا کرتی تھیں اور اسے اپنے آنگن میں اتارنے کے لیے

اپنی مالا کے موتی بکھیر دیا کرتی تھیں۔ وہ راج ہنس موتی چگتے تھے اور مانسرو ور جھیل کے شفاف پانی میں تیرا کرتے تھے۔ اب مانسرو ور جھیل کہاں ہے؟ لگتا ہے کہ سب جھیلیں خشک ہوگئیں۔ ندیوں کا پانی میلا ہوگیا۔ فضا بارود، دھوئیں، خاک دھول سے اٹی ہوئی ہے۔ نعروں اور دھماکوں کے شور سے آلودہ ہے۔ راج ہنس پاکیزہ فضا اور شفاف پانیوں کی تلاش میں کہیں دور نکل گئے۔ پیچھے بس مرغابیاں اور قازیں رہ گئیں۔ زمانے کا عذاب وہ سہتی ہیں۔ راج ہنس قصے کہانیوں کی دنیا میں پرواز کرتے ہیں۔

ایک مور تھا جو ابھی تک اپنے طاؤسی وقار کے ساتھ ٹکا ہوا تھا اور ماضی اور حاضر کے درمیان پل کی حیثیت رکھتا تھا۔ اب بھی باغوں سے اس کی جھنکار اس طرح آتی تھی جیسے ماضی قدیم سے دیومالائی زمانوں سے تیرتی ہوئی آ رہی ہے۔ راجستھان میں تو مجھے مور کی کوئی آواز نہیں سنائی دی تھی۔ یہ آوازیں کہاں سے آ رہی ہیں؟ میں کھنچا چلا جاتا ہوں۔ راجستھان بہت پیچھے رہ گیا ہے۔ یہ میری بستی ہے، میرے بچپن کی دنیا۔ ساون بھادوں کی بھیگی شاموں میں وہ کتنا غل مچاتے تھے۔ وہ تو بستی کے باہر باغ بغیچوں میں جھنکارتے تھے مگر ان کی جھنکار سے ساری بستی گونجتی تھی اور وہ ایک مور جو جانے کدھر سے اڑتا اڑتا آیا اور ہماری منڈیر پہ بیٹھ گیا۔ کتنی دیر چپ چاپ بیٹھا رہا۔ میں دبے پاؤں چھت پہ گیا۔ پیچھے سے سرکتے سرکتے منڈیر تک گیا۔ اس کی دم پکڑنے ہی کو تھا کہ اس نے جھرجھری لی اور فضا میں تیر گیا۔

''میرے لعل، مور کو تنگ نہیں کیا کرتے۔ یہ جنت کا جانور ہے۔'' نانی اماں نے مجھے سرزنش کی۔

''جنت کا جانور۔'' میں نے حیران ہوکر پوچھا۔ ''پھر یاں پہ کیا کر رہا ہے؟''

''ارے بیٹا اپنے کیے کی سزا بھگت رہا ہے۔''

''نانی اماں، کیا کیا تھا مور نے جو سزا بھگت رہا ہے۔''

''ارے بیٹا، معصوم تو ہے ہی شیطان کی چال میں آ گیا۔''

''کیسے آ گیا شیطان کی چال میں؟''

''وہ کم بخت بڈھا پھونس بن کر جنت کے دروازے پہ پہنچا۔ بہت منتیں کیں کہ



دروازہ کھولو۔ جنت کے دربان بھانپ گئے کہ یہ نحوست مارا تو شیطان ہے۔ انھوں نے دروازہ نہیں کھولا۔ مور جنت کی منڈیر پر بیٹھا یہ دیکھ رہا تھا۔ اسے بڈھے پر بہت ترس آیا۔ اڑ کر نیچے آیا اور کہا کہ بڑے میاں میں تمھیں جنت کی دیوار پار کرائے دیتا ہوں۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ شیطان فوراً ہی مور پہ سوار ہوگیا۔ مور اڑا اور اسے جنت میں اتار دیا۔ اللہ میاں کو جب پتا چلا تو انھیں بہت غصہ آیا۔ باوا آدم اور اماں حوا کو جنت سے نکالا تو مور کو بھی نکال دیا کہ جاؤ لبے بنو۔''

میں کتنا حیران ہوا تھا۔ بے چارہ مور! جنت کی منڈیر پہ بیٹھا کرتا تھا۔ اب ہماری منڈیر پہ آ کے بیٹھ جاتا ہے۔ میں نے نانی اماں سے کہا تو کہنے لگیں ''ہاں بیٹے، اپنی منڈیر چھٹ جائے تو یہی ہوتا ہے۔ اب تیری میری منڈیروں پہ بیٹھتا پھرتا ہے اور کہیں جو ٹک کے بیٹھ جائے۔''

منڈیروں، درختوں کے جھنڈ میں، ٹیلے پہ، جہاں بھی پنجے ٹکانے کو جگہ مل جائے۔ میں جب شراوستی کی راہ سے گزرا تھا تو میں نے اسے ایک ہرے بھرے ٹیلے پہ بیٹھے دیکھا تھا۔ کسی دھیان میں گم یا جیسے چپ چاپ کسی کی راہ تک رہا ہے۔ میں شراوستی بہت دیر سے پہنچا تھا۔ مہاتما بدھ کتنی برساتوں پہلے یہاں سے سدھار چکے تھے۔ اب وہ بھی یہاں نہیں تھا، جہاں وہ برسات کے دنوں میں آ کر باس کیا کرتے تھے۔ بس اب تو اس بستی کی یادگار تھوڑی اینٹیں پڑی رہ گئی تھیں۔ ذرا ہٹ کر ایک ہرے بھرے شاداب ٹیلے پر شاید اسی سمے کا ایک مور بیٹھا رہ گیا تھا جو گئے سمے کو، اس سمے کی شراوستی کو اپنی آنکھوں میں رمائے بیٹھا تھا اور کتنے سکون سے بیٹھا تھا۔ اس ایک دم سے اجڑی ہوئی شراوستی کی ساری فضا میں جیسے شانتی رچ گئی تھی۔

میں شراوستی میں زیادہ دیر نہیں رکا۔ مجھے واپس دلّی پہنچنا تھا۔ دلّی کی وہ شام بہت اداس تھی۔ کم از کم بستی نظام الدین میں تو اس کا یہی رنگ تھا۔ ابھی پچھلے دنوں کتنے خانہ برباد قافلہ در قافلہ یہاں سے نکلے تھے۔ اب خاموشی تھی اور برسات کی یہ شام بستی نظام الدین میں کچھ زیادہ ہی خاموش تھی۔ کچے احاطے کے بیچ غالب کی قبر اجڑی اجڑی تھی۔ احاطے کے گرد کتنی اونچی اونچی گھاس کھڑی تھی۔ اس کے بیچ سے میں گزر رہا تھا کہ پیچھے سے ایک مور نے مجھے

پکارا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ دکھائی تو نہیں دیا مگر اس کی پکار پھر سنائی دی۔ عجب پکار تھی، جیسے ہزار صدیاں مل کر مجھے پکار رہی ہوں۔

ہزار صدیوں کے کنارے پر پہنچ کر میں ٹھٹکا۔ اس مور کی آواز تو مجھے یہیں تک لے کر آئی تھی، مگر اب صدیوں کے اس پار سے موروں کی جھنکار سنائی دے رہی تھی۔ میں حیران۔ یا مولا یہ مور کون سے باغ سے بول رہے ہیں۔ میں نے قدم بڑھایا اور ایک نئی حیرانی نے مجھے آ لیا۔ یہ کون سا نگر ہے۔ فصیلیں بادلوں سے باتیں کرتی ہوئی، فصیلوں کے گرداگرد پھیلے ہوئے باغ، قسم قسم کے پھل، رنگ رنگ کی چڑیاں، باغ چڑیوں کی چہکار سے گونج رہے ہیں۔ ساری چہکار پر چھائی ہوئی دو آوازیں۔ کوئل کی کوک اور موروں کی جھنکار۔ ارے یہ تو پانڈوؤں کا نگر ہے۔ اندر پرستھ۔ یہ تو میں بہت دور نکل آیا۔ مجھے واپس چلنا چاہیے۔

بہت گھوم پھر لیا۔ بہت موروں کو دیکھ بھال لیا۔ کن کن وقتوں کے، کس کس نگر کے موروں کو دیکھا۔ ان کی جھنکار سنی۔ اب مجھے مور نامہ لکھنا چاہیے، مگر مجھے گھر واپس ہونے سے پہلے راجستھان کا پھر ایک پھیرا لگا لینا چاہیے۔ شاید وہ مور جو سراسیمگی کے عالم میں یہاں سے اڑ گئے تھے، واپس آ گئے ہوں۔

مور واقعی اچھی خاصی تعداد میں واپس آ گئے تھے مگر عجب ہوا کہ مجھے دیکھ کر وہ سخت ہراساں ہوئے اور چیختے چلاتے ہوئے ٹیلوں اور درختوں کی شاخوں سے اڑے اور فضا میں تتر بتر ہو گئے۔ بس اسی آن مجھے احساس ہوا کہ میں اکیلا نہیں ہوں۔ کوئی دوسرا میرے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ میں نے اپنے بائیں نظر ڈالی۔ میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ہیں یہ تو اشوتتھاما ہے۔ کوروکشیتر کا مہاپاپی۔ یہ یہاں کہاں اور میرے ساتھ کیوں چل رہا ہے۔ مجھے پتا ہی نہ چلا کہ کب وہ میرے ساتھ لگ لیا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ جب میں اندر پرستھ سے پلٹا ہوں تو کوروکشیتر کے پاس سے گزرا تھا۔ وہیں سے یہ منحوس شخص میرے ساتھ ہو لیا ہوگا۔ مگر کوروکشیتر میں تو اب سناٹا تھا۔ نہ آدمی نہ آدم زاد۔ یہ وہاں کیا کر رہا تھا۔ کیا تب سے وہیں بھٹک رہا ہے۔

جنگ آدمی کو کیا سے کیا بنا دیتی ہے۔ اشوتتھاما کو دیکھو اور عبرت کرو۔ درونا چاریہ کا بیٹا۔ باپ نے وہ عزت پائی کہ سارے سورما کیا کورو کیا پانڈو۔ اس کے سامنے ماتھا ٹیکتے تھے،



چرن چھوتے تھے۔ بیٹے نے باپ سے ورثے میں کتنا کچھ پایا مگر یہ ورثہ اسے پچا نہیں۔ اس جنگ کا سب سے ملعون آدمی آخر میں یہی شخص ٹھہرا۔

کہتے ہیں کہ سورماؤں کے استاد درونا چاریہ کے پاس وہ خوف ناک ہتھیار بھی تھا جسے برہم استر کہتے ہیں۔ دیکھنے میں گھاس کی پتی۔ چل جائے تو وہ تباہی لائے کہ دور دور تک جیو جنتو کا نام و نشان دکھائی نہ دے۔ بستی زد میں آ جائے تو دم کے دم میں راکھ کا ڈھیر بن جائے۔ درونا نے اس ہتھیار کا راز بس اپنے ایک ہی چیلے سورما کو منتقل کیا تھا۔ ارجن کو جو اس کا سب سے چہیتا چیلا تھا۔ جنگ بھی کیا ظالم چیز ہے۔ کوروکشیتر کے میدان میں استاد اور چیلا ایک دوسرے کے مقابل لڑ رہے تھے مگر دونوں نے قسم کھائی تھی کہ برہم استر استعمال نہیں کرنا ہے کیوں کہ اس کے چلنے کا مطلب تو یہ ہوگا کہ سب کچھ تباہ ہو جائے گا۔

درونا نے مرنے سے پہلے اپنے بیٹے اشوتتھاما کو برہم استر کا گر سمجھا دیا تھا مگر سختی سے تاکید کی تھی کہ کسی حال میں اسے استعمال کرنا نہیں ہے۔ مگر جب درونا جنگ میں مارا گیا تو اشوتتھاما کو روکنے ٹوکنے والا کوئی نہیں تھا۔ جنگ کے آخری لمحوں میں وہ جان پہ کھیلا اور برہم استر چلا دیا۔ جنگ کے آخری لمحوں سے ڈرنا چاہیے۔ جنگ کے سب سے نازک اور خوف ناک لمحے وہی ہوتے ہیں۔ جیتنے والے کو جنگ کو نبٹانے کی جلدی ہوتی ہے۔ ہارنے والا جی جان سے بیزار ہوتا ہے تو وہ خوف ناک ہتھیار جو بس دھمکانے ڈرانے کے لیے ہوتے ہیں آخری لمحوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ پھر بے شک شہر جل کر ہیروشیما بن جائے دل کی حسرت تو نکل جاتی ہے۔ جنگ کے آخری لمحوں میں دل کی حسرت کبھی جیتنے والا نکالتا ہے، کبھی ہارنے والا۔ کوروکشیتر میں آخر میں دل کی حسرت اشوتتھاما نے نکالی اور برہم استر پھینک مارا۔

تب سری کرشن ارجن سے بولے ”ہے جنارھن، درونا کے مورکھ پتر، تو نے برہم استر پھینک مارا۔ مجھے جیو جنتو سب نشٹ ہوتے دکھائی دے رہے ہیں۔ اس استر کا توڑ تیرے پاس ہے سو جلدی توڑ کر اس سے پہلے کہ سب کچھ جل کر بھسم ہو جائے۔“

تب ارجن نے اپنا برہم استر نکالا اور اشوتتھاما کے توڑ پر اسے سر کیا اور کہتے ہیں کہ جب ارجن کا بان چلا تو ایسی بڑی آگ بھڑکی کہ تینوں لوک اس کے شعلوں کی لپیٹ میں

آگئے۔ اس کی دھمک اس بن تک بھی پہنچی جہاں ویاس رشی بیٹھے تپ کر رہے تھے۔ انھوں نے تپسیا بیچ میں چھوڑی۔ ہڑبڑا کر اٹھے اور اڑ کر کوروکشیتر پہنچے۔ اشوتھاما اور ارجن کے بیچ آن کھڑے ہوئے اور دونوں ہاتھ اٹھا کر چلائے کہ دشٹو یہ تم نے کیا انیائے کیا۔ ساری سرشٹی جل کر بھوبھل بن جائے گی۔ جیو جنتو کا وناش ہو جائے گا۔ اپنے اپنے استر واپس لو۔

ارجن نے اس مہان اتما کے چرن چھوئے۔ ہاتھ جوڑ کے کھڑا ہو گیا اور فوراً ہی اپنا استر واپس لے لیا۔

پر اشوتھاما ڈھٹائی سے بولا کہ ''ہے مہاراج، میں نے تو استر چلا دیا۔ اسے واپس لینا میرے بس میں نہیں ہے۔ بس اتنا ہی کر سکتا ہوں کہ اس کی سیما بدل دوں۔ سو اب یہ استر پانڈوؤں کی سینا پہ نہیں گرے گا۔ پانڈوؤں کی استریوں پہ گرے گا۔ جسے گربھ رہا ہے اس کا گربھ گر جائے گا۔ جس کی کوکھ میں بچہ پل رہا ہے وہ بچہ مر جائے گا۔ پانڈو سنتان کا اس پرکار انت ہو جائے گا۔''

اس آن سری کرشن جی کلس کر بولے۔ ''ہے درونا کے پاپی پتر، تیرا وناش ہو۔ تو نے بالک ہتیا کا پاپ کیا ہے۔ میں تجھے شاپ دیتا ہوں کہ تو تین ہزار برس اس طور جیئے گا کہ بنوں میں اکیلا مارا مارا پھرے گا۔ تیرے زخموں سے سدا خون اور پیپ ایسی رسا کرے گی کہ بستی والے تجھ سے گھن کھائیں گے اور دور بھاگیں گے۔''

میں بھی تو اس سے دور ہی بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا مگر وہ تو سائے کی طرح میرے پیچھے لگا ہوا تھا۔ یا اللہ میں کدھر جاؤں، کیسے اس نحوست سے اپنا پیچھا چھڑاؤں۔ اچانک ایک خیال آیا کہ میرا بائی کی سمادھی یہیں کہیں ہے، وہاں جا کر چھپ جاؤں۔ پھر یاد آیا کہ ارے ہاں خواجہ معین الدین چشتیؒ کی درگاہ بھی تو اسی نواح میں ہے۔ اگر اس درگاہ میں پہنچ جاؤں تو پھر تو سمجھو کہ اس کی زد سے بچ گیا۔ وہاں درگاہ میں اسے کون گھسنے دے گا۔ بس اس طرح کے خیال مجھے آ رہے تھے لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سے آنکھ بچا کر کیسے نکلوں۔ جس راہ جاتا وہ پرچھائیں کی طرح ساتھ ساتھ چلتا۔ اُدھر موروں نے شور مچا رکھا تھا۔ کتنی ہراس بھری آوازوں میں چلا رہے تھے، یعنی وہ مور جو بچے رہ گئے تھے۔ ادھر پانڈوؤں کے گھروں سے عورتوں کے



بین کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ہر گھر ماتم کدہ بنا ہوا تھا۔ وہاں مرے ہوئے بچے پیدا ہو رہے تھے اور ارجن کے گھر میں تو قیامت مچی ہوئی تھی۔ سبھدرا کس درد سے بین کر رہی تھی۔ اس کی کوکھ کا جنا ابھیمنیو پہلے ہی کوروکشیتر میں کھیت ہو چکا تھا۔ اسے رو دھو کر اس نے بہو سے آس لگائی تھی کہ وہ پوت جنے گی۔ اس پوت سے ارجن کے اندھیرے گھر میں اجالا ہوگا اور پانڈوؤں کی سنتان آگے چلے گی مگر ہوا وہ جو اشوتھاما نے کہا تھا۔ اترا بے ہوش پڑی ہے۔ بچہ مرا ہوا پیدا ہوا ہے۔ پانڈوؤں کے کسی گھر میں اب اجالا نہیں ہوگا۔ برہم استر نے ان کی استریوں کی کوکھوں کو اجاڑ ڈالا ہے مگر سبھدرا نے امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے۔ بھائی کا وعدہ اسے یاد ہے۔ کرشن نے وعدہ کیا تھا کہ بہنا، تیری بہو کی کوکھ کو اجڑنے نہیں دوں گا تو انھوں نے اوتار ہونے کے ناتے مردہ بچے میں جان ڈال دی ہے اور بتا دیا ہے کہ یہ بالک بڑے ہو کر ہستنا پور کے سنگھاسن پہ بیٹھے گا۔ پانڈوؤں کا نام روشن کرے گا مگر اس مرے ہوئے بچے نے زندہ ہو کر عجب سوال کیا۔ جب سنگھاسن پہ بیٹھا اور ویاس جی آشیرواد دینے کے لیے بنوں سے نکل کر آئے اور اس کے دربار میں براجے تو اس نے گلاب کیوڑے کے پانی سے چلمچی میں ان کے پاؤں دھوئے۔ پھر چرن چھوئے اور ہاتھ باندھ کے کھڑا ہو گیا ''میرے پرکھ آ گیا ہو تو ایک ہرشن پوچھوں۔''

''پوچھ بیٹا۔''

''ہے مہاراج، کوروکشیتر میں میرے سب ہی بڑے موجود تھے، اِدھر بھی اور اُدھر بھی اور دونوں ہی طرف گنی گیانی بدھیمان موجود تھے۔ پھر انھیں یہ سمجھ کیوں نہ آئی کہ یدھ مہنگا سودا ہے۔ سب کچھ اجڑ جائے گا، وناش ہو جائے گا۔''

ویاس جی نے لمبا ٹھنڈا سانس بھرا، بولے۔ ''پتر' یدھ میں اچھے اچھے مانو کی مت ماری جاتی ہے اور ہونی کو کون روک سکتا ہے؟''

اور رشی جی ترنت اٹھ کھڑے ہوئے۔ جن بنوں سے آئے تھے، الٹے پاؤں انھیں بنوں میں چلے گئے۔

رشی لوگ ان بھلے وقتوں میں ہزاروں برس کے حساب سے زندہ رہتے تھے۔ ارجن کا

پتا رشی نہیں تھا۔ اسے سانپ نے ڈس لیا اور وہ مر گیا مگر اس نے ویاس جی سے جو سوال کیا تھا اس سوال نے ویاس جی سے زیادہ عمر پائی۔ میں جب راجستھان میں بھٹک رہا تھا تو یہ سوال مجھے ملا تھا۔ جہاں اشوتتھاما بھٹکتا پھر رہا تھا وہاں یہ سوال بھی آس پاس بھٹکتا دکھائی دیا۔ اس نے بھی میرا بہت پیچھا کیا۔ یہ سمجھو کہ میں دو سایوں کے بیچ چل رہا تھا۔

پہلے میں اشوتتھاما کو دیکھ کر حیران ہوا تھا کہ اچھا اس مورکھ کے ابھی تین ہزار برس پورے نہیں ہوئے ہیں۔ پھر جب ہریکشتھ والے سوال سے مڈھ بھیڑ ہوئی تو میں اور حیران ہوا کہ اچھا یہ سوال بھی ابھی تک چلا آ رہا ہے بلکہ مجھے لگا کہ اب یہ سوال زیادہ گمبھیر ہو گیا ہے۔ مانو پوری پاک بھارت دھرتی پر منڈلا رہا ہے جیسے کسی کے سر پہ تلوار لٹکی ہو۔ ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ یہ جواب تو نہ ہوا۔ ویاس جی نے سوال کو ٹالا تھا، جواب نہیں دیا تھا۔ تب ہی تو وہ تب سے فضا میں بھٹکتا پھر رہا ہے اور جواب مانگ رہا ہے۔ یک نہ شد دو شد۔ میری جان کے لیے اشوتتھاما کم تھا کہ یہ سوال بھی میری جان کو لگ گیا۔

خیر میں پہلے اشوتتھاما سے تو اپنی جان چھڑاؤں۔ کتنی مرتبہ اسے غچہ دینے کی کوشش کی۔ اچانک راہ بدل کر دوسری راہ پر ہو لیا۔ سمجھا کہ اسے پتا نہیں چلا مگر تھوڑی دیر بعد پتا چلا کہ وہ تو پھر میرے آس پاس چل رہا ہے۔

میں نے سوچا کہ یہ میرا کتنا پیچھا کرے گا۔ مجھے تو اپنے دیار واپس چلے جانا ہے۔ یہ اس دیار کی مخلوق ہے۔ حد سے حد سرحد تک میرا پیچھا کرے گا۔ آگے اسے کون جانے دے گا۔ پھر بھی میں نے کوشش کی کہ اس سے آنکھ بچا کر نکل جاؤں۔ بعد میں اسے پتا چلے کہ میں یہاں سے نکل گیا ہوں اور اس کی زد سے باہر ہوں۔

میں واقعی اس سے آنکھ بچا کر نکل آیا تھا۔ کیسی تڑی دی۔ اس کے فرشتوں کو بھی پتا نہیں چلا کہ میں کب وہاں سے نکلا اور کب سرحد پار کی۔ اپنی سرحد میں قدم رکھنے کے بعد اطمینان کا لمبا سانس لیا۔ خدا کا شکر ادا کیا کہ اس بدروح سے میں نے نجات پائی۔ مجھے بیتال پچیسی کی کہانی یاد آئی مگر وہ تو کہانی تھی۔ اس طرح تو کہانیوں ہی میں بھوت جان کو چمٹا کرتے ہیں مگر میرے ساتھ تو واقعی ایسا ہوا۔ خیر بلا سے پیچھا چھوٹا، اب میں نچنت تھا۔ سوچ رہا تھا کہ



میں جگ جگ کے موروں سے مل لیا ہوں۔ کس کس نگر کے مور کی جھنکار سنی ہے۔ اب میں اطمینان سے گھر بیٹھ کر مورنامہ لکھوں گا۔ دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ جن جن موروں کو دیکھا تھا وہ اب ایک دم سے میرے تصور میں منڈلانے لگے۔ ان کی شیریں جھنکار سے میرا سامعہ گونج گیا۔ پھر مجھے لگا کہ جیسے میں مور کے سائے میں چل رہا ہوں۔ جگت مور جس کی دم کھڑی ہو کر پنکھے کی شکل کی بن گئی ہے اور ساری فضا پر محیط ہو گئی ہے۔ جگت مور رقص کر رہا ہے۔

میں جب اپنے گھر کے قریب پہنچا ہوں تو اچانک مجھے اپنے پیچھے قدموں کی آہٹ کا احساس ہوا جیسے کوئی دبے پاؤں میرے پیچھے پیچھے آ رہا ہے۔ میں نے دفعتاً پلٹ کر دیکھا اور میرے قدم سو سو من کے ہو گئے، اشوتتھاما میرے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ یہ کم بخت تو یہاں بھی آ گیا۔ اب میں کیسے اس سے چھٹکارا پاؤں گا؟

تب میں رویا اور میں نے گڑگڑا کر پالنے والے سے پوچھا کہ اے مرے پالنے والے، اے مرے رب، اس پریت کے تین ہزار سال آخر کب پورے ہوں گے؟ کب میں اپنا مورنامہ لکھ پاؤں گا؟

# خالی ہوا یہ دل

نانا جی میری انگلی تھامے گاؤں کی پگڈنڈی پر کھڑے دُور تک پھیلی ہوئی نمک اُگلتی بے حس زمین کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اور اپنی آستین سے آنکھوں سے بہتا ہوا نمک صاف کرتے ہوئے بار بار کہہ رہے تھے،''میں تمھیں نہیں بچاسکا۔ مجھے معاف کر دینا۔ میں تمہارا کوئی علاج نہیں کرا سکا۔''

گاؤں کے سب لوگ ایک ایک کر کے جا رہے تھے۔ نانا جی اُن کو روکنا چاہتے تھے۔ اُن کا خیال تھا حکومت کی مدد سے وہ زمین کی بیماری کا علاج کرانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ وہ چھٹی کے دن اپنے چھوٹے سے ٹائپ رائٹر پر درخواستیں لکھتے اور سارا ہفتہ ایک سے دوسرے دفتر پہنچاتے لیکن کہیں شنوائی نہ ہوئی۔ آخر میں وہ کئی منزلہ عمارت کے نیچے (جس میں ہر قسم کے سرکاری دفاتر تھے) بڑے گیٹ کے سامنے کھڑے ہو کر رندھی ہوئی آواز میں فریاد کرنے لگے۔

''کیا آپ کو پتہ ہے نہری آبپاشی کی وجہ سے زمین کی تہہ میں پانی کی سطح اُونچی ہو جاتی ہے اور وہ مٹی کی نمکیات کو جذب کر لیتا ہے اور پھر یہ نمکین پانی...... زمین کی سطح پر آ جاتا ہے جو زمین کے لیے زہر ہے؟'' لوگ نفی میں سر ہلاتے تو وہ جوش میں بولنے لگتے۔

''دنیا بھر میں نہری آبپاشی سے سیراب ہونے والی زمین کا پانچواں حصہ تھور کے مرض کا شکار ہے۔ ہمیں زمین کو بچانے کے لیے ڈیم بنانے والوں کے خلاف مہم چلانی ہوگی۔''

''اتنا وقت کس کے پاس ہے؟'' لوگ چلتے چلتے جواب دیتے۔

''وقت تو نکالنا پڑے گا۔ ورنہ آپ کے ساتھ بھی وہی ہوگا جو ہمارے ساتھ ہوا ہے۔ ہماری زمین تھور کے مرض کا شکار ہوگئی ہے'' نانا جی راستہ روک کر لوگوں کو قائل کرنے کی کوشش



کرتے۔

''کراچی کے لوگوں کے پاس اپنی زمین ہے نہ آسمان۔ ہم فلیٹوں میں رہتے ہیں۔ تم بھی ادھر بسنے آ جاؤ بابا'' کئی لوگ ہنستے ہوئے آگے بڑھ جاتے۔

پھر یوں ہونے لگا کہ لوگ اُنھیں دُور سے دیکھتے ہی تیزی سے مُڑ کر دوسرے گیٹ کی طرف چل دیتے اور نانا جی اکیلے کھڑے اُنھیں حسرت سے جاتا دیکھتے رہ جاتے۔ زمین کو تھور کی بیماری سے بچانے کے لیے وہ کوئی مہم نہ چلا سکے اور مایوس ہو کر واپس گاؤں آ گئے۔

گاؤں چھوڑنے کا دُکھ مجھے بھی ہوا تھا۔ اس لیے نہیں کہ گاؤں والوں کے ساتھ میری اچھی یادیں جڑی ہوئی تھیں بلکہ اس لیے کہ یہ دُکھ میرے نانا کا دُکھ تھا اور میں اُن کو کسی صورت بھی دکھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ شاید نانا جی ابھی اور ڈٹے رہتے اور گھر میں بیٹھے اخبارات کو خطوط لکھتے رہتے لیکن اسلام آباد سے ماموں اُنھیں لینے آ گئے۔ میں نے پہلی بار نانا جی کو اس قدر غصّے میں بلند آواز سے بولتے ہوئے سنا تھا۔''ایئر کنڈیشن کمروں میں بیٹھ کر فیصلہ کرنے والے اجتماعی مفاد کی بات کرتے ہیں۔ یہاں آئیں اور لو کے تھپیڑے محسوس کریں جو ہم اپنے پھیپھڑوں میں اتارتے ہیں اور کھیتوں پر اناج اگاتے ہیں۔ اجتماعی مفاد کے لیے ہر بار غریب اور بے بس لوگوں کو کیوں قربانی دینی پڑتی ہے؟''

ماموں خاموش سنتے رہے۔ جب نانا جی خوب بول چکے تو وہ نانا جی کی طرف دیکھے بغیر اُن کی کتابیں دفتی کے ڈبوں میں ڈالتے ہوئے کہنے لگے،''آپ تو شکر کریں۔ میں آپ کا بیٹا بیس گریڈ کا افسر ہوں۔ آپ کو اپنے ہاں رکھنے کے لیے میرے پاس بہت جگہ ہے۔ آپ کے لیے بہت سہولتیں ہوں گی۔ میں اس زمین کے بدلے حکومت سے کوئی اور زمین الاٹ کروا لوں گا۔ اسلام آباد میں کسی اچھی جگہ پر پلاٹ لے لوں گا۔ آپ دوسروں کی فکر کرنا چھوڑ دیں۔ گاؤں کے دوسرے لوگ کیا کرتے ہیں۔ کہاں جاتے ہیں۔ مرتے ہیں۔ جیتے ہیں۔ آپ کو اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔''

میں کتابیں اُٹھانے میں اُن کی مدد کرنے کے لیے اُٹھا تو اُن کی نظر مجھ پر پڑی۔ اُن کی نظروں میں وہی نفرت تھی جو میں اکثر اپنے کلاس کے لڑکوں کی آنکھوں میں دیکھا کرتا تھا۔

میرے ساتھ بنچ پر بیٹھنے والے ایک لڑکے نے بتایا تھا کہ اسلامیات والے استاد میرے خلاف بولتے ہیں۔ لیکن مجھے یقین نہیں آیا تھا۔ پھر ایک دن کلاس میں پڑھاتے ہوئے انہوں نے کہا تھا کہ جو لوگ گناہ کرتے ہیں، اللہ انہیں کھانے کے لیے کانٹے دیتا ہے اور دوزخ کی آگ میں جلاتا ہے۔ میں نے اُٹھ کر غصّے سے جواب دیا تھا کہ اللہ اپنے بندوں سے پیار کرتا ہے اور غلطیاں معاف کرتا ہے۔

مولوی صاحب اُٹھ کر میرے قریب آئے اور غصّے سے میرے ہاتھ پر زور سے چھڑی ماری اور کہا، ''کچھ گناہوں کی معافی نہیں ہوتی۔ مثلاً تمہاری ماں کا گناہ۔ اس نے ایک عیسائی سے شادی کی تھی۔''

''ہاں...... آں'' تمام لڑکوں کے منہ سے عجیب سی آواز نکلی۔ حیرت اور غصّے سے ملی جلی۔

میں اپنا بستر اور کتابیں ڈیسک پر چھوڑ کر گھر بھاگ آیا اور روتے ہوئے نانا کی گود میں چھپ گیا۔

''بیٹا عیسائی بھی ایک خدا کو مانتے ہیں اور پھر تمہارے ڈیڈی تمہاری ماں کی خاطر مسلمان ہوگئے تھے۔''

مجھے ناناجی کی بات پر یقین تھا۔ لیکن میں اسکول جانے کے لیے رضامند نہ ہوا۔ لڑکوں کا سامنا کرنے کی ہمت دلانے کے لیے وہ میرے ساتھ ماں کا نکاح نامہ لے کر اسکول گئے۔ اس وقت اسلامیات کی کلاس ہو رہی تھی۔

''یہ دیکھیے میری بیٹی کا نکاح نامہ۔ آپ آئندہ بچّے کے ساتھ کوئی ایسی بات نہ کریں جس سے اُسے کوئی نفسیاتی اُلجھن پیدا ہو۔ مذہب میں دل آزاری کو ناپسند کیا گیا ہے'' ناناجی کا لہجہ اس قدر نرم تھا کہ مولوی صاحب نے فوراً معافی مانگ لی۔ لیکن تھوڑی دیر بعد مسکراتے ہوئے کہا، ''ہم نے سنا ہے آپ کی بیٹی سے شادی کے لیے وہ مسلمان تو ہوگیا تھا لیکن امریکا جاتے ہی پھر عیسائی ہوگیا تھا۔''

ناناجی نے جواب دیے بغیر میری انگلی پکڑی اور مجھے لے کر گھر آ گئے۔ اس دن کے بعد اُنہوں نے مجھے کبھی اسکول نہیں بھیجا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ اب ناناجی مجھے خود پڑھائیں گے اور



میرا سارا وقت اُن کے ساتھ گزرے گا۔ میں اُن کے ساتھ کھیت کھیت گھومتا اور لائبریری میں بیٹھ کر پڑھتا۔

انہوں نے جب مجھے بتایا کہ بنگلہ دیش، بھارت اور پاکستان پہلے سب ہندوستان کا حصّہ تھے، پھر اختلافات ہوئے اور ہوتے گئے۔ مجھے بہت افسوس ہوا تھا۔ لیکن پھر انہوں نے ہی سمجھایا ہر ایک کو اپنی طرح زندگی جینے کا اختیار ہونا چاہیے۔ بھائی بھائی بھی تو زمین کا بٹوارہ کر لیتے ہیں۔ لیکن اس لین دین میں جھگڑے ہوتے ہیں انسانوں کو قتل کیا جاتا ہے۔ عورتوں کی بے حرمتی ہوتی ہے۔ خون کی ندیاں بہہ جاتی ہیں، بس وہ غلط ہے۔

وہ ہر موضوع پر بات کر سکتے تھے۔ ہر مضمون کے بارے میں جانتے تھے۔ اُن کے پاس دنیا بھر سے رسالے اور کتابیں آتی تھیں۔ بہت جلد مجھے احساس ہوا کہ ان کے ساتھ رہ کر میں بہت جلد بہت کچھ سیکھ گیا ہوں۔ وہ خود بھی کہنے لگے تھے کہ ''مولوی صاحب کی وجہ سے تمہارا گھر بیٹھنا بہتر ہوگیا۔ میں تمہیں وہ کچھ پڑھا دوں گا جو سب استاد مل کر بھی نہ پڑھاتے۔ اب استاد نصابی کتب کے علاوہ کچھ نہیں پڑھاتے۔ ہمارے زمانے میں ایسا نہیں تھا۔ ہم نصاب سے ہٹ کر بہت کچھ پڑھتے تھے۔ اسی لیے ہمارا علم وسیع ہوتا تھا۔'' وہ میری رہنمائی کرنے لگے اور میرا مطالعہ میرے علم میں اضافہ کرنے لگا۔ وہ مجھ دیکھ کر خوش ہوتے اور کہتے تم اپنے ہم عمر بچوں سے کئی سال آگے ہو۔ میرے پاس جتنا علم ہے تم میں منتقل کر دوں گا...... میں اُن کا جوش دیکھ کر اور بھی دلچسپی سے پڑھنے لگتا۔

ماموں کی نظریں ابھی تک مجھ پر جمی ہوئی تھیں اور میں ہاتھ میں کتابیں پکڑے اُن کی جانب یوں دیکھ رہا تھا جیسے وہ میرے بارے میں کوئی بھیانک اعلان کرنے والے ہیں۔

''آپ اسے اس کے باپ کے پاس امریکا کیوں نہیں بھیج دیتے؟'' مجھے ماموں سے اسی جملے کی توقع تھی۔

''کیوں بھیجوں؟ یہ میرے پاس رہے گا۔''

''آپ نے اپنی بیٹی میں ترقی پسندی منتقل کی تو کیا نتیجہ نکلا؟''

''میری بیٹی تمہاری بہن بھی تھی۔ یہ مت بھولو''

''ہاں لیکن میں نے اس کی طرح ایک سوشل ورکر سے شادی نہیں کی بلکہ ایک انڈسٹریلسٹ کی بیٹی سے شادی کی ہے اور آرام دہ زندگی بسر کر رہا ہوں۔''

''مجھے اسی بات کا افسوس ہے۔ تم عام آدمی سے کٹ چکے ہو۔''

''آپ کا سوشل ورکر داماد آپ کی بیٹی کو اپنے ساتھ امریکہ نہ لے جاسکا۔''

''وہ ضرور لے جاتا۔ اگر ایک ملک سے دوسرے ملک جانے کے لیے حکومتی پالیسی میں سہولت ہوتی۔ وہ کاغذی کارروائی تو کر رہا تھا۔''

''لیکن اُسے ضرورت کیا تھی غیر ملکی سے شادی کرنے کی۔ آپ نے اُسے بہت آزادی دے رکھی تھی۔ خوامخواہ این جی او میں کام کرنے کی اجازت دے دی تھی۔''

''اجازت تو میں نے تمہیں بھی دی تھی۔ اپنی طرح زندگی گزارنے کی۔''

''تو کیا میں نے اس کا ناجائز فائدہ اٹھایا؟''

''ناجائز فائدہ تو اُس نے بھی نہیں اُٹھایا۔ پھر جائز اور ناجائز ہونے کا پیمانہ کیا ہے؟ جو بات میری نظر میں جائز ہو تمہاری نظر میں ناجائز ہوسکتی ہے۔''

''پھر بھی کوئی معیار تو ہوتا ہے پرکھنے کا۔''

''میں صرف یہ جانتا ہوں۔ اس کی محبت کی موت نہیں ہوئی۔ وہ جتنا عرصہ زندہ رہی لوگوں کے کام آتی رہی۔ اور اپنی طبعی موت مری۔''

''جس بچے کی پیدائش کے دوران وہ مرگئی، اس کا کیا ہوگا۔ آپ نے یہ سوچا ہے؟''

''کیا ہوگا؟'' نانا جی نے چیختے ہوئے کہا۔ ''وہ یہاں خوش ہے''

دونوں خاموش ہوگئے۔

اس قسم کے جملوں کا تقاضا اُن کے خطوط میں بھی ہوتا تھا۔ بغیر کسی نتیجے پر پہنچے ہوئے اُن کے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ منقطع ہوجاتا تھا اور پھر کچھ عرصے کے بعد ماموں کا خط آتا۔ میری ترقی ہوگئی ہے۔ ایک اور گریڈ کا اضافہ ہوگیا ہے۔ نانا جا مبارک کا خط لکھتے۔ پھر خط و کتابت کا سلسلہ جاری ہوجاتا اور کسی تلخی پر ختم ہوجاتا۔

ہم اسلام آباد آگئے۔ ماموں کا بہت بڑا بنگلہ تھا۔ کئی گاڑیاں تھیں نوکر چاکر تھے اور اُن کی



ایک بیٹی تھی۔ اسکول کا نام کچھ اور تھا لیکن گھر میں سب اُسے شہزادی کہتے۔ ممانی کبھی کھانے کی میز پر نظر نہیں آئیں۔ میں اُنہیں اپنے کام میں باہر جاتے اور آتے دُور سے دیکھتا تھا۔ وہ مجھے اس طرح دیکھتی تھیں جیسے میں کسی نوکر کا بچّہ ہوں۔ شہزادی قیمتی کپڑے پہن کر میرے سامنے آ کر کھڑی ہوجاتی اور جب میں کتاب سے نظریں اُٹھا کر اُس کی طرف نہ دیکھتا تو وہ چڑ کر کمرے سے باہر چلی جاتی۔

وقت کے ساتھ مجھے احساس ہونے لگا تھا کہ مجھے جلد از جلد تعلیم مکمل کرنا ہے۔ میں نے اب او، لیول کی تیاری میں دن رات ایک کر دیا تھا۔ جب رزلٹ آیا تو سب سے زیادہ نانا جی کو خوشی ہوئی۔ میں نے ہر مضمون میں اے گریڈ لیا تھا۔ جب کہ شہزادی کئی مضامین میں فیل ہوگئی تھی۔ شہزادی کو اس بات کا کوئی ملال بھی نہیں تھا۔ اس کے خیال میں لڑکی کو تعلیم کی نسبت اپنے لباس اور چال ڈھال پر توجہ دینی چاہیے۔ کسی امیر گھرانے کی بہو بننے کے لیے جو معیار اُسے معلوم تھا وہ اس کے مطابق تربیت حاصل کر رہی تھی۔

اس دن ہم سب لوگ کھانے کی میز پر بیٹھے تھے۔ نو بجے کی خبریں بھی سن رہے تھے۔ ہندوستان نے ایٹمی دھماکے کا اعلان کر دیا۔ نانا جی اور ماموں کے ہاتھ سے نوالہ چھوٹ گیا۔ اور پھر کئی دن تک اخباروں اور رسالوں میں تفصیل آتی رہی۔

''سہ پہر تک پوکھرن کی ہوا خاموش رہی۔''

''ریگستان کانپ اٹھا!''

''دھماکے سے اٹھنے والے زلزلے کی لہروں نے وسیع ریت کے میدان کو کئی میٹر اوپر اٹھا لیا۔''

''اس ایٹمی تجربے سے جو حرارت پیدا ہوئی وہ دس لاکھ سینٹی گریڈ کے برابر تھی۔ یعنی اس درجۂ حرارت کے برابر جو سورج میں پایا جاتا ہے۔''

میں اور نانا جی خاموشی سے یہ خبریں پڑھتے اور ایک دوسرے کا منہ تکنے لگتے۔ مجھے معلوم تھا نانا جی کہہ رہے ہیں، انسان خود اپنے اُوپر ظلم کرتا ہے۔ میں اُن کے چہرے سے سب کچھ پڑھ سکتا تھا۔ ان کا کرب محسوس کرسکتا تھا۔ لیکن تسلی دینے کے لیے کیا کہتا...... میں خود اسی کرب

میں مبتلا تھا۔
اب کھانے کی میز پر ہم سب ایٹمی جنگ کی تباہ کاری پر گفتگو میں برابر کے شریک ہوتے۔ جس کو جہاں سے کوئی خبر یا اطلاع ملتی وہ کھانا کھاتے ہوئے سناتا۔

''دیہاتوں میں لہلہاتے کھیت جلنے لگیں گے۔''

''دریاؤں کا پانی زہر بن جائے گا۔''

''جب سب کچھ جل جائے گا تو گھور اندھیرا چھا جائے گا۔ اتنا دھواں اکٹھا ہوگا کہ سورج کو بھی ڈھانپ لے گا۔''

''درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے نیچے گر جائے گا۔''

''پانی زہریلی برف بن جائے گا۔ سمندری اور گھریلو جان دار سب مرجائیں گے۔''

''سنا ہے آیوڈین کی گولیاں کھالیں تو کچھ نہیں ہوتا''

''آیوڈین کی گولیاں کھانے کے لیے کون زندہ بچے گا؟''

دل دہلانے کی خبریں سب پڑھ رہے تھے اور ہر روز ایک دوسرے کو سنا رہے تھے لیکن اس کے باوجود ایک لہر اٹھی کہ پاکستان کو بھی ایٹمی دھماکا کرنا چاہیے۔ گویا یہ کرکٹ کا میچ تھا۔ ہندوستان جیت رہا تھا۔ اب پاکستان کو بھی زور لگانا تھا۔

ناناجی ہر روز مختلف اخبارات کے لیے مضامین لکھنے لگے۔

لاہور اور امرتسر میں تیس میل کا فاصلہ ہے۔ لاہور پر بم گرا تو پنجاب جل اُٹھے گا۔ اگر کراچی پر بم گرا تو راجستھان، گجرات اور بمبئی اس کی لپیٹ میں آجائیں گے۔

''ہم تو اللہ پر بھروسہ رکھنے والے لوگ ہیں۔ اللہ نے یہ کائنات ہمیں تحفے میں دی ہے۔ ہم اپنی تمام قوت مفلسی اور ناخواندگی ختم کرنے پر صرف کریں اور ایک تحریک چلائیں کہ ایٹمی ٹیکنالوجی ہونے کے باوجود ہم دھماکا نہیں کریں گے۔''

ناناجی ایک بار پھر دفاتر کی کئی منزلہ عمارتوں کے گیٹ کے قریب کھڑے ہو کر لوگوں کو روک کر بتانے لگے کہ ایٹمی دھماکے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ ''ہمیں ہیروشیما اور ناگاساکی کی مثال کو نہیں بھولنا چاہیے۔'' ریڈیو ایکٹو اثرات سے جو تباہی ہوگی اس کے بارے میں بتانے



لگتے۔ لوگ کچھ سنے بغیر کنی کترا کر نکل جاتے۔ جیسے اُنہیں کسی تباہی سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ ماموں نے ایک دن اُن کا ہاتھ پکڑ کر روک لیا اور سختی سے کہا، ''آج سے آپ کوئی مضمون لکھیں گے نہ کسی دفتر کے باہر کوئی تقریر کریں گے۔ غضب خدا کا آپ کو اتنا بھی اندازہ نہیں۔ میں کتنے اہم سرکاری عہدے پر فائز ہوں۔ تمام کاریں، سہولتیں اور عیش و آرام اسی عہدے کی بدولت ہیں۔ اگر کسی نے شکایت لگا دی تو میں عتاب میں آجاؤں گا۔ آپ مستقل باغیانہ قسم کے مضمون لکھے جا رہے ہیں۔''

''تو میں گھر چھوڑ کر چلا جاتا ہوں'' نانا نے غصے سے جواب دیا۔

''جہاں بھی جائیں گے، رہیں گے تو میرے باپ ہی ناں؟ آپ کی شناخت اب میرے حوالے سے ہوتی ہے۔ یہ مت بھولیں۔'' پھر اُنہوں نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ جو آپ کا نواسا ہر جگہ آپ کے ساتھ ہوتا ہے لوگ اسے کوئی ایجنٹ بھی سمجھ سکتے ہیں۔ صرف آپ کی خاطر میں نے اسے اپنے گھر میں پناہ دی ہوئی ہے۔''

''تو گویا تم بھی.....'' نانا جی کا حلق خشک ہو گیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں واپس آگئے۔

ابلیس یہی چاہتا تھا۔ اسی دن کے لیے اُس نے اللہ سے مہلت مانگی تھی۔ وہ دنیا جو چار ارب ساٹھ کروڑ سال پرانی ہے، اب نہیں بچ سکتی۔ ابلیس جیت گیا۔ انسان ہار گیا۔

مجھے محسوس ہوا نانا جی ایک دم بہت بوڑھے اور لاغر ہو گئے ہیں۔ جیسے اُن کی تمام توانائی نچوڑ لی گئی ہو۔ میں نے اُنہیں سہارا دے کر بستر پر لٹا دیا۔ پھر مجھے اُنہوں نے اپنے سوٹ کیس میں سے ایک بنڈل لانے کو کہا۔ میں بنڈل لے کر آیا تو کہا:

''تمہارے ڈیڈی سے میری خط و کتابت رہتی ہے۔ وہ مختلف ممالک میں ریڈ کراس کے لیے کام کرتا ہے۔ آج کل وہ بوسنیا کے لیے کام کر رہا ہے۔ میں نے اُسے تمہاری پیدائش کے بارے میں اس لیے نہیں بتایا تھا کہ وہ تمہیں پالنے کی ذمہ داری نہیں سنبھال سکے گا۔ اس بنڈل میں تمہارے والدین کا نکاح نامہ، تمہاری پیدائش کے کاغذات بھی ہیں۔ آج میں تمہیں اجازت دیتا ہوں۔ جہاں چاہو ہو جاؤ۔ اپنے جینے کا راستہ خود بناؤ۔''

میں حیرت زدہ نانا کو دیکھ رہا تھا۔ اب تک جو تاثر اُنہوں نے میرے ڈیڈی کا مجھے دیا تھا اس کے مطابق میرے ڈیڈی کو اپنی امریکن بیوی اور بچوں سے پیار تھا۔ مجھ میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔

''تمہارے ڈیڈی کو میں خط لکھ دوں گا۔ اور اقبال جرم کرلوں گا۔ تم بھی ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔''

''نانا جی، آپ نے ایسا کیوں کیا؟'' میں رونے لگا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔

''میری بیٹی مجھ سے بچھڑ گئی تھی۔ مجھے لگا کہ اللہ نے مجھے تمہاری شکل میں اس کا نعم البدل دے دیا ہے۔ ذرا سوچو اگر تم میری زندگی میں نہ ہوتے تو میں پہاڑ جیسی زندگی کیسے گزارتا۔ تمہارے ڈیڈی کو دوسری بیوی مل گئی اور بچے بھی۔ اس بنڈل میں اُن سب کی تصویریں بھی ہیں۔''

اب اُنہوں نے کھانے والے کمرے میں جانا چھوڑ دیا۔ میں کھانا کھا کر اُن کے لیے ٹرے میں کھانا لے کر آتا اُنہیں اپنے سامنے کھانا کھلاتا ایسا لگتا تھا جیسے انہیں کھانے میں کوئی دلچسپی نہ رہی ہو۔ میں ہر روز اکیلا بیٹھ کر اپنے ڈیڈی کے خط پڑھتا۔ نانا جی اور ڈیڈی کے خیالات میں کوئی فرق نہ تھا۔ غریب، بے سہارا، بے گھر لوگوں کے لیے کام کرنا ڈیڈی کی زندگی کا مقصد تھا۔

نانا جی زیادہ تر خاموش رہتے۔ کھانا کھانے کے دوران وہ صرف ایک جملہ دُہراتے، ''تم میری توسیع ہو۔ میرا مشن جاری رکھنا۔ تمہارے ڈیڈی نے ایٹمی دھماکوں کے خلاف ایک تحریک شروع کی ہے، تم بھی اس میں شریک ہو جانا۔''

اب انہوں نے ٹی وی دیکھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ بس لیٹے ہوئے چھت کو ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہتے۔

جس دن چاغی کے علاقے میں ایٹمی تجربہ ہوا، ڈرائیور نے اخبار سب سے پہلے اِن کے ہاتھ میں جا پکڑایا۔ اس سے پہلے کہ میں اُن کے ہاتھ سے اخبار لیتا وہ خبر پڑھ چکے تھے اور



بڑبڑا رہے تھے، ''پورا پہاڑ سفید ہو گیا!'' میں نے دیکھا اُن کا چہرہ سفید ہو گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اُن کو سہارا دینا چاہا۔ وہ میری گود میں یوں گر گئے جیسے میں بچپن میں لوگوں کی باتوں سے پریشان ہو کر اُن کی گود میں گر جایا کرتا تھا اور رونے لگتا تھا۔ لیکن نانا جی روئے نہ لوگوں کی شکایت کی اور نہ آنکھیں کھول کر میری جانب دیکھا۔ وہ ہمیشہ کے لیے پرسکون سو گئے جیسے انہوں نے اپنے حصے کا کام ختم کرلیا ہو......

میں خود بھی اس سے متاثر ہوگیا اور باتوں باتوں میں ہی اس نے مجھے آمادہ کرلیا کہ سرجری کے بجائے گائنی کا امتحان دے ڈالوں۔ میں نے امتحان بھی دیا اور پاس بھی ہوگیا۔ اس کے بعد سے مجھے نوکریاں ملتی ہی چلی گئی تھیں۔ کوئن شارلٹ، کنگس کالج اور سینٹ جارجیز ہسپتال میں ٹریننگ لینا ہوا میں بھی گائنی کالوجسٹ بن گیا تھا۔

نجمہ کے خوف اور اباجان کی ضد سے ڈر کر میں لندن میں ہی رُکا ہوا تھا اور کنسلٹنٹ کی نوکری تلاش کر رہا تھا کہ تھوڑے دنوں میں ہی سرے کے علاقے میں مستقل نوکری مل گئی تھی۔ نوکری کے شروع دنوں میں ہی شیوان سے ملاقات ہوئی۔

زندگی میں بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے آپ کسی سے ملتے ہیں، کسی کو دیکھتے ہیں اور یکا یک بے وجہ وہ آپ کے وجود کو تسخیر کرلیتا ہے۔ آپ کے اوپر چھا جاتا ہے اور مکمل طور پر آپ کو مسحور کر لیتا ہے۔ میرے ساتھ ایسا ہی ہوا تھا۔ شیوان یکا یک میری زندگی میں بغیر کسی پلاننگ کے آئی تھی اور پہلے ہی دن میں نے فیصلہ کرلیا کہ میری زندگی کی باگ ڈور شیوان کے ہاتھ میں ہوگی۔

یہ فیصلہ بڑا مشکل تھا میرے لیے بھی اور شیوان کے لیے بھی۔ مجھے پتا تھا کہ یہ فیصلہ اس لیے بھی کرنا ضروری تھا کہ جب تک میں کنوارا تھا نجمہ بھی کنواری رہے گی۔ میرے فیصلے کے بعد ہی بڑے ابو اور اباجان نجمہ کے لیے کوئی رشتہ تلاش کریں گے۔

میرا خط ان پر دھماکا بن کر گرا اور ان کی طرف سے بھی میرے فیصلے کا دھماکا خیز جواب آیا تھا۔ مجھے عاق کر دیا گیا تھا مجھے تاکید کر دی گئی تھی کہ اپنے منحوس شکل کے ساتھ کبھی بھی اپنے والدین کے سامنے نہ آؤں۔ میں ان کے لیے زندہ درگور ہوگیا تھا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میرے والدین اپنی اکلوتی اولاد کے ساتھ ایسا بھی کرسکتے ہیں۔ میرا قصور ہی کیا تھا، صرف اپنی پسند سے شادی۔

وہ دن مجھے اچھی طرح یاد ہے جب مجھے خط ملا تھا۔ شیوان میرے ساتھ ہی تھی۔ اس نے محسوس کرلیا تھا کہ میں کس قدر شدید جذباتی اتھل پتھل کا شکار ہوکر رہ گیا ہوں۔ نہ مجھ سے بولا جا رہا تھا، نہ میں سوال سن رہا تھا اور نہ جواب دینے کے قابل تھا۔ نہ جانے کتنی دیر تک میں اس کی بانہوں میں پڑا سسکتا رہا، بلکتا رہا تھا۔



# ناسور

لاڑکانہ تو شہر ہی وزیروں، وزیر اعلاؤں اور وزیر اعظموں کا تھا اور اس کے ساتھ ہی موئن جو دڑو کا رومانس، ہزاروں سال پرانی تہذیب کے آثار جس کے بارے میں میں نے بہت کچھ سنا تھا اور پڑھا بھی تھا۔ اسی شہر لاڑکانہ آنے کی دعوت نے مجھے یکا یک مسحور سا کر کے رکھ دیا تھا۔

کئی سال پہلے ڈاکٹر بننے کے بعد پاکستان چھوڑ کر جب میں لندن آباد ہوا تھا تو پھر میرا پاکستان جانا نہیں ہوسکا تھا۔ واقعات بھی کچھ اس طرح سے ہوتے چلے گئے تھے کہ پاکستان سے تمام تعلق ختم ہوکر رہ گئے تھے۔ میں ڈاؤ میڈیکل کالج کے تیسرے چوتھے سال میں ہی تھا کہ میرے والد نے اعلان کر دیا کہ میری شادی نجمہ سے ہوگی۔ نجمہ بڑے ابو کی بیٹی تھی، میری ہم عمر ہی تھی مگر مجھے کبھی بھی کسی بھی قسم کی دلچسپی اس سے نہیں رہی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ شادی وادی کے بارے میں میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ میرے والد صاحب کو اپنے بڑے بھائی سے بلا کی عقیدت تھی۔ شاید اس زمانے میں بھائیوں میں ایسا ہی تعلق ہوتا تھا کہ اولاد ان کی خواہش کے آگے سر جھکا دیتی تھی اور ان کا احترام خاندان کی دوسرے روایات اور رشتوں سے بھی برتر معلوم ہوتا تھا۔ ایک طویل سرد جنگ کے بعد میں نے جھوٹا وعدہ کرلیا کہ شادی نجمہ سے ہی کروں گا اور پھر ڈاکٹر بننے کے بعد مزید تعلیم کے لیے انگلینڈ روانہ ہوگیا تھا۔

لندن پہلے ہی دن سے میرے دل کو بھا گیا۔ چھوٹے گھر، سردی اور بہت سارے بے حس لوگوں کے باوجود میں لندن کے ہر رنگ کو پسند کرنے لگا۔ میں آیا تو سرجن بننے کے لیے تھا مگر نہ جانے کیا ہوا کہ ہیمر اسمتھ ہسپتال میں کام کرتے کرتے مجھے عورتوں کے امراض سے دلچسپی پیدا ہوگئی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ عورتوں کے شعبے کا ایک ڈاکٹر نیل کوئن اتنا عمدہ تھا کہ

شیوان کے والدین ایک ''پاکی'' کے ساتھ اپنی بیٹی کی شادی کو ناپسند کرنے کے باوجود راضی ہوگئے اور وہ میری زندگی کے خزاں میں بہار کی طرح آ کر چھا گئی۔ وہ اسکول میں پڑھاتی تھی۔ بہت ہی دردمند دل کی مالک تھی۔ تمام زندگی اس نے ترقی پذیر تیسری دنیا کے لیے ہی کام کرتے ہوئے گزارا تھا۔ کینیا کے کالوں کے اسکول میں رضاکارانہ طور پر وہ پڑھاتی رہی تھی۔ جنوبی افریقہ کی آزادی کی جنگ لیے لندن میں ہونے والے مظاہروں میں وہ آگے آگے رہی تھی۔ تنزانیہ کے جوزف نریرے نے جب برطانیہ کی چائے کی کمپنیوں کے خلاف بغاوت کرکے خود ہی چائے برطانوی عوام تک پہنچانے کا فیصلہ کیا تو شیوان دل و جان کے ساتھ لندن کی ایکشن کمیٹی میں سرگرم ہوگئی تھی۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل کی وہ سرگرم رکن تھی۔ عدیس ابابا میں ڈاکٹر ہملن کے فسٹیولا ہسپتال کے لیے وہ سارا سال چندہ جمع کرتی رہتی تھی۔ شیوان ایک خوب صورت عورت ہی نہیں بلکہ ایک خوب صورت دل اور دماغ کی بھی مالک تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے یورپ میں تیسری دنیا کی ایک عورت پیدا ہوگئی تھی۔ ایسے لوگ دنیا میں بہت کم ہوتے ہیں۔ اب وہ عورت ہی میری ساری دنیا تھی اور میرا دیس۔

پاکستان سے میرا تعلق ختم ہی ہوگیا تھا۔ مجھے نجمہ کی شادی کی خبر ملی تھی۔ ابا جان اور امی کا انتقال ہوا، پھر کراچی پاکستان سے تمام رشتے ٹوٹ گئے تھے۔ رشتوں کے ٹوٹنے کے باوجود پاکستان سے ایک رشتہ اب بھی قائم تھا جیسے سارے رشتے ٹوٹنے کے بعد سانس کا بندھن رہ جاتا ہے۔ ریڈیو پر پاکستان کے بارے میں خبریں ہوتیں تو سنتا ضرور تھا، ٹیلی وژن پر پاکستان کے بارے میں پروگرام ضرور دیکھے جاتے تھے اور اخبارات کی خبریں اور تجزیے پابندی سے پڑھتا تھا۔ بھارت اور پاکستان کی جنگ ہوئی۔ مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا۔ ہندوستان ایٹم بم کا دھماکا کر بیٹھا۔ پاکستان بھی بم بنا رہا ہے۔ پاکستان میں فوج آ گئی وغیرہ وغیرہ۔ ہر خبر کی اہمیت تھی۔ رشتوں کے ٹوٹنے کے بعد ایک اور ہی عجیب قسم کا رشتہ قائم ہوگیا تھا۔ کبھی کوئی پرانا کلاس فیلو ملتا تھا تو پاکستان کی باتیں ہوتی تھیں۔ کشمیریوں کے حقوق کی باتیں اور دنیا کی ناسمجھی کا رونا کہ پاکستان پر پابندی ہے، اسرائیل تو بم بنا سکتا ہے مگر پاکستان کو اجازت نہیں۔ پاکستان سے رشتہ دلچسپ بھی تھا اور عجیب بھی۔ ایٹمی جنگ کے خلاف ہونے کے باوجود اس وقت میرا خیال



تھا کہ ہندوستان کے ساتھ ساتھ پاکستان کے پاس بھی ایٹم بم ہونا چاہیے۔

دوسری طرف میں اور شیوان زندگی کا بھرپور لطف اٹھا رہے تھے۔ دو بچے تھے ہمارے۔ زندگی کامیاب تھی، خوشیاں ہمارا مقدر بنی ہوئی تھیں۔ زندگی سے مزید کچھ اور مانگا نہیں جاسکتا تھا۔

سال میں دو چھٹیاں ہم لوگ ضرور کرتے تھے ایک دفعہ تیسری دنیا کے کسی غریب ملک میں اور ایک دفعہ یورپ امریکا کے کسی خوب صورت مقام پر۔ شیوان کا خیال تھا کہ بچوں کو ہر طرح کی جگہ دکھانی چاہیے۔ اس دفعہ ہم لوگ عدیس ابابا گئے تھے۔ عدیس ابابا کا ہزاروں سال پرانا شہر جہاں ڈاکٹر ہملٹن کا فسٹیولا ہسپتال بھی تھا۔ یہ ہسپتال افریقہ کی ٹھکرائی ہوئی عورتوں کی پناہ گاہ تھی۔ افریقہ کے ان علاقوں میں جہاں نہ ڈاکٹر ہیں نہ مڈوائف، نہ ہسپتال ہیں اور نہ زندہ رہنے کی سہولتیں۔ بس غربت کا ناگ ہے جس کے ڈسے ہوئے لوگ زندگی محض زندگی گزارتے نہیں بھگتاتے ہیں۔ ایسی جگہوں سے جہاں جوان لڑکیاں شادی کے بعد حمل کے دوران بچے جنم دینے میں ناکام ہوجاتی ہیں اور جب مرا ہوا، سڑا ہو بچہ کئی دنوں کے بعد پیدا ہوتا ہے تو پیشاب کی تھیلی میں سوراخ بھی کر ڈالتا ہے۔ پھر تھوڑے دنوں بعد ہر وقت پیشاب رستی ہوئی یہ لڑکیاں، گھروں سے نکال دی جانے والی بیویاں نہ جانے کن کن راستوں سے ہوتی ہوئی اور کیا کیا فاصلے طے کرکے اس ہسپتال میں آتی ہیں اور یہاں ان کا یہ فسٹیولا، یہ سوراخ ٹھیک کیا جاتا ہے۔ میں نے ایسی ہی لٹی ہوئی لڑکیوں کو آتے ہوئے دیکھا، ان لٹی ہوئی لڑکیوں کے چہروں کی چھنی ہوئی مسکراہٹوں کو بھی واپس آتے ہوئے دیکھا۔ وہ تجربہ بہت حسین تھا، مجھے پہلی دفعہ شدید احساس ہوا کہ شیوان کتنا بڑا کام کر رہی ہے۔ اس ہسپتال کے لیے پیسہ جمع کرنے سے بڑی کوئی عبادت کیا ہوسکتی تھی۔ مجھے اس پر ٹوٹ کر پیار آیا۔

پھر شیوان کے اسکول کی چھٹیوں میں ہم ہر سال ایتھوپیا جانے لگے۔ دو ہفتے رضاکارانہ طور پر میں بھی اس ہسپتال میں کام کرتا تھا۔ روزانہ پانچ چھ آپریشن میں بھی کر لیتا تھا۔ سال کے دو ہفتے کا یہ کام جتنی خوشیاں دے کر جاتا تھا انگلستان میں سارا سال کام کرکے نہیں ملتی تھی۔ پھر انگلستان میں فسٹیولا کا مسئلہ تو تھا ہی نہیں۔ تیس پینتیس سال انگلستان میں گزارنے کے باوجود میں نے ایک بھی ایسا مریض یہاں نہیں دیکھا تھا۔ انگلستان اور یورپ کی عورتیں ذلت کی اس بیماری

سے بہت پہلے نجات حاصل کر چکی تھیں۔ یہ بیماری تو افریقہ و ایشیا کے ان ملکوں کی عورتوں کا مقدر تھی جہاں دولت ہونے کے باوجود غربت ہے۔ جہاں کے میرے جیسے ڈاکٹر جو یہ آپریشن کر سکتے ہیں، وہ لندن میں کسی شیوان، کسی جوزفین کے ساتھ سکھی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ انگلستان نے مجھے بہت کچھ دیا تھا۔ شیوان میری زندگی تھی مگر نہ چاہنے کے باوجود یہ خیالات میرے دماغ میں آجاتے تھے۔ اپنے ملک سے باہر رہ جانے والوں کا رشتہ کبھی ٹوٹتا نہیں ہے۔ یہ جیسے ناف کا رشتہ ہے جس کا نشان ساری زندگی کے بنیادی رشتے کی یاد دلاتا رہتا ہے۔

ایک دن ہسپتال میں نذیر سومرو ملنے آیا۔ پاکستان کا یہ ڈاکٹر لندن یونی ورسٹی میں ایک کورس کر رہا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ لندن میں ہی پاکستانیوں سے پیسے جمع کر کے لاڑکانہ کے ہسپتال میں فسٹیولا کے آپریشن کے لیے ایک میڈیکل کیمپ لگا رہا تھا۔ مجھے پہلی دفعہ پتا لگا کہ پاکستان میں بھی لڑکیاں اس مرض کا شکار ہوتی ہیں۔ وہ اسی سلسلے میں مجھ سے ملا تھا۔

نذیر نے بتایا تھا کہ سندھ کے دیہاتوں میں کتنی ہی لڑکیاں ہیں جو فسٹیولا کا یہ عذاب لے کر زندہ درگور ہیں۔ نذیر کو پتا چلا تھا کہ میں ہر سال عدیس ابابا جا کر یہ آپریشن کرتا ہوں، اس نے مجھے دعوت دی کہ میں تھوڑے دنوں کے لیے لاڑکانے کے اس کیمپ میں مدد کروں۔ شیوان کا بھی یہی خیال تھا کہ ہمیں ضرور وہاں جانا چاہیے اور پھر ہم دونوں ہی نے اس کام کی ہامی بھر لی تھی۔ مجھے فیصلے کے بعد بڑی خوشی ہوئی بالکل ایسی ہی خوشی جیسے کسی بہت اچھے دوست کا بہت پرانا قرض اُتار کر ہوتی ہے۔

میرا اب پاکستان میں کوئی نہیں تھا۔ ابا جان، امی اور بڑے ابو کے انتقال کے بعد نجمہ سے کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔ مجھے تو پتا بھی نہیں تھا کہ وہ اب کہاں ہے۔ دوست پاکستان میں کوئی رہا نہیں تھا۔ میڈیکل کالج میں میری کلاس کے دوست امریکا میں تھے یا انگلستان میں اور خوش حال زندگی گزار رہے تھے۔ پاکستان سے صرف خبروں کا تعلق تھا۔ ریڈیو کا ایک رشتہ اور ٹیلی وژن کا ایک واسطہ۔ پاکستان کے بارے میں بہت سی باتوں کا اندازہ تھا مگر میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہاں بھی لڑکیاں حمل کے دوران انھیں تکالیف کا شکار ہوتی تھیں جو ایتھوپیا، تنزانیہ اور یوگنڈا کی عورتوں کا مقدر ہے۔ یہ تو قحط زدہ ملک ہیں۔ یہاں تو یہ ممکن ہوتا ہوگا مگر پاکستان



میں ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میں افریقہ کے صحراؤں اور جنگلوں سے آنے والی عورتوں کا علاج کرتا رہا اور سمجھتا رہا کہ پاکستان ہندوستان غریب ضرور ہیں مگر وہاں یہ حال تو نہیں ہوگا۔ یہ خطہ زمین تو بہت پرانا ہے۔ موئن جودڑو کے کھنڈروں سے لے کر اجنتا کے غاروں تک۔ افریقہ کے وحشیوں سے بہت پرانی تہذیب ہے ہماری۔ ہندوستان کے پاس تو ایٹم بم بھی تھا اور پاکستان کی تیاریاں بھی مکمل تھیں۔ یورپ میں ہر ایک کو پتا تھا۔ اس کے باوجود افریقہ جیسا حال......
میں نے تھوڑی دیر کے لیے سوچا کہیں نذیر جھوٹ تو نہیں بول رہا ہے۔

میں نے اور شیوان نے بھرپور تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ میں واپس کراچی جا رہا تھا جہاں میں اسکول اور کالج گیا تھا۔ اسکول کے زمانے میں مجھے موئن جودڑو کے بارے میں بتایا گیا تھا۔ میں نے اس وقت بھی سوچا تھا کہ ایک دن ضرور لاڑکانہ جا کر ہزاروں سال پرانے کھنڈرات دیکھوں گا۔ اب یہ پرانا، بہت پرانا خواب مکمل ہو رہا تھا۔ اب میں نہ صرف یہ کہ کراچی جا رہا تھا بلکہ موئن جودڑو اور لاڑکانہ بھی جا رہا تھا۔ اسی پاکستان میں جس کی جنگ ہم جیسے پاکستانی پاکستان سے باہر لڑتے ہیں۔

کراچی کا کانٹی نینٹل ہوٹل ویسا ہی تھا۔ ویسا ہی صاف ستھرا، وہی دولت سے چھلکتا ماحول، ویسے ہی لذیذ کھانے۔ کالج کے زمانے میں کسی دوا کی کمپنی کی طرف سے ہونے والی دعوتوں میں میں نے وہاں کھانا کھایا تھا یا کبھی چائے پی لی تھی مگر اس دفعہ ہم لوگ ٹھہرے ہی وہاں تھے۔ پاکستان میں رہ کر بھی مزا آ گیا تھا۔

دو دن کراچی میں رہنے کے بعد ہم لوگ لاڑکانہ چلے گئے۔ موئن جودڑو ایئرپورٹ، موئنجودڑو کے ساتھ ہی بنا ہوا تھا۔

موئن جودڑو میرے اور شیوان کے توقعات سے کہیں زیادہ دل کش تھا۔ شیوان تو موئن جودڑو کے بارے میں بہت ساری کتابیں پڑھ کر آئی تھی۔ اس کے ساتھ مجھے بھی یہ کھنڈرات دیکھنے کا بہت مزا آیا۔ ہزاروں سال پرانی تہذیب اپنی تمام تر شان و شوکت کے ساتھ ہماری آنکھوں کے سامنے موجود تھی۔ وہ لوگ بہت عزت و شان کے ساتھ رہتے تھے۔ ان کے گھر، ان کے اسکول، ان کی عبادت گاہیں، ان کا پانی کا نظام، گندگی کے نکاسی کے طریقے،

ان کی عدالتیں، ان کے بازار، ان کا رہن سہن، ان کا طریق زندگی...... ہزاروں سال پہلے وہ اتنے ترقی یافتہ تھے میں عش عش کر بیٹھا تھا۔

مگر لاڑکانہ اتنا ہی خراب تھا۔ یقین ہی نہیں آتا تھا کہ اس شہر سے تھوڑے سے فاصلے پر ہزاروں سال پہلے رہنے والوں نے جو شہر بسایا تھا یہ ان کے ہی بچوں کا دوسرا شہر ہے۔ گندگی کے ڈھیر، ابلتے ہوئے گندے پانی کے نالے، مکانوں کی بے سمت قطاریں۔ ایک وہ شہر تھا جس کے کھنڈروں کو دیکھ کر لگتا تھا کہ یہاں رہنے والوں کے نظام میں انصاف کو فوقیت رہی ہوگی اور لاڑکانے کو دیکھ کر لگتا تھا کہ غربت اور ناانصافی اس شہر کی بنیادوں میں شامل ہیں۔ مجھے پاکستان آکر پہلا دھچکا لگا۔ وزیراعظموں، وزیراعلاؤں اور وزیروں کا شہر تھا یہ۔ بھکاریوں سے اٹا ہوا۔ ننگے پیر بھیک مانگتے ہوئے چھوٹے چھوٹے بچے، دبلی پتلی فاقہ زدہ لڑکیوں، عورتوں کا ہجوم جو سرکاری ہسپتال میں بے عزت ہونے کے لیے آتے ہیں۔ اتنی غربت، میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ یہ اسی ملک کے وزیراعظم کا شہر تھا جس کی حکومت امریکا سے کروڑوں ڈالر کے جنگی طیارے خریدتی ہے جو فرانس سے اربوں روپوں کی جنگی آبدوزیں بنواتی ہے۔ جس کے وزیراعظم اور جرنیل دنیا کے امیر ترین لوگ ہیں۔ اس ملک کے اس شہر میں غربت افلاس کا ننگا رقص دیکھ کر شیوان کے آنسو نکل آئے۔ ایتھوپیا سے بدتر تھے لاڑکانہ کے غریب۔ اس نے مجھ سے پوچھا تھا کیوں، کیوں اس شہر کے وزیراعظم نے ایٹم بم بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ کیوں اس ہیبت ناک پروگرام کا آغاز کیا تھا جس کی جنگ ابھی تک جاری ہے۔ اسے یہ بدحالی، یہ غریب، یہ مظلوم نظر نہیں آتے تھے؟ میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ پچاس سے زائد جوان لڑکیوں کو جمع کیا ہوا تھا نذیر نے آپریشن کے لیے، حمل کے دوران بروقت اور مناسب علاج نہ ہونے کی وجہ سے سب کی پیشاب کی تھیلیوں میں سوراخ ہوگئے تھے۔ سبھوں کو گھروں سے نکال دیا گیا تھا۔ سب کی سب غریب تھیں۔ ذلتوں کی ماری ہوئی بے وقعت عورتیں، فاحشہ عورتوں سے بدتر...... پیشاب رستی ہوئی جادوگرنیاں۔ مجھے نذیر بہت اچھا لگا تھا جس نے پیسے جمع کیے تھے، لوگ جمع کیے تھے اور ان قسمت کی ماری عورتوں کے آپریشن کا انتظام کیا تھا۔

صرف چار عورتوں کے علاوہ جس کے فسٹولا اتنے بڑے تھے کہ ان کا آپریشن ممکن ہی



نہیں تھا باقیوں کے لیے صبح سے شام تک روزانہ سات آٹھ آپریشن کر کے جتنے بھی سوراخ بن جانے کے قابل تھے ان کو ہم لوگوں نے آپریشن کے عمل سے بنا دیا تھا۔ زلیخا آخری مریضہ تھی۔ مشکل سے پندرہ سال عمر ہوگی اس کی۔ لاڑکانہ شہر سے چالیس پچاس میل دُور ایک اور شہر ہے شہدادکوٹ۔ شہدادکوٹ کے چاروں جانب چھوٹے چھوٹے گاؤں ہیں حاکم شاہ، بہرام، نوڈیرو، رتوڈیرو اور پناہ شیخ۔ ان ہی گاؤں کے آس پاس سے آئی تھی، وہ اپنی ماں کے ساتھ۔ دُبلی پتلی کمزور، چہرہ جو کبھی بہت خوب صورت رہا ہوگا ہڈیوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ پیشانی جن کے گرد خوب صورت بالوں کی چٹیا بندھتی ہوگی، شکنوں کی نظر ہوگئی تھی۔ اس کی آنکھیں اس کے چہرے پر سب سے زیادہ نمایاں تھیں۔ کسی بچی کی اتنی ویران آنکھیں میں نے آج تک نہیں دیکھی تھیں۔ درد کی ایک ٹیس تھی جو میرے سینے میں اٹھی تھی اور میرے روح کو زخمی کرتے ہوئے دُور تک مجھے گھسیٹتی ہوئی لے گئی تھی۔ وہ بارہ سال کی تھی تو اس کی شادی بتیس سال کے اس زمین دار سے کردی گئی تھی جس کے پہلے ہی چھ بچے تھے۔ کچھ پیسوں کے عوض کچھ قرضے معاف کرانے کے لیے اس کے باپ نے اسے اس زمیں دار کے حوالے کر دیا تھا۔ بارہ سال کی یہ گڑیا جس کے خود گڑیا کھیلنے کے دن تھے یکایک اپنے سے تین گنا عمر کے وحشی کی بیوی بن گئی تھی۔ تیرہ سال کی عمر میں وہ تین دن تک گاؤں کی حویلی کے ایک کمرے میں حمل کے درد سے تڑپتی رہی تھی، سسکتی رہی، بلکتی رہتی تھی۔ تین دن تک گاؤں کی دائیاں اس کے ساتھ وہ سب کچھ کرتی رہیں جو جانوروں کے ساتھ بھی نہیں ہوتا ہے۔ تین دن کے بعد ایک مرا ہوا متعفن بچہ پیدا ہوگیا تھا۔ پانچ دن کے بعد سے اس تیرہ سال کی بچی کا اپنے پیشاب پر اختیار ختم ہوگیا تھا۔ اس کا پیشاب مسلسل بہنا شروع ہوگیا۔ اسے فسٹولا ہوگیا تھا۔ اور بہت جلد زمین دار نے اسے گھر سے نکال دیا تھا۔ اب وہ اس کی راتوں کی عیاشی کے قابل نہیں رہی تھی۔ گاؤں والوں کے خیال میں اس پر کسی جن کا سایہ تھا۔ وہ ناپاک تھی، اچھوت۔

تیرہ سال سے پندرہ سال کی عمر تک اس کا پیشاب مسلسل بہتا رہا تھا۔ زندگی اس کے لیے ناختم ہونے والا ایک ڈراؤنا خواب بن کر رہ گئی تھی۔ صرف اس کی ماں اس کے ساتھ تھی اس کے جنم کا بوجھ لیے ساتھ ساتھ، ہر جگہ ذلتوں کا شکار ہونے کے لیے۔

دو گھنٹے کے معمولی آپریشن کے بعد وہ صحیح ہوگئی تھی۔ دوسرے دن وہ اپنے بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے کپڑے اور بستر بالکل خشک تھے، اس کے فاقہ زدہ خوب صورت چہرے کی ویران آنکھوں سے خوشی کے موتی چھلکنے کے لیے بے قرار سے تھے۔ شیوان نے میرا ہاتھ تھام لیا مجھے ایسا لگا تھا جیسے میں نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا آپریشن کرلیا تھا۔

تین دن کے بعد ہم لوگ کراچی واپس آگئے۔ سارے ہی مریض ٹھیک تھے مگر مجھے سب سے زیادہ خوشی زلیخا کی تھی۔ چھ دن اور اس کو ہسپتال میں رہنا تھا، پھر اس کے بعد وہ اپنی زندگی کی خود مالک ہوگی۔ ایک نارمل لڑکی کی طرح جس کا جسم مکمل ہوتا ہے۔ کانٹی نینٹل ہوٹل سے ہی میں نے چھ دن بعد لاڑکانہ فون کرکے زلیخا کا حال پوچھا تھا۔ وہ ٹھیک تھی۔ زخم بھر چکے تھے۔ وہ گھوم پھر رہی تھی۔ پیشاب رسنا بند ہوگیا تھا۔ اس کی خوشی کا اندازہ ہر کوئی نہیں کرسکتا ہے۔

شام شیوان کے ساتھ ہوٹل میں بیٹھے ہوئے تازہ پھلوں کے رس کی چسکی لیتے ہوئے ہم دونوں خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے کہ خنجر کے زخم کی طرح وہ خبر آئی تھی اور ہم دونوں کے دلوں کو چھلنی کرتی ہوئی چلی گئی... پاکستان نے چاغی میں ایٹم بم کا دھماکا کر ڈالا تھا۔ پوکھرن کے جواب میں۔ کراچی کے کسی اخبار کا سپلیمنٹ ہوٹل کی میز پر پڑا ہوا تھا۔

شیوان کا فق چہرہ سامنے تھا۔ میں نے آنکھیں بند کرلی تھیں۔

زلیخا جیسی ہزاروں لڑکیاں گرد وطوفان کے اس بادل کے پیچھے چاغی کے پہاڑوں پر سسکتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ یہ بم تو اپنی قیمت وصول کرلے گا، بہت ساری زلیخاؤں کو پامال کرے گا۔ بارہ سال کی بچیاں لٹتی رہیں گی۔ مجھے ایسا لگا جیسے یہ بم کا دھماکا نہیں تھا، بارہ سالہ بچیوں کی عروسی رات کی دل خراش چیخیں تھیں۔ وہ چاغی کا پہاڑ نہیں تھا بلکہ پاکستان کی دھرتی پر بننے والا ایک بہت بڑا فسٹیولا تھا جس میں سے رطوبت بہہ بہہ کر ایک معصوم چہرے کو داغ دار کیے جارہی تھی۔

میرے ہاتھ کانپ گئے۔ اگر شوان میرے کندھے پر خاموشی سے ہاتھ نہ رکھ دیتی تو میری آنکھوں میں روشنی کبھی واپس نہ آتی۔

شوان کے ہاتھوں کی کٹوریوں میں میرا چہرہ میرے ہی آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔

آصف فرخی

# خواب میں سفر

## (۱)

خواب پلٹ کر آرہا تھا۔ اس نے آنکھیں موند لیں اور سر سیٹ سے ٹکا دیا۔

پھر وہی خواب جس میں گھر تھا۔ باغ والا گھر۔ اس نے ایک بار پھر اپنے شہر کا نام دل ہی دل میں دہرایا۔

وہ شہر اب اس خواب کی دوری پر تھا۔ اور آنکھیں جاگ رہی تھیں۔ مسلسل جاگ رہی تھیں۔

پوری کوشش کے باوجود وہ اب تک سو نہیں سکی تھی۔ کچھ لوگ ہوتے ہیں جنہیں سفر میں نیند آجاتی ہے، اس نے رشک کے ساتھ سوچا۔ کئی گھنٹے کے تھکن جو ابھی تک نیند میں نہ ڈھل سکی تھی، اس کے سارے جسم میں ایک سست رو بوجھ کی طرح منجمد ہوتی جارہی تھی۔ اس بوجھ نے اسے نڈھال کرکے سیٹ پر ڈھیر نہیں کردیا۔ وہ ہلکی پھلکی ہوگئی۔ جیسے اس کا بدن بے وزن ہوگیا ہو اور بالکل ہلکا ہوکر خلاؤں میں اڑنے کے لیے اپنے آپ کو تول رہا ہو، اور ذرا سی دیر میں سب کے دیکھتے ہی دیکھتے سیٹ سے اٹھ کر کچھ سوتے کچھ آنکھیں بند کیے اکانومی کلاس کے سارے مسافروں کے سر پر دھوئیں کی طرح، ہوا میں بکھرتے بنتے ستون کی طرح چھانے لگے گا۔ اسموک ڈیٹیکٹرز اسے نہیں پکڑ پائیں گے، ایئر ہوسٹس اسے سیٹ بیلٹ باندھ کر بیٹھنے کے لیے نہیں کہہ سکے گی کہ اپنے وزن سے عاری ہونے سے پہلے وہ اس کا جسم تھا۔ اس نے بے دھیانی میں وہی اعلان دہرایا جو ابھی کچھ دیر پہلے پائلٹ نے کیا تھا، اتنے اور اتنے اور اتنے ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کرتے ہوئے، اتنے اور اتنے میل کی رفتار کے ساتھ ہم پہنچیں

گے...... ہم وہاں، باغ والا گھر، صحرا اور سمندر کے بیچ نقشے میں اٹکا ہوا شہر...... وہیں بیٹھے بیٹھے جوں جوں کراچی قریب آتا جا رہا تھا اسے لگ رہا تھا کہ اس کا وزن کم ہوتا جا رہا ہے۔

اس کا دل ڈوبنے لگا، نیچے کی طرف کچھ ڈھلنے لگا اور اس کے ساتھ ٹانگوں سے جان نکلنے لگی، لیکن وہ ہلکی ہوتی جا رہی تھی جیسے اس کا سارا دھڑ خالی ہوکر پلاسٹک کی تھیلی کی طرح بند ہونے، سمٹنے لگا، پھر ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے ان غباروں کی طرح جن سے ہوا نکال لی گئی ہو اور اگر وہ سیٹ کے ہتھوں کو گھبرا کر زور سے تھام نہ لیتی تو ہوا میں اڑنے لگتی اس لیے کہ اب وہ وزن سے عاری ہوگئی تھی اور سامان رکھنے کے ریکس کے آس پاس دھوئیں کا بادل بن کر منڈلا رہی تھی۔ دوسرے مسافروں کی آوازیں جو اسے وہاں اوپر، جہاں وہ پہنچ چکی تھی، بھن بھناہٹ کی طرح سنائی دے رہی تھیں۔ فضائی سفر کا پورا نقشہ سامنے اسکرین پر روشن تھا اور اس میں سرخ نقطہ...... جس کے آگے اگر نام نہ لکھا ہوتا تب بھی وہ جان لیتی کہ کون سا شہر ہے...... جیسے جہاز کی نوک پر ٹکا ہوا تھا۔ کتنی ہی دیر تک وہ جہاز کی اس متحرک شبیہہ اور اس کے نیچے ابھر کر آئے ہوئے وقت اور فاصلے کے ہندسوں کو بدلتے ہوئے، آنکھوں میں اترتے ہوئے، خواب بنتے ہوئے اور پھر بکھر کر ٹوٹتے ہوئے دیکھتی رہی، دیکھتی رہی یہاں تک کہ ایئر ہوسٹس نے منہ پونچھنے کے لیے گرم تولیہ دیا تو وہ اس کے سامنے ہاتھ بڑھا نہیں سکی، اب وہ اس سے اپنا وزن تو نہیں مانگ سکتی تھی۔ یہ کوئی کوٹ نہیں تھا کہ ٹانگنے کے لیے کیبن میں بھجوا دیا جائے اور جہاز کے اترنے کا وقت ہونے لگے تو پھر مانگ لیا جائے۔ ایئر ہوسٹس کے اعلان کی آواز رکی رکی تھی۔ لیکن کھڑکی کے باہر جلتی بجھتی اور زمین کے ساتھ ڈولتی ہوئی روشنیاں واضح تھیں۔ اس کے پیچھے والی قطار میں برابر برابر بیٹھے ہوئے دو آدمی، جو فلم ختم ہونے اور جہاز کے اندر کی بتیاں دھیمی ہونے کے بعد سے مستقل ایک دوسرے سے باتیں کرتے آئے تھے...... کراچی، کراچی اسی شہر کی باتیں، وہاں لوگ کیسے ہوں گے، اب کیا ہوتا ہوگا، یہ سوچے بغیر کہ ان کی باتوں سے دوسرے مسافروں کی نیند اچٹ جاتی ہوگی...... جہاز کے پروں سے پہیے نکل کر باہر آنے کے ٹھیک اسی لمحے کو ایک دوسرے کو بتا رہے تھے۔

آہستہ ہوتے ہوئے جہاز اترنے لگا۔ اس نے اپنا وزن بھی واپس آتے ہوئے محسوس کیا۔ تب ایک دھچکا لگا اور اس دھچکے سے بھی زیادہ، پیچھے کی قطار سے آواز:

"Earth Contact" اس آواز میں بے حد بشاشت تھی۔

"Well done" دوسری آواز نے تقریباً اسی لہجے میں جواب دیا۔

جہاز پوری طرح رکنے اور انجن کے بند ہو جانے کا انتظار کرنے کے لیے ایئر ہوسٹس کے علان کے باوجود لوگ سیٹوں سے اٹھنے لگے، ہیڈ ریک کھول کر بیگ، بریف کیس اتارنے لگے۔ کراچی، کراچی، ہر ایک جو جلدی تھی، بے قراری تھی۔ وہ یوں ہی بیٹھی رہی۔ پاس والی سیٹ کے مسافر نے اس سے کچھ کہا۔ وہ اس ٹی وی اسکرین کی طرح تھا جس کی آواز کسی نے بند کردی ہو۔ تب اسے اندازہ ہوا کہ سارا شور اسے دھیما کیوں لگ رہا ہے۔ اس کے کان بالکل بند تھے۔ وہ اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھی تو باہر نکلتے نکلتے ان میں سیٹیاں بجنے لگیں۔ اس کے قدم من من بھر کے نہیں تھے، پھر بھی ڈگمگا رہے تھے، زمین اسی طرح ہموار تھی۔



اتوار کی دوپہروں کی طرح آرام دہ اور مانوس مکان جس میں ایک ایک پودا نانا میاں کے اپنے ہاتھوں کا لگایا ہوا تھا۔ باغ والا گھر۔ اس نے ایک بار پھر یاد کیا۔ کیا اب بھی ہوگا؟ وہ وہاں جائے گی تو گھر اپنی جگہ پر موجود ملے گا؟ لوگوں کے چلے جانے کے بعد مکان اپنی جگہ نہیں بدل لیتے، اسے معلوم تھا (اور اس پر افسوس بھی تھا) لیکن پھر بھی اگر وہ گھر وہاں نہ ہوا، تو پھر کیا ہوگا؟ اس نے چاہا کہ سر کو جھٹک کر ان شکوک سے بھی پیچھا چھڑا لے۔ لیکن خالی ہوتے ہوئے مکان اور ڈھنڈار شہر کی صورتیں بدل بدل کر سامنے آنے لگتیں۔ وہ مکان خالی پڑا ہے اور سامنے کی کیاری میں پودے سوکھ گئے ہیں، کیونکہ کئی دن سے کسی نے ان میں پانی نہیں دیا۔ سارے کمروں میں دیواروں اور فرش کے بیچ میں میں کچھ نہیں ہے، ہوا اور مٹی خالی جگہ میں بھری ہوئی ہے۔ اتوار کی صبح ہے اور ٹھیلوں سے پھل، سبزی خریدنے والوں کے ہجوم کی جگہ میرے شہر میں بھی اسی طرح کا سنسان پن ہے جیسے یہاں امریکا میں ہوتا ہے۔ ہر شکل پچھلی والی سے زیادہ تکلیف دہ تھی۔ شاید اس لیے کہ نا قابل تصور نہیں تھی۔ اس نے سختی سے آنکھیں میچ لیں کہ کراچی محفوظ رہے۔

میری دونوں آنکھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دے کراچی، اس نے دعا مانگی۔ اور اگلے ہی لمحے آنکھیں کھول دیں۔ ایئر پورٹ کے لاؤنج کے باہر امی کھڑی تھیں۔

اپنی جگہ قائم رہنا چاہیے شہر کہ اسے وہاں واپس جانا تھا۔ بلکہ وہ وہاں پہنچ چکی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو اعتبار دلایا۔ اور اگلے ہی لمحے آنکھیں کھول دیں۔ ایئر پورٹ کے لاؤنج کے باہر شیشے کے دروازے کی دوسری طرف کہیں امی کھڑی ہوں گی۔

ان کے چہرے پر جھریاں بڑھ گئیں تھیں اور پریشانی کا تاثر تھا جو اس نے فوراً پہچان لیا۔

اسی چہرے کے ساتھ جڑی ہوئی تھی وہ آواز جس نے ٹیلی فون پر بات کی تھی، اس طرح کہ لگتا تھا اب رو دیں گی۔ ٹیلی فون پر اسی آواز نے شہر اور وہ گھر یاد دلایا تھا۔ یہاں سے بہت دور سات سمندر پار، بوسٹن میں۔ کچھ ایسا ہوا تھا کہ ان کے اپارٹ مینٹ میں بہت سے لوگ جمع تھے۔ وہی اس کا اور عمیر کا انٹرنیشنل کراؤڈ۔ جنوبی افریقہ کا ڈینس، یونان کی ارینے اور انڈیا، ارے انڈیا کے رمیش اور مدن اور اندرانی اور اپوروا اور وہی سب کے سب فلم دیکھنے گئے تھے، عمیر کی کھٹارا گاڑی میں لدکر۔ محض اس لیے کین مور اسکوائر کے اس سینما ہال میں فلم لگی تھی جہاں یونیورسٹی کے طالب علموں کو رعائتی ٹکٹ مل جاتے ہیں۔ حالاں کہ ان میں سے کوئی بھی ''انڈر گریڈ'' نہیں تھا کہ اس طرح کی طالب علموں والے رعائتی موقعوں کی تلاش میں رہے، سب ماسٹرز لیول یا ڈاکٹریٹ کی تیاری کرتے ہوئے طالب علم تھے لیکن سمسٹر کے درمیان سانس لینے کا ایک موقع سامل گیا تھا اور رمیش کی پرانی تجویز اتفاق رائے سے منظور ہوگئی کہ بالکل امریکی ''اسٹائل'' میں فلم دیکھی جائے، یعنی پاپ کارن کی بڑی والی کاغذی تھیلی بھر کر کچر کچر کھاتے ہوئے۔ اس کے بعد ان لوگوں کے اسی بھیا اسٹائل ''پاؤ بھاجی'' جو بزمی کے مطابق، میک ڈونلڈ کا دیسی جواب تھی۔ وہی سب لوگ اور وہی دھواں دھار بحثم بحثا۔ سب کا متفقہ فیصلہ تھا کہ The siege انتہائی ردی فلم ہے۔

''ہالی وڈ میں ٹنوں کے حساب سے بننے والا بکواس اور گھٹیا درجے کا ٹریش'' مدن نے ناک سکیڑ کر کہا۔'' اور تم سب اس کے کنزیومرز ہو جو امریکی پبلک کی طرح پاپ کارن چباتے



ہوئے بھیڑ لگا کر پہنچ جاتے ہو۔''

''اصل میں تم لوگ بالکل اسی وجہ سے اس فلم کو دیکھ رہے ہو، جس وجہ سے یہ امریکی اسے دیکھ رہے ہیں'' اس فلم کو غزالہ کو پہلے ہی یہ فلم دیکھنے کا خیال کچھ پسند نہیں تھا۔ ''فرق صرف یہ ہے کہ تمہارا زاویہ ان سے مختلف ہے۔'' اس نے کہا۔ ''سنگل پاکستانی لڑکی ہونے کی وجہ سے وہ ہر اس کراؤڈ سے پہلے پہل الگ تھلک رہتی جس میں انڈین پاکستانی شامل ہوتے تھے، آخر میں خود ہی شامل ہو جاتی۔

غزالہ کی اس بات سے ناجیہ کو اس بار پورا پورا اتفاق تھا۔ اس نے پکوڑیوں سے بھری کاغذی ڈسپوزل ٹرے غزالہ کے سامنے سرکا دی۔ ''ان فلموں میں اسٹیریو ٹائپ کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ اور جو لوگ ان کو انجوائے کرتے ہیں، وہ اس کوری انفورس کرتے ہیں۔'' اپنی دانست میں یہ سمجھ کر اپنے سمجھانے کی ضرورت ہے، وہ رمیش کو سمجھانے لگی کہ اس کی فلم کی بنیاد یہ مفروضہ ہے کہ سارے مسلمان دہشت گرد ہوتے ہیں اور وہ امریکا کو بم سے اڑا دینے کی سازش کر رہے ہیں، وہی اچھا امریکا جو ساری دنیا کے مہاجروں کو پناہ دیتا ہے اور بے انتہا مواقع فراہم کرتا ہے۔ ایک طرف مشعل اٹھائے مجسمہ ء آزادی ہے اور دوسری طرف داڑھیاں بڑھائے، بم پھینکتے، آیتیں ورد کرتے مسلمان جو سب کے سب آیت اللہ فلاں یا ڈھمکاں معلوم ہو رہے ہیں۔

وہ جوش میں بولے چلی جا رہی تھی اور رمیش بڑی مشکل سے مسکراہٹ چھپائے اسے تک رہا تھا۔'' وہ سین یاد کرو جب بروس ولس حیرت سے دیکھ رہا ہے۔ اس مخصوص بے وقوفی کے ساتھ جو امریکیوں سے عبارت ہے، داڑھی والا ایک دہشت گرد قرآن کی آیتیں پڑھتے ہوئے بم مارنے کی تیاری کر رہا ہے اور دہشت گرد وضو کرنے کے بعد میزائل چلا رہے ہیں۔''

عمیر بیچ میں کود پڑا۔'' اور وہی ڈینزل واشنگٹن جس نے ''فلا ڈلفیا'' میں ایڈز کی مریضوں کی انسانیت اجاگر کرنے کا کام کیا تھا، اسلامی دہشت گردوں سے دوسرے مسافروں کو چھوڑنے کی درخواست کر رہا ہے۔ کم از کم بچوں کو تو چھوڑ دیں۔ ایک بوڑھا جوڑا اتر رہا ہے کہ مسافر بس دھماکے سے اڑ جاتی ہے۔

''تم لوگوں کو بھی ایسی فلموں کی ضرورت ہے۔''

رمیش اچانک بول اٹھا۔''اس سے تمہارا بھی آئیڈینٹی کرائسس حل ہو جاتا ہے۔''

''مسلمانوں کی صورت میں امریکیوں کو وہ The other مل گیا ہے جس سے مغائرت کے ذریعے وہ نفرت اور اس سے پیدا ہونے والے سیاسی فائدوں کو زندہ رکھ سکتے ہیں'' غزالہ پاؤ نگلتے ہوئی بولی۔

''تم کو بھی The other مل جاتا ہے اور امریکیوں کے خلاف دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع مل جاتا ہے'' رمیش نے کوک کی بوتل کھولتے ہوئے اسی طرح ایک جملہ کہا اور چپ ہو گیا۔

''عراق میں ہر ماہ چار سے لے کر پانچ ہزار بچے مرجاتے ہیں'' غزالہ اسی انہاک سے بول رہی تھی۔ بین الاقوامی قانون اپنے دفاع کے حق کو تسلیم کرتا ہے۔ لیکن امریکا جو کچھ کر رہا ہے اسے امریکی میڈیا کے علاوہ کون اپنا دفاع کہے گا؟ امریکا آج کا ہلاکو اور چنگیز ہے.....''

گفتگو کے جوش میں کسی نے ٹیلی فون کی گھنٹی سنی ہی نہیں کئی لوگ ایک ساتھ بول رہے تھے۔ سب ایک دوسرے سے مخاطب تھے اور کوئی کسی ایک کی بات نہیں سن رہا تھا۔ وہ سب نسبتاً جوان تھے، اپنے ملک سے دور، جذبات سے پر جس طرح انسان زندگی کے صرف اسی ایک حصے میں ہوتا ہے۔ اور ایسے میں ٹیلی فون بھلا کون سنتا؟ مگر یہ ان ٹیلی فونوں میں سے ایک تھا جو بجتے ہیں تو بجتے ہی چلے جاتے ہیں، اس نے بعد میں سوچا تھا۔ اس لیے کہ ان کے ذریعے جو خبر ملنی ہوتی ہے وہ ٹل نہیں سکتی۔

وہ ہاتھ رمیش کا تھا یا گائتری کا جس نے ٹیلی فون اٹھایا تھا اور فوراً ہی ریسیور اس کی طرف بڑھا دیا تھا۔''لانگ ڈسٹنس۔''

''دی بیچ کے دوسری طرف سے'' کسی نے خوش دلی سے کہا تھا۔ گھر سے فون کی اہمیت سے سبھی واقف تھے۔ لیکن اس نے جو سنا فوراً ہی اس کا اثر زائل ہو گیا۔ اس لیے کہ وہ امی کی آواز پہچان چکی تھی اور ان کے کہے ہوئے جملے کو پوری طرح سمجھنے کے لیے دہرا رہی تھی.....

''نانا میاں نہیں رہے'' وہ دہرائے چلی جارہی تھی: ''تمہارے نانا میاں نہیں رہے، تمہارے نانا میاں نہیں رہے.....''

امی کی آواز میں بے چارگی اور التجا اتنی واضح تھی کہ اس نے ایک لحہ رُکے بغیر کہا'' میں



آرہی ہوں۔ آپ ٹھہریئے امی، میں کراچی آتی ہوں.....''

آنسوؤں سے ستا ہوا چہرہ لیے ہوئے اس نے دوستوں کی طرف دیکھا جو سب کے سب ایک دم خاموش ہو گئے تھے۔

اس نے بقول گائتری کے، رش آور والی ٹریفک کی رفتار سے ہر کام کیا۔ اس کی کنپٹیوں پر کوئی چیز برابر ہتھوڑے مارے جارہی تھی۔ تمہارے نانا میاں نہیں رہے۔ مجھے واپس جانا ہے۔ باغ والا گھر۔ ٹھہریئے امی، میں کراچی آتی ہوں.....تمہارے نانا میاں نہیں رہے..... وہ اکیلے سفر کے لیے بھی آمادہ ہو گئیں۔ عمیر نہیں جاسکتا تھا۔ اس کا اگلے تھرزڈے کو مڈٹرم پیپر ڈیو تھا۔ وائف کے گرینڈ پیرنٹ کی ڈیتھ اور بیک ہوم، وہ ان باتوں کو اپنی ٹرم کو آر ڈی نیٹر کو نہیں سمجھا سکا، اس نے بہت اداسی کے ساتھ گائتری کو بتایا۔ ''چلو تمہارے ڈالر تو بچ گئے'' گائتری نے اپنا ردعمل ظاہر کیا تو ادھر خاموشی طاری ہو گئی۔

لیکن یہ سب سوچنے کے لیے وقت کہاں تھا۔

ٹکٹ کے کاؤنٹر پر اس نے شہر کے بارے میں سوچا، اتنے دن میں پہلی بار جب بکنگ ایجنٹ نے شہر کا نام سننے کے بعد ملک کا نام سوالیہ انداز میں دہرایا تھا۔

''ہاں، وہی شہر.....'' اس نے تقریباً بلند آواز سے کہا۔'' میں واپس جارہی ہوں۔ وہ واپس لوٹ آنے کا شہر تھا۔ بچپن کی یادوں کا شہر۔ ان لوگوں کا شہر جنہیں ہم پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ بچھڑنے کے درد کا شہر۔ ندامت اور افسوس سے بھرا ہوا، اداسی اور متلی اور بے وجہ گھبراہٹ کا شہر۔ ہوم سک سٹی۔ اپنے پیاروں کی موت کا شہر۔ جس کے مکان کم ہوتے جارہے ہیں، قبریں بڑھتی جارہی ہیں۔ واپس نہ آنے والوں کا شہر۔ مسلسل انتظار کا شہر۔ اور کہیں ایک کونہ بھی نہ مل سکنے کا شہر۔ ایک شعر نانا میاں پڑھتے تھے، وہ کہیں ذہن کے کونے کھدرے سے نکلا۔

آشیاں جل گیا رہنے کا ٹھکانہ نہ رہا
اب چمن میں کبھی آئے بھی تو مہماں ہوں گے

تو صورت حال اتنی خراب ہے کہ مجھے شعر یاد آرہے ہیں، ناجیہ نے اپنے آپ سے کہا، اور اس کے آنسو بھل بھل بہنے لگے۔ الوداع کے آنسوؤں کا شہر۔ الوداع۔ آنسوؤں کے شہر!

## (۲)

وہ خواب میں دیکھا گیا خواب تھا۔ خواب میں شہر تھا۔ خواب میں سفر تھا۔ اسے یقین نہیں تھا، کچھ بدلا ہوا سا تھا۔ کیا، یہ اسے پوری طرح پتہ نہیں تھا۔

یہی دن تھے، ایسے ہی دن۔ وہ آگے بڑھ رہی تھی۔ نہیں، اسے لگ رہا تھا کہ وہ آگے بڑھ رہی ہے۔ وہ بیٹھی ہوئی تھی، اپنی جگہ پر، جہاز کی سیٹ پر۔

اس کا سر سیٹ سے ٹکا ہوا ہے، یہ سیٹ جہاز کی ہے، اس کا اندازہ اس وقت ہوا جب وہ نشان دوبارہ ایک ہلکی سی برقی گھنٹی کی آواز کے ساتھ روشن ہوا تھا کہ اپنی حفاظتی پیٹیاں باندھ لیجیے۔ ''غیر متوقع ناہمواری کی وجہ سے......'' اسے لگا کہ ایئر ہوسٹس کی میکانیکی آواز اب نشر ہوگی اور وہ بار بار کا گھسا ہوا پیغام سنایا جائے گا۔ وہ سیٹ پر کسمسائی اور اپنا بدن ڈھیلا چھوڑ دیا۔ مگر جہاز میں خاموش تھی۔

اس نے کھڑکی سے نیچے جھانک کر دیکھا...... اس نے اپنے آپ کو جھانک کر دیکھتے ہوئے دیکھا...... آسمان کسی جھیل کی طرف شفاف تھا، کھلا اور نیلوں نیل اندھیرا۔ دور دور تک بادل کا ٹکڑا بھی نہیں تھا۔ آسمان صاف تھا بلکہ خالی۔ کسی بھی چیز سے خالی۔

تب مائک کھڑکھڑایا اور ایئر ہوسٹس کی آواز گونجی۔ اس نے وہ اعلان نہیں کیا جو ناجیہ سمجھ رہی تھی۔ وہ یہ اعلان کر رہی تھی...... جس وقت اس نے اپنے آپ کو غور سے سنتے ہوئے دیکھا......

''ہمیں افسوس ہے کہ پیائش کے آلات کی غلطی اور زمین سے رابطے میں معطلی کے سبب یہ فلائٹ اپنے راستے سے بھٹک کر اس ایئر زون پر آ گئی ہے جہاں سے تاب کاری کے اثرات ابھی پوری طرح صاف نہیں ہوئے۔ یہ وہ خطہ ہے جہاں اب سے چھ مہینے پہلے دو پڑوسی ملکوں نے ایک دوسرے کے خلاف جوہری اسلحہ استعمال کیا تھا......''

اس کی آواز اب بھی اتنی ہی سپاٹ تھی اور الفاظ اتنے ہی رسمی جن کا مصنوعی پن کانوں سے ٹکرا کر یوں ہی واپس پلٹ رہا تھا۔ جیسے جو کچھ وہ کہہ رہی ہو کچھ نہ کہہ رہی ہو۔ اور جو بات پوری طرح سنی نہ جاسکے...... دور سے آتا ہوا کوئی اعلان...... وہ ریلوے پلیٹ فارم یا ایئر پورٹ



پر انتظار میں کھڑے ہوئے، کب کب سے رکے ہوئے مسافروں میں ایک بے چینی سی پھیلا دیتا ہے...... وہ ہوا میں پھیلتے ہوئے ان الفاظ کو پکڑ کر کسی طرح سے سننا اور سمجھ لینا چاہ رہی تھی لیکن وہ اس کے بوجھل سر سے ٹکرا ٹکرا کر پلٹ رہے تھے، معنی سے عاری بھنبھناہٹ جسے نظرانداز کیا جاسکتا تھا اگر وہ مسلسل نہ ہوتی......

نہیں، مگر معنی سے پوری طرح عاری بھی نہیں کیونکہ اس نے اپنے آپ کو دوبارہ سنتی ہوئے پایا، ایئر ہوسٹس کہے جارہی تھی: ''دائیں جانب نیچے جو لکیر آپ دیکھ رہے ہیں، وہ پانی کی ہے۔ اب یہ تاب کاری کی آلودگی کی وجہ سے کسی کام کی نہیں رہی۔ اس زمانے میں یہ دریائے گنگا ہوتا تھا۔''

اس نے الفاظ پھر سن لیے اور اس کو پتہ نہیں چلا رہا تھا کہ وہ ان الفاظ کا کیا کرے۔ ان الفاظ کے بعد کیا کرے۔ برسوں پہلے جب ہم چھوٹے سے تھے اور کراچی میں رہتے تھے، تب ایک بار نانا میاں موئن جودڑو دکھانے لے گئے تھے اور مردوں کے ٹیلے پر پہنچ کر اس بوڑھے آدمی نے جو سیاحوں کو گھمانے والا گائیڈ تھا، اس طرح بتایا تھا۔

''جہاز جس شہر کے قریب سے ہو کر گزرا ہے اس کا نام کتابوں میں پاٹلی پتر لکھا ہے۔ اب نہیں ہے۔ کچھ نہیں ہے۔ یہ دلی تھی، وہ لکھنؤ تھا...... تھی، تھی، تھی۔ نہیں ہے، سب کچھ تھا، تھا، تھا...... جو گڑھا آپ دیکھ رہے ہیں وہ آگرہ تھا میزائل گرنے سے پہلے......''

نہیں، وہ اعلان کرنے میں اچھی نہیں تھی۔ اس کا لہجہ سپاٹ تھا اور اس نے کوئی Punch lines نہیں ادا کیں۔ اس نے نہ تو ''دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب'' والا مصرعہ پڑھا نہ فتح پور سیکری اور تاج محل کا نام لیا۔ Deadpan اس نے اپنے دل میں دہرایا۔ Dead، اس نے اپنے آپ کو دہراتے ہوئے سنا۔ اور اپنے آپ کو سنتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اعلان ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ ''یہ سمندر کے کنارے شہر تھا۔ میزائل اور جوابی ایٹمی حملے سے پہلے۔ دائیں جانب کی سیٹوں پر بیٹھے ہوئے حضرات دیکھ سکتے ہیں وہ جگہ جہاں پر شہر تھا۔ اس شہر کا نام کراچی کیوں تھا، اس کے بارے میں کتابوں میں کوئی نتیجہ خیز بات ابھی تک معلوم نہیں ہو سکی۔ باقی شہر تو نہیں رہا، آپ اس کے آثار دیکھ سکتے ہیں۔ آپ اتنی اونچائی سے نہیں دیکھ سکتے مگر اس شہر میں

سے جو بج رہا ہے، وہ ایمپریس مارکیٹ ہے......" ایک لمحے کے لیے وہ دیکھ سکتی تھی کہ یہ جو زمین پر لیٹی ہوئی عمارت ہے، سبز اور گلابی رنگ میں پتی ہوئی، وہ کون سی ہے۔" اور یہ اس لیے باقی رہ گئی کہ شہری ورثے کو محفوظ رکھنے والی ایک غیر سرکاری تنظیم نے پوری عمارت کو ایک اور جگہ منتقل کرنے کے لیے زمین سے اکھاڑ ڈالا تھا......"

آواز میں ایک وقفہ آیا اور اس لمحے وہ اس عمارت کو دیکھ سکتی تھی، پورے کا پورا، جیسے وہ ہوا کرتی تھی۔ اس نے دیکھا کہ اس کے ٹاور کی گھڑی اب بھی بند ہے، صدیوں سے بند۔ اور اس لمحے وہ دونوں بند سوئیاں گھوم کر اس کے چہرے پر آکر چپک گئیں جیسے اس کا چہرہ ہی وہ گھڑی ہو جو اب بند رہنا نہ چاہتی ہو......

مگر وہ اعلان اب بھی جاری تھا۔" اب ہماری پرواز کا رخ صحیح سمت میں ہوگیا ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ جہاز میں رکھا ہوا کھانا اور پانی خطرے سے خالی نہیں ہے۔ اس کا استعمال اب ممکن نہیں ہو سکے گا۔ ہم اپنی میزبانی کی سہولت بند کر رہے ہیں، آپ کو برداشت کرنا ہوگا۔ برداشت کرنا ہوگا، برداشت، برداشت، اب اور کتنی دیر؟...... خواتین و حضرات اب ہم خطرے کے خطے سے نکل آئے ہیں۔ اب سے تھوڑی دیر کے بعد جہاز دبئی کے بین الاقوامی ہوائے اڈے پر اتر جائے گا۔ جہاں گھڑیوں میں اب بھی وقت ہے اور جہاں زمین پر درجۂ حرارت...... زمینی ہے۔ آپ سے درخواست ہے کہ حفاظتی بند باندھ لیجیے، کرسی کی پشت سیدھی کر لیجیے اور جس وقت تک جہاز کے انجن مکمل طور پر بند نہ ہو جائیں، اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش نہ کریں ...... کپتان اور ان کا عملہ آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ آپ نے ہمارے ساتھ سفر کیا...... خواتین و حضرات، اب ہم آپ کو قرنطینہ میں لیے چلتے ہیں جہاں آپ کو دو ہفتے گزارنے ہوں گے...... ایک زندگی گزارنی ہوگی۔ اس لیے کہ آپ خطرے کے خطے سے آئے ہیں۔ جہاز سے اترتے وقت اپنا دستی سامان ساتھ لے جانا نہ بھولیں......"

ناجیہ نے اٹھنا چاہا لیکن حفاظتی پیٹی کس کر بندھی ہوئی تھی۔ ایئر ہوسٹس سامنے کی سیٹ پر جھکی ہوئی تھی اور ایک مسافر کے چہرے پر ماسک باندھ رہی تھی، پھر وہ اس کی جانب بڑھی کہ ماسک کے اندر سانس لینے کا طریقہ بتائے، لیکن اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا، خالی



اندھیرا، ہر طرف نیلوں نیل ...... پھر اس نے اپنے آپ کو دیکھتے ہوئے دیکھا کہ جہاز کے سارے مسافروں کو گیس ماسک لگا کر ایک بڑی سی عمارت کے اندر لے جایا جا رہا ہے جو اسپتال معلوم ہو رہی ہے لیکن اسپتال ہو نہیں سکتی اس لیے کہ اس میں اسپتالوں والی تیز بو نہیں بسی ہوئی ہے۔ اور اسی بو کی کمی کا احساس اتنا تیز تھا کہ اگر اسی کی آنکھ کھل سکتی تو وہ جاگ جاتی اور امی کو بتاتی کہ اس نے کیسا خواب دیکھا تھا۔

مگر امی تو کراچی میں تھیں، سات سمندر پار۔

## (۳)

ایئر پورٹ سے باہر نکلتے نکلتے جس سے سامنا ہوا وہ شہر استقبال کا تھا۔ غیر ضروری اور تجارتی جوش سے بھرپور خوش آمدید، ہمکتا ہوا اور دامن کھینچتا ہوا...... لوگوں کا ایک ہجوم جو اپنے ملنے والوں، چاہنے والوں کی تلاش میں ہر آنے والے کا چہرہ کا جائزہ لیے جا رہا تھا، یلغار کرتے ہوئے ٹیکسی والے جو سامان گھسیٹ لینے سے بھی دریغ نہیں کرتے اور سب کچھ مل جل کر ایئر پورٹ لاؤنج کے بند بند ماحول سے نکلنے والے مسافر کے لیے پریشان کن کہ وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ اس کی مدد کی جا رہی ہے، مشورہ دیا جا رہا ہے۔ یا سامان رکھا جا رہا ہے اپنی ٹرالی خود گھسیٹتی ہوئی جینز پہنے ہوئے لڑکی اور لوگوں سے زیادہ بے یار و مددگار نظر آ رہی ہوگی۔ اپنے چاروں طرف کی یورش میں سے کہنیوں کے ذریعے راستہ بناتی ہوئی ناجیہ نے سے امی کو ڈھونڈا جو ہجوم میں جانے کہاں دب کر رہ گئیں تھیں۔

امی کا بازو پکڑ کر ٹرالی کو کار پارک کے طرف لے جانے لگی۔

"الٰہی توبہ، ایئر پورٹ نیا بن گیا ہے، اس پر بھی رش کا وہی عالم ہے!" اس نے امی کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

"سب بہن بھائیوں کی منہ پر کالک لپ گئی۔ ابا جی نے میرے گھر میں دم توڑا۔ سب کو وہیں آنا پڑا" امی نے گاڑی میں بیٹھتے بیٹھتے اسے اطلاع دی۔

(کراچی آنے کے بعد، اتنے عرصے کی جدائی کے بعد امی نے مجھ سے جو پہلا جملہ بولا، وہ یہ تھا۔ اس نے بعد میں کہا۔ حالاں کہ اس وقت اسے صرف یہ احساس ہوا..... کتنا کچھ بدلا ہوا ملے گا! اور ایک دھچکے کے ساتھ احساس ہوا کہ کتنا کچھ بدل گیا ہے۔ وہ یہ بھی نہیں پوچھ سکی کہ باغ والا گھر ہے کہ گیا۔

جو بدل گیا اور جو نہیں بدلا، امی اسے مسلسل بتائے جارہی تھیں۔ ان کے آواز سنتے ہوئے ایک لفظ بھی اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ ڈرائیور نے اسٹیرنگ وہیل گھمایا، گاڑی زور سے اچھلی، اس نے کھڑکی کا شیشہ نیچے کر کے دیکھا، ہم کہاں آگئے۔ جس پر بار بار دھچکے لگ رہے تھے، وہ یونیورسٹی روڈ تھی، جگہ جگہ سے ادھڑی ہوئی اور ٹوٹی ہوئی۔ اس نے یاد کیا۔ اردو کالج کے سامنے سڑک پر گٹر کا پانی بھرا ہوا تھا اور ایک بس کیچڑ کے چھینٹے اڑاتی گزر رہی تھی۔

گاڑی نے موڑ کاٹا اور یاد کے ایک ریلے کے ساتھ اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ بہادر آباد کی چاٹ..... آلو چھولے اور ان کے اوپر مسالہ چھڑکا ہوا۔ مرچیں لگنے پر سی سی کرنا اور سامنے والی دکان سے قلفی لے کر اس طرح کھانا کہ گاڑھا دودھیا شیرا ٹپکنے سے پہلے حلق میں اتر جائے، نہ ہاتھ خراب ہوں نہ منہ، مرچوں کا دف الگ مرجائے ......کچی کچی کیریاں..... املی..... اس نے گھر کے سامنے والے پیڑ کو یاد کیا جس کے گدے پر وہ دن بھر چڑھی بیٹھی رہتی اور اخبار والے، ڈاکیے، آس پڑوس کے بچوں اور دوپہر میں ستانے کے لیے آنے والی بے خبر بلیوں کو بیر کی گٹھلیاں تاک تاک کر مارے جاتی..... ذائقوں کے ساتھ وہ دن بھی کھو گئے تھے اور اب کبھی لوٹ کر نہیں آسکتے تھے، اسی جگہ پہنچ کر بھی نہیں۔

امی کی آواز دوبارہ اس کے کانوں میں آنے لگی تو اس کو جھپکی سی آگئی۔

---

یہ ایک ناتمام ناول ''باغ والا گھر'' کا ابتدائی حصہ ہے۔ مصنف کے مطابق، دوسرے باب میں شہروں کو جلا دینے والی آگ کا تصور ایسا تھا کہ اس کو لکھ دینے کے بعد اسے محسوس ہوا کہ اس آگ سے اس کی انگلیاں جھلس گئی ہیں اور اس کے بعد دوبارہ قلم نہیں سنبھال سکیں گی۔ اس کے بعد آگے کچھ نہیں لکھا جاسکا۔



# خواب میں ہارا ہوا آدمی

خودکشی یا قتل!

فیصلہ تو اب اُسے کرنا ہی ہوگا۔ سائرہ نے خود سے ایک بار پھر وہی جملہ کہا جو پچھلے چار دنوں سے وہ مسلسل کہے جارہی تھی۔ مگر یہ فیصلہ کرنا ہی تو مشکل تھا۔ ایک دن میں اور کچھ نہیں تو کم سے کم ہزار بار تو ضرور وہ اس مسئلے پر سوچتی... صبح سے شام تک... شام سے رات تک اور پھر رات بھی آدھی بیت جاتی مگر کچھ طے نہ ہوتا۔ آج چوتھا دن تھا، پر اب دن کہاں تھا، یہ تو رات تھی، پچھلے پہر کی رات۔ کھڑکی کے شفاف شیشوں کے اُس طرف گھور اندھیرا تھا اور سائیں سائیں کرتا سناٹا۔ سرہانے کی تپائی پر رکھی ہوئی گھڑی کی مسلسل ٹک ٹک اُس کی ڈُگدگی میں دھمک رہی تھی۔

وہ کتنی دیر سوئی، اسے کچھ اندازہ نہیں تھا۔ کب اور کس وجہ سے آنکھ کھل گئی، یہ بھی پتا نہ چلا۔ لیکن یہ ایک دن کا ماجرا تھوڑا ہی تھا۔ اسے تو پچھلے چھ مہینوں سے اپنی سدھ بدھ نہیں تھی۔ دن کا پتا نہ رات کی خبر۔ اوڑھنے پہننے کا دھیان نہ کھانے پینے کا کچھ ہوش۔ سراج کی طرف سے ایسی پریشانی تھی کہ کسی کل چین نہیں پڑتا تھا۔ کہنے کو تو یہ چھ مہینے گزرے تھے لیکن اسے یوں لگ رہا تھا جیسے عذابوں کی چھ صدیاں اُس کی جان پر بیت گئیں۔ اور حد یہ کہ حالات میں رتی برابر فرق نہیں آیا کہ آگے ہی کل سے جینے کی کچھ امید بندھے۔ آخر چار دن پہلے اسے یوں لگا جیسے پورا وجود ڈھے گیا اُس کا، اعصاب شل ہوگئے ہیں۔ تب اُس نے سوچا خواب کیا تھا اور اس کی تعبیر کیا ہے۔ وہ تو اپنی جنت تعمیر کرنے نکلی تھی مگر پہنچ گئی جہنم میں۔

مدھم نیلگوں روشنی کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ مشرقی دیوار پر آبی رنگوں کا لینڈ اسکیپ اس

وقت کسی دیومالائی سرزمین کا ٹکڑا معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے سرسبز منظر اور عمودی رخ کے حاشیے پر اودے، پیلے اور قرمزی پھولوں کی کیاری سب کے سب نائٹ بلب کے شیڈ کے باعث زندگی سے عاری اور غیر حقیقی معلوم ہو رہے تھے۔ سائرہ کی نظریں دیر سے اس پینٹنگ پر ٹکی ہوئی تھیں۔ اُس نے سوچا، اِس لینڈ اسکیپ کی طرح اُس کے اپنے ہنستے بستے جیون کا منظر بھی تو دُکھ کے ایک شیڈ میں آ کر کیسا ڈراؤنا اور ڈرامائی ہو گیا ہے۔ اُس نے بارہا خود کو سمجھایا تھا، دلاسا دیا تھا کہ اچانک ایک دن یہ ڈراما ختم ہو جائے گا اور وہی اہلا گہلا جیون ایک بار پھر لوٹ آئے گا لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔ گزرتے دنوں کے ساتھ اُس کی ڈور اُس کے ہاتھ سے نکلتی جا رہی تھی۔ آخر ایک دن اُس نے بوجھ تلے دبے سینے میں لمبا سانس کھینچ کر ہوا بھری اور سوچا، اسے سراج سے طلاق لے لینی چاہیے۔ اُس لمحے اسے لگا جیسے اس کے جسم کا درجۂ حرارت تیزی کے ساتھ نقطۂ انجماد کی طرف گر رہا ہے۔ اس سے پہلے کہ سینے میں بھری ہوا برف کی سِل بن جائے، اس نے پورا منھ کھول کر پھیپھڑے خالی کر دیے۔ سینہ خالی ہوا تو جیسے اس کا ذہن بھی بالکل خالی ہو گیا۔

یہ تو بس ایک بات تھی جو تنگ آمد بجنگ آمد، اس کے ذہن میں آ گئی، لیکن اگلے چار دن جب اس گتھی کو سلجھانے میں گزرے تو اس نے جانے کیا کیا سوچا۔ ایک ایک لمحے میں سیکڑوں باتیں۔ ذہن مسلسل اُدھیڑ بن میں لگا ہوا تھا۔ گزرے ہوئے ماہ و سال، ان کے دکھلائے ہوئے خواب، ایک شخص کے لیے سارے زمانے سے مول لیے گئے جھگڑے، آنسو، قہقہے، بوسے جانے کیا کیا تھا جو پل بھر میں اُس کی آنکھوں کی پتلیوں میں پھر جاتا تھا... اور تب فیصلہ مشکل ہو جاتا۔ اس کے دو دل ہو گئے تھے۔ ایک کہتا تھا سراج کو چھوڑ دو، اس عذاب سے نجات حاصل کر لو۔ دوسرا روکتا تھا، تمھیں معلوم ہے یہ قدم اٹھانا سراج کو قتل کر ڈالنے کے برابر ہے۔ اور پھر کوئی اس کے اندر پھسکتا، لیکن اس طرح سسکتے رہنا بھی تو دھیرے دھیرے خودکشی کرنے سے کسی طرح کم نہیں۔ لیکن تم نے تو اِس آدمی کی خاطر ساری دنیا تیاگ دی تھی، سو اب کیا پریشانی ہے؟ دونوں طرف سے دلائل کا سلسلہ طول کھینچتا ہے اور وہ الجھتی چلی جاتی ہے، کوئی فیصلہ نہیں کر پاتی۔

اس وقت بھی ساری فضا میں دھواں پھیلا ہوا ہے۔ اسے کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ ایک شخص کے لیے وہ ساری دنیا سے لڑ مرنے کو تیار تھی مگر کیوں؟ اس لیے کہ سرو قامت اور



چوڑے سینے کا وہ آدمی ہی ایسا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اجیاری صبحوں کا اجالا تھا اور اُس کی باتوں میں، اُس کے لفظوں میں روح کو پگھلانے والی تمازت تھی۔ وہ اپنی انگلیوں کی پوروں تک جیون کے رس سے لبالب بھرا ہوا تھا۔ وہ تو آدمی ہی کوئی اور تھا... مگر یہ شخص جو پچھلے چھ مہینے سے اس کے پہلو میں آ لیٹا ہے، اور جو اس وقت بھی مسہری کے اس سرے پر بے سدھ پڑا سو رہا ہے، یہ سراج کا ہم شکل ضرور ہے، لیکن اِس میں اُس جیسا ایک بھی گن نہیں ہے۔ سراج کے سانسوں کی آنچ تو سائرہ کے جسم میں خون کی گردش بڑھا دیا کرتی تھی لیکن یہ بے چارہ تو سراپا ٹھنڈے گوشت کا لجلجا سا ایک لوتھڑا ہے۔ ان چھ مہینوں میں سائرہ نے کتنی بار اُس کھوئے ہوئے شخص کو ڈھونڈنے اور زندگی کی حرارت کو ٹوہنے کی کوشش کی لیکن بے سود... سب بے کار۔

سامنے دریچے کے شیشوں سے جھانکتے اندھیرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔ تاریکی چھٹتے چھٹتے سرمئی ہو گئی تھی۔ سائرہ نے اس عرصے میں کتنی دفعہ رات کے اندھیارے کو پہلے صبح کا دھندلکا بنتے اور پھر اس دھندلکے کو علی الصبح کے ملائم چاندنے کی سرمئی اوٹ میں چھپتے دیکھا تھا۔ اسے اب بھی کبھی یوں لگتا جیسے طویل اکتا دینے والے خواب کا یہ رکا ہوا منظر کسی گھڑی اچانک اُس کی آنکھوں کے آگے سے ہٹ جائے گا لیکن یہ خواب نہیں تھا، حقیقت تھی... ایک بھیانک حقیقت جس نے اس کے سارے خوابوں کو نگل لیا تھا۔ اکثر اسے محسوس ہوتا کہ اس کے اندر گرم اور سرد دونوں لہریں بہ یک وقت دوڑ رہی ہیں۔ کبھی گرم لہر غالب آ جاتی ہے اور کبھی سرد لہر۔ اس وقت اس کے وجود میں ٹھنڈک سرسرا رہی تھی، ہڈیوں کا گودا بھی جمتا ہوا لگ رہا تھا۔ پہلو میں لیٹا سراج کا ہم زاد اس کے حال سے بے خبر، نیند کی دواؤں کے اثر میں سو رہا تھا۔ سائرہ نے اٹھ کر دریچے کی ریلنگ پر ایک طرف سمٹے ہوئے پردے کو کھینچ کر برابر کیا، نائٹ بلب کا سوئچ آف کیا اور سر تک دلائی تان کر لیٹ گئی۔

دن چڑھے جب اُس کی آنکھ کھلی تو سراج دفتر جانے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ وہ فوراً اٹھ کر رسوئی گھر میں جا گھسی۔ سراج نے کہا بھی کہ رہنے دو میں دفتر میں کینٹین سے کچھ منگوا کر کھا لوں گا لیکن وہ اتنی دیر میں ٹوسٹر میں سلائس ڈال چکی تھی اور اب آملیٹ بنانے کے لیے انڈا پھینٹ رہی

تھی۔ بیاہ کے دنوں میں جب وہ مایوں بیٹھی ہوئی تھی تو بیاہی ہوئی سہیلیاں اسے گرہستی کلیان کے ٹونکے پڑھانے آتیں۔ سائرہ! شوہر کے دل کی طرف ایک راستہ اُس کے پیٹ کی طرف سے بھی ہو کر جاتا ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ مرد کو اگر گھر والی کے ہاتھ کا پکا کھانے کی چاٹ لگ جائے تو بڑے سے بڑا سانڈ کھونٹے سے بندھا رہتا ہے۔ لیکن اس نصیبوں جلی کو قسمت نے گرہ میں باندھے ہوئے ٹونکے آزمانے کا موقع ہی کب دیا تھا۔ شادی کو ابھی مہینہ بھر مشکل سے ہوا تھا کہ یہ افتاد آ پڑی۔ ابھی تو وہ زندگی میں آنے والی تبدیلیوں کو سمجھ ہی رہی تھی ... اپنی شخصیت میں ہونے والی توسیع پر غور کر رہی تھی، ابھی تو اس کی آنکھیں آنے والے وقت کی دھند میں لپٹے خواب ناک منظروں کو تاکنے میں لگی ہوئی تھیں کہ یکا یک رتجگوں کا موسم شروع ہو گیا۔ اولاد کی خواہش تو ہر عورت کو ہوتی ہے لیکن یہ کون مورکھ چاہے گی کہ جس نام کے سیندور سے اُس نے مانگ بھروائی ہے اسی کی دیکھ ریکھ اپنی کوکھ کے جنے کی طرح کرے۔ سائرہ کے ساتھ یہی تو ہوا تھا۔

''ناشتا... ناشتا... ناشتا!'' سراج نے رسوئی گھر میں جھانکا اور ہانک لگائی۔

''لو تم یہ توس اور جام لے کر چلو، میں آملیٹ اور چائے لے کر آتی ہوں۔''

سراج نے بڑھ کر طشتری اٹھائی اور ڈائننگ ٹیبل پر جا بیٹھا۔ پیچھے پیچھے دوسری طشتری اٹھائے وہ رسوئی گھر سے نکلی۔

''ہائیں ایک کپ چائے کیوں؟ تم ناشتا نہیں کرو گی ساری؟''

''نہیں میں نے ابھی ماؤتھ واش نہیں کیا۔ تمھیں دیر ہو رہی ہو گی، تم کر لو۔''

''کوئی دیر نہیں ہو رہی ڈارلنگ! مجھے کون سا اب خبروں کے پیچھے دوڑنا پڑتا ہے۔ میں تو آج کل میگزین کر رہا ہوں۔ سارا کام ایک ٹیبل پر۔ چائے کی پیالی میں طوفان۔ میری جان! راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔ بارہ بجے نہ پہنچے ساڑھے بارہ بجے پہنچ گئے، کیا مضائقہ ہے۔ سوئیٹ بے بی! تم فٹافٹ منھ دھو لو۔ ہم ساتھ ہی ناشتا کریں گے۔''

سائرہ اٹھ کر بیسن پر چلی گئی۔ سراج جلدی جلدی اخبار الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ پھر سارے اخبار لپیٹ کر صوفے پر پھینک دیے اور میڈونا کی اس معروف دھن کے بول گنگنانے لگا جو ڈاکٹر منصور کے بہ قول آدمی کے اندر کیبرے ناچ کے جذبات ابھارتی ہے۔ سائرہ کو واپس آتا دیکھ



کر اس نے نغمے کی اختتامیہ تھاپ میز پر لگائی اور اسے دیکھ کر مسکرانے لگا۔ مختصر سے ناشتے کے بعد وہ چائے کا کپ لے کر اخبار میں پھر کوئی خبر تلاش کرنے لگا۔

''ساری ڈیئر! تم نے اسکول سے لمبی چھٹی لے کر اپنے ساتھ بڑا ظلم کیا ہے۔''

''میں بہت تھک گئی تھی اور پھر میری leave بھی due تھی۔''

''لیکن یہ چھٹیاں تم جس طرح گزار رہی ہو، وہ ٹھیک نہیں ہے۔ ضرورت سے زیادہ آرام بھی آدمی کو تھکا دیتا ہے۔ تم نے خود کو گھر میں قید کیوں کر لیا ہے، باہر نکلو، گھومو پھرو۔''

''نکلتی ہوں۔ ڈونٹ وری۔ آئی ایم او کے۔''

''ہاں! اور تمھیں ٹھیک ہی رہنا ہے۔'' اس نے سائرہ کا گال تھپتھپایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

گھڑی بھر کے لیے رک کر اس نے کچھ سوچا پھر سائرہ کا ہاتھ تھام کر بولا، ''ساری ڈیئر! یہ دنیا اب سکون سے رہنے کی جگہ تو نہیں رہی۔ آئی ایم سوری لیکن پھر بھی تمھیں ...'' اس کی آواز بھرا گئی اور ہونٹ کپکپانے لگے۔

سائرہ جیسے چونک کر خواب سے بیدار ہوئی۔ ''ہاں میں جانتی ہوں ... لیکن بھلا مجھے کوئی پریشانی کیوں ہو گی، تم جو میرے ساتھ ہو۔'' وہ پورے قد سے اس کے سامنے کھڑی تھی۔

''سو سوئیٹ!'' سراج نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

''اچھا سنو سراجی! میں ابھی تھوڑی دیر میں گھر سے نکلوں گی۔ دو تین جگہ جانا ہے، شام ہو جائے گی۔ تمھارے پاس آ جاتی ہوں، کیا خیال ہے ڈنر کرتے ہوئے گھر آ جائیں گے۔''

''ارے واہ! ٹھیک ہے۔'' وہ فوراً بہل گیا۔ ''بہت دن سے ہم لوگوں نے باہر کھانا نہیں کھایا۔ مزہ آئے گا۔'' اس کے چہرے پر بچوں جیسی خوشی تھی۔

''دوپہر بعد تمھیں فون کر کے میں ٹائم کنفرم کر لوں گی۔''

''ٹھیک ہے پھر میں چلتا ہوں۔''

سراج کے جانے کے بعد سائرہ نے دروازہ بند کیا اور وہیں دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ کیا یہ آدمی پھر پہلے جیسا ہو سکے گا؟ اس نے خود سے پوچھا۔

شاید ہاں ... شاید نہیں۔

کیا میری باقی زندگی اسی طرح گزرے گی ویران، بے مقصد... بچوں کی حسرت میں اور شوہر کو بچوں کی طرح بہلاتے کھلاتے ہوئے؟

شاید ہاں... شاید...؟

ایسے آدمی کے ساتھ وہ اپنی زندگی کیوں غارت کرے؟ اس سے علاحدہ کیوں نہ ہو جائے؟

لیکن یہ وہی آدمی ہے نا جس کی خاطر...

نہیں! اب یہ وہ آدمی نہیں ہے... یہ تو کوئی آسیب ہے، سایہ ہے۔

وہ دیر تک اسی طرح کھڑی رہی۔ ہاں نہیں کی اس کش مکش نے اسے اندر سے توڑ ڈالا تھا۔ سامنے دیوار پر لگی گھڑی پہ نظر پڑی۔ آدھا دن گزر چکا تھا۔

نیلم اور سائرہ جب ڈاکٹر منصور کے اسپتال پہنچیں تو شام ڈھلنے لگی تھی۔ باؤنڈری وال کے ساتھ اسپتال کے عقب تک جاتے باغیچے میں یہاں وہاں پتھر کی بینچوں پر اکا دکا لوگ بیٹھے تھے۔ عقب کی طرف جاتے راستے پر ایک شخص نوجوان عورت کے ساتھ دھیرے دھیرے چہل قدمی کر رہا تھا۔ سائرہ نے غور کیا اس عورت کی آنکھوں کی پتلیاں غیر معمولی طور پر متحرک تھیں جیسے وہ کسی بے چینی یا خوف کا شکار ہے۔ وہ دور سے بالکل ٹھیک اور پرکشش نظر آ رہی تھی لیکن قریب آنے پر بیمار اور کم زور دکھائی دینے لگی۔ کاریڈور میں استقبالیہ کے ساتھ لگی پلاسٹک کی کرسیوں پر ایک ادھیڑ عمر آدمی گیارہ بارہ سال کے بچے کے ساتھ بیٹھا پاپ کارن کھا رہا تھا۔ سائرہ نے جاننے کی کوشش کی کہ ان میں سے مریض کون ہے۔ کچھ اندازہ نہ ہوا۔ شاید یہ دونوں ملاقاتی ہوں اور اپنے کسی عزیز سے ملنے آئے ہوں، اس نے سوچا۔

''ڈاکٹر منصور!'' نیلم نے استقبالیہ پر بیٹھی ہوئی لڑکی سے پوچھا۔

''میڈم سائرہ!'' لڑکی نے رسمی مسکراہٹ کے ساتھ استفسار کیا۔

نیلم نے سائرہ کی طرف اشارہ کیا۔

''پلیز! آپ سامنے والے روم میں چلی جایئے۔ ڈاکٹر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔''



''اس لڑکی کی آنکھیں کتنی نیلی تھیں۔'' نیلم نے ڈاکٹر کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے سائرہ سے کہا۔

''لگ رہا تھا لینز لگائے ہوئے ہیں۔'' سائرہ بولی۔

''ہاں جب میں نے پہلی بار اسے دیکھا تو مجھے بھی یہی لگا تھا، میں نے پوچھا تو اس نے بتایا، اس کی آنکھیں ہی ایسی ہیں۔''

''عجیب آنکھیں ہیں، بالکل گڑیا جیسی۔''

نیلم نے دھیرے سے دروازے پر دستک دے کر ہینڈل گھمایا، ایک پٹ آہستہ سے اندر کی طرف کھلتا چلا گیا۔

''ہیلو خواتین!'' ڈاکٹر منصور نے اپنے مخصوص انداز میں نعرہ لگایا اور کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

دونوں خواتین بڑے گھیر کی میز کے دوسری طرف اس کے بالکل سامنے آ بیٹھیں۔

''ہائے سائرہ! ہائے نیلم! کیا حال ہیں۔''

''سب ٹھیک ہے ڈاکٹر! تم سناؤ'' نیلم نے جواب دیا۔

سائرہ نے سر کو جنبش دینے پر اکتفا کیا۔

''یار! پہلے چائے چلے گی۔ میں نے تم لوگوں کے انتظار میں شام کی چائے نہیں پی۔''

ڈاکٹر منصور نے انٹر کام پر چائے کے لیے کہا پھر سائرہ سے مخاطب ہوا۔ ''سائرہ بیگم! تم آج کل کس جہان میں ہو؟ نہ کلب آتی ہو اور نہ ہی کسی پارٹی میں دکھائی دیتی ہو۔ کہاں ہو بھئی؟''

''نرک میں!''

''نو... نو مڈل کلاس فلمی ڈائیلاگ!'' ڈاکٹر منصور نے ٹوکا۔

''یہ کوئی ڈائیلاگ نہیں ہے۔'' سائرہ نے جھونجھل سے کہا۔

''سائرہ بیگم! فار ہیونز سیک، کیا ایک مہینے بعد تم نے شکل اس لیے دکھائی ہے کہ تم مجھے بور کرو گی۔ ویسے آپس کی بات ہے، میں بالکل نہیں سمجھ پا رہا، تم آج اتنی خوب صورت کیوں لگ رہی ہو!... کیا کوئی بیوٹی ٹپس چل رہے ہیں؟''

"ڈاکٹر منصور! اس کا مطلب ہے تم آج پہلی بار اسے غور سے دیکھ رہے ہو؟" نیلم بھی اس کے ساتھ مل گئی۔

"بکومت!" سائرہ نے نیلم کو ڈپٹا۔

ہلکی سی دستک کے بعد دروازہ کھلا اور ایک آدمی چائے کی طشتری اٹھائے کمرے میں داخل ہوا۔

"کیا کہتی ہیں تمھاری رپورٹس؟" سائرہ نے ڈاکٹر منصور سے پوچھا۔

"دیکھو سائرہ بیگم!" ڈاکٹر منصور ایک دم سنجیدہ ہوگیا۔ "تم پڑھی لکھی لڑکی ہو۔ میں تمھیں اصل سچویشن بتا رہا ہوں تاکہ تم خود کو تیار کر کے سراج کے لیے helpful ہوسکو۔ اس کی رپورٹس سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں that he is deadly shocked، وہ بری طرح متاثر ہے۔"

"لیکن یہ سب کچھ صرف ایک خبر پر کیسے ہوگیا؟" سائرہ الجھی ہوئی تھی۔

"یہ صرف خبر نہیں ہے سائرہ بیگم ... پورا ایک واقعہ ہے ...خبر تو یہ دوسرے لوگوں کے لیے ہوگی لیکن سراج کے لیے تو یہ ہول ناک واقعہ ہے۔ ویسے تم خبر کو کیا سمجھتی ہو، کیا تم نے کبھی نہیں سنا فلاں بات سن کر آدمی کو ہارٹ اٹیک ہوگیا ...ایک خبر بہت بڑے حادثے کا سبب بن سکتی ہے۔ آدمی کے اندر سر سے پاؤں تک دراڑ ڈال سکتی ہے۔ سراج جیسے حساس اور ambitious لوگ ایک چھوٹی سی بات پر، ایک معمولی سے واقعے پر مفلوج ہوسکتے ہیں، مرسکتے ہیں، مومن سے کافر بن سکتے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے اب وہ کبھی ..."

"نہیں! ایسی بات نہیں ہے۔" ڈاکٹر منصور نے سائرہ کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "ہم مایوس نہیں ہیں۔ یہ طویل مدت کی تھیراپی کا کیس ضرور ہے لیکن سراج لاعلاج بہرحال نہیں ہے۔"

"کتنی مدت اور ڈاکٹر منصور! تمھیں پتا ہے میں پچھلے چھ مہینے سے جہنم میں ہوں۔" وہ سسک پڑی۔

"نہیں سائرہ! نہیں پلیز۔ تم تو ہمت والی لڑکی ہو۔" نیلم نے اسے تھپکا۔

"سائرہ! اگر تم خود کو کمپوز نہیں رکھوگی تو شاید ہم سراج کے لیے کچھ نہیں کرسکیں گے۔



ہمارا ایک محبت کرنے والا دوست اور ایک امن پسند آدمی ضائع ہو جائے گا۔ ہمارے معاشرے میں سراج جیسے انسانیت پرست لوگ ویسے ہی کم ہیں۔ جو تھوڑے بہت ہیں، ہمیں انھیں بچانے کی، زندہ رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اور سراج کے لیے ہمیں تمھاری مدد کی ضرورت ہے۔" ڈاکٹر منصور نے ایک لمحے کے لیے تامل کیا اور پھر بولا۔ "منصور کے ٹریٹمنٹ کے لیے ہمیں ایک ایسے مددگار کی ضرورت ہے جو اسے چوبیس گھنٹے اٹینڈ کرسکے۔ ایثار کے ساتھ، محبت اور نرمی سے اس کی نگہداشت کرسکے۔ یہ کام تمھارے سوا کوئی نہیں کرسکتا۔ اس کی ماں زندہ ہوتی تو وہ بھی نہیں کرسکتی تھی۔ اس لیے کہ اس حالت میں سراج کو ایسی ہستی کی ضرورت ہے جو اپنا تن من دھن سب کچھ اسے سونپ سکے۔ اس کا دماغ اس وقت ماضی کی ایک خاص سطح پر لوٹ گیا ہے۔ ہمیں اسے grow کرکے واپس اپنی سطح پر لانا ہے۔ یہ ایک ٹائم taking عمل ہے، کئی سال لگ سکتے ہیں لیکن یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ جلد بہت جلد ہمارے اندازے سے کہیں پہلے بہتر ہوجائے۔ ہم وقت کے بارے میں یقین سے نہیں کہہ سکتے۔"

"لیکن اس کی تو اپنی حالت غیر ہے، یہ سراج کو کیسے سنبھالے گی؟" نیلم کو خود سائرہ کی طرف سے تشویش تھی۔

"ہاں سائرہ! تمھیں پہلے خود کو سنبھالنا ہوگا۔" ڈاکٹر منصور نے کہا۔

"کیسے سنبھالے گی؟" نیلم بولی۔ "ایک ابنارمل شخص کے ساتھ رہتے رہتے تو اچھا بھلا آدمی خود بھی ابنارمل ہوسکتا ہے۔"

"مائی گاڈ! بیوقوفی کی باتیں نہ کرو نیلم؟ سراج ابنارمل نہیں ہے۔ اس کے ساتھ اس وقت ایک سائیکک پرابلم ضرور ہے لیکن وہ پاگل نہیں ہے۔ کوئی حرکت وہ پاگلوں جیسی نہیں کر رہا۔ اس کا وہ ہذیانی، ہسٹریائی فیز گزر چکا ہے۔ اب اس کے ساتھ بس ایک مسئلہ ہے ...ذہنی صدمے کی وجہ سے اس کی ازدواجی زندگی suspend ہوگئی ہے...اور تو کوئی پرابلم نہیں ہے اس کے ساتھ۔" ڈاکٹر منصور نے سوالیہ نظروں سے سائرہ کی طرف دیکھا۔

سائرہ نے نفی میں سر ہلایا پھر بولی۔ "وہ اچانک کسی بات پر بالکل بچوں کی طرح روہانسا ہوجاتا ہے۔ جیسے بس ابھی رونے لگے گا..."

''بچوں کی طرح ... بچے ...! ہاں یہی تو وہ مسئلہ ہے جس نے اس کے اندر کی دنیا اتھل پتھل کر دی ہے۔'' ڈاکٹر منصور نے دھیرج سے کہا۔

''اور جب میں اسے سنبھالتی ہوں، دلاسا دیتی ہوں تو بھی... وہ بالکل بچہ بن جاتا ہے اور رات کو سوتے ہوئے بھی وہ بالکل بچوں کی طرح ... جیسے بچہ اپنی ماں سے لپٹ کر، چپک کر سوتا ہے... بالکل اسی طرح وہ مجھ سے ...'' سائرہ کی آواز بھرا گئی۔

''سائرہ بیگم! یہی تو پرابلم ہوئی ہے اس کے ساتھ۔ اسی مسئلے میں ہمیں تمھاری مدد کی ضرورت ہے۔''

''لیکن میں اس کی ماں نہیں ہوں، بیوی ہوں ڈاکٹر منصور!''

''تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن ... look سائرہ! ہر عورت کے اندر ایک پیدائشی ماں ہوتی ہے۔ مامتا عورت کے خمیر میں شامل ہے۔ میں یہ نہیں کہتا تو خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہو یا یہ کہ تمھارا مسئلہ معمولی ہے، but listen to me سائرہ! ایک بات سمجھ لو، this is not the ... end of the world... اس دنیا کے عجب رنگ ڈھنگ ہیں۔ اگر تم یہ سوچ رہی ہو کہ اب سراج کے ساتھ رہنا خودکشی کے مترادف ہے، اسے چھوڑ دینا چاہیے تو تمھیں اس کا پورا حق حاصل ہے، but remember تمھارے الگ ہونے کا فیصلہ سراج کے قتل کا فیصلہ ہوگا۔'' ڈاکٹر منصور نے آخری جملہ ٹھہر ٹھہر کر اور ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

''میں جانتی ہوں۔ اچھی طرح جانتی ہوں اسی لیے اب تک اس کے ساتھ ہوں۔''

''لیس! سراج کو ایک ایسے ہی وجود کی ضرورت ہے جو اس کے مسئلے کو سمجھ سکے، جو اسے مامتا کی نرمی اور بیوی کے جسم کی گرمی دونوں بہ یک وقت دے سکے۔ سائرہ! میں یہ سب باتیں تم سے ہرگز نہ کہتا ... مگر مجھے معلوم ہے تم کوئی عام تام لڑکی نہیں ہو۔ تم نے دنیا سے لڑ کر سراج کو حاصل کیا ہے۔ تم ہی اسے زندگی کی طرف واپس لا سکتی ہو۔ ہاں سائرہ تم ہی...''

سائرہ سر نیہوڑائے بیٹھی تھی۔ اس کی نظریں سامنے رکھی چائے کی خالی پیالی پر مرکوز تھیں۔ ڈاکٹر منصور اسے دیکھ رہا تھا۔ سائرہ نے لمحے بھر کے لیے ڈاکٹر کی پشت کی دیوار پر لگے وکٹورین زمانے کے گھڑیال پر نظر ڈالی اور پھر سر جھکا لیا، منصور نے دیکھا، اس کی پلکوں پر آنسو جھلملا



رہے تھے۔

''سائرہ!'' اس نے ملائمت سے پکارا۔

''ہوں!''

''یہ دنیا بڑی عجیب ہے۔ یہاں قدم قدم پر تمھیں انوکھے منفرد اور نرالے کردار ملیں گے۔ میں روزانہ دس ساڑھے دس گھنٹے اس نفسیاتی ہسپتال میں گزارتا ہوں۔ روز ایسے لوگوں سے ملتا ہوں جنھیں دیکھ کر، جن کے مسائل جان کر، جن کی کہانیاں سن کر حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح زندہ ہیں یہ لوگ۔ اور تو اور یہ جو میرے ریسپشن پر لڑکی بیٹھی ہے نا، یہ بھی دنیا کے اس ناٹک کا ایک دلچسپ کردار ہے۔ ایم اے ہے اور یہاں ریسپشنسٹ بن کر بیٹھی ہے۔ سب سے مسکرا مسکرا کر بات کرتی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ اندر سے ایک گھائل روح ہے۔ کبھی پوچھو اس سے کیوں ملازمت کرتی ہے؟ اس لیے کہ اسے اپنی مفلوج ماں اور پاگل بھائی کو پالنا ہے۔ یہ دو بہنیں ہیں، دونوں ملازمت کرتی ہیں۔ اپنے لیے نہیں اپنے مرحوم باپ کی چھوڑی ہوئی ذمہ داریاں پوری کرنے کے لیے۔ اس سے پہلے یہ ایک رئیل اسٹیٹ ایجنسی میں کام کرتی تھی۔ اس سے عمر میں پچیس تیس سال بڑا کمپنی کا ملک شادی کی آفر کر رہا تھا اسے ... دو بیویاں پہلے گھر میں تھیں، اسے وہ تیسری بنانا چاہتا تھا۔ انکار سن کر اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آیا۔ اُدھر اس کی دوسری بہن کی سنو۔ وہ ایک بڑے وکیل صاحب کی پی اے ہے۔ وکیل صاحب بے اولاد ہیں، وہ اسے بیٹی سمجھتے ہیں۔ آنکھ کا تارا بنا کر رکھا ہوا ہے۔ ایک تو یہ دنیا بھانت بھانت کے کرداروں سے بھری پڑی ہے اور اوپر سے ہر کردار کا مقدر الگ تماشے دکھاتا ہے...''

سائرہ اور نیلم دونوں گہرے انہماک سے ڈاکٹر منصور کی تقریر سن رہی تھیں۔ ہمیں تو اپنی کہانی پہ ناز تھا لیکن، ہر ایک دل میں عجب ایک داستان ملی، سائرہ نے سوچا۔ گھڑیال نے رات کے نو کی نوبت بجائی تو سائرہ چونکی۔ ''اٹھنا چاہیے۔ مجھے ساڑھے نو تک سراج کے دفتر پہنچنا ہے۔'' اس نے نیلم کو ٹہوکا دیا۔

''ہاں چلو!'' نیلم نے کہا۔ ''اچھا ڈاکٹر منصور ہم لوگ اب چلتے ہیں۔'' وہ دونوں اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"تم لوگ کہیں آؤٹنگ پر جا رہے ہو!"

"نہیں میں تو راستے میں گھر ڈراپ ہو جاؤں گی۔ یہ دونوں ڈنر پر جا رہے ہیں۔"

"یہ ہوئی نا بات... سائرہ!" ڈاکٹر منصور کی آواز میں شفقت تھی۔ "تمھیں اسی طرح کچھ مہینے یا... یا شاید کچھ سال سراج کا خیال رکھنا ہے۔ وہ لوٹ آئے گا تمھارے پاس۔ مجھے امید ہے کہ آج کے بعد اس مہم میں تمھیں کبھی کوئی disappointment نہیں ہوگا۔"

"ہوں۔" سائرہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

"گڈ گرل!" ڈاکٹر منصور نے مسکرا کر الوداع کہا۔

دروازہ کھولتے ہوئے انھیں ڈاکٹر منصور کی آواز سنائی دی۔ "ارے بھئی سنو! وہ بات تو بیچ میں رہ گئی۔"

دونوں نے مڑ کر سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"سائرہ بیگم! بھئی وہ جو میں پوچھ رہا تھا کہ آخر تم آج اتنی خوب صورت کیوں لگ رہی ہو؟ تم نے کچھ بتایا ہی نہیں۔"

"شٹ اپ!" سائرہ نے نرمی سے کہا۔

ڈاکٹر منصور کا قہقہہ کمرے سے باہر تک ان کے ساتھ آیا۔

یہ ٹولہ اس وقت کلفٹن کے ساحل کے آخری سرے پر بندھے پتھریلے پشتے پر ڈیرہ ڈالے بیٹھا تھا۔ دور افق پر جہاں سمندر اور آسمان ایک دوسرے سے ملتے دکھائی دیتے ہیں، غروب آفتاب کے بعد کی سرخی مٹیالے رنگ میں تبدیل ہوگئی تھی۔ پرندوں کی ایک ڈار سمندر اور آسمان کے بیچ کھنچے ہوئے حاشیے کی صورت تیرتی دکھائی پڑتی تھی۔ شام کا دھندلکا دھیرے دھیرے سیاہی مائل ہو رہا تھا۔ ساحل پر کھیلتے بچے، عورتیں اور مرد چھٹ گئے تھے۔ یہاں وہاں اکا دکا لوگ ٹہل رہے تھے۔ دائیں ہاتھ پر آبادی کی طرف لوٹتے ہوئے جہاں ریستوراں ہیں اور خوردنی اشیا اور مشروبات کے ٹھیلے کھڑے ہوتے تھے، وہاں لوگوں کا ہجوم ڈھل رہا تھا۔ ضیغم نے گنگنانا شروع کیا۔

"صاف چھپتے بھی... بھی... ہی ہی نا ہیں... سا آ آ منے آتے بھی بھی نا ہیں!"



"نو ضیغم! نو پلیز۔ یہ ظلم مت کرو۔ سارے دن کی تھکن کے بعد بے چارہ سمندر اب استراحت کے موڈ میں ہے... نیند اچٹ جائے گی اس کی۔" لیلیٰ بولی۔

اجتماعی قہقہہ بلند ہوا۔

انجلا نے ٹکڑا لگایا۔ "یار ہمارے کان تو عادی ہیں اس ستم کے لیکن سمندر کے تو سر میں درد ہو جائے گا۔"

"کیا خیال ہے اٹھا جائے۔" ڈاکٹر منصور نے سائرہ سے پوچھا۔

سائرہ نے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

"کوچ کا نقارہ بجے۔" ڈاکٹر منصور نے انجلا کو اشارہ کیا۔

"تمھارا لاؤڈ اسپیکر سب سے اچھا ہے۔" انجلا نے نیلم سے کہا۔

"لیڈیز اینڈ جنٹل مین! اٹینشن پلیز۔ اب یہ چنڈال چوکڑی خراماں خراماں چلتے ہوئے یہاں سے تین چار منٹ کی ڈرائیو کے بعد اس ہوٹل کے سامنے جا رکے گی جس کا نقشہ دیہات کے ماحول کے مطابق تیار کیا گیا ہے۔ وہ ہمارا اگلا پڑاؤ ہے جہاں ہم عشائیہ کریں گے۔" نیلم نے اعلان نشر کیا۔

"تم ہمارے ساتھ آجاؤ سائرہ۔" گاڑیوں کی طرف جاتے ہوئے لیلیٰ نے ہانک لگائی۔

"ڈاکٹر منصور! تمھاری گاڑی میں جو ویکینسی نکلی ہے، اس پر میں آجاتی ہوں۔" انجلا نے کہا۔

"خواتین آل ویز خوش آمدید۔ آجاؤ انجلا بیگم، آجاؤ۔" ڈاکٹر منصور نے جواب دیا۔

"سائرہ! سب تیاری اوکے ہے؟" گاڑی میں بیٹھتے ہوئے لیلیٰ نے پوچھا۔

"ہاں!"

"اچھا یہ تو ضیغم نے تمھیں بتا دیا ہوگا کہ جاوید کو تمھاری فلائیٹ کنفرم کر دی گئی ہے۔ رات اس کا ای میل آیا تھا۔ وہ ہیتھرو ائیرپورٹ پر تمھیں لینے آجائے گا۔ تم لوگ اس کے اپارٹمنٹ پر رہو گے۔ جیدی ہم بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا ہے لیکن زبردست آدمی ہے۔ بہت جولی، بہت مزے کا۔ تمھیں بالکل اجنبی نہیں لگے گا۔ ضیغم کی بھی ہمارے گھر میں سب سے زیادہ اسی سے

انڈراسٹینڈنگ ہے۔"

"لیلیٰ! تم سب لوگ میرا اور سراج کا بہت خیال رکھ رہے ہو۔" سائرہ کی آنکھیں بھر آئیں۔

"نو سائرہ! نو ڈارلنگ۔ not like this ... یہ سب نہیں چلے گا۔" لیلیٰ نے اس کا ہاتھ تھاما۔

"بہادر لڑکی ہے... سائرہ ایک بہادر لڑکی ہے۔" ضیغم نے عقب میں دیکھنے والے شیشے سے جھانکتے ہوئے کہا۔

"ایک سال ہو گیا لیلیٰ! پورا ایک سال۔" سائرہ کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"سراج اچھا ہو رہا ہے سائرہ!... اور جب تم لندن سے واپس آؤ گی تو وہ بالکل ٹھیک ہو چکا ہوگا... پہلے جیسا۔ لندن کا سب سے بڑا نیورولوجسٹ اسے ٹریٹمنٹ دے گا۔ جیدی بھی اس کی بہت تعریف کر رہا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ وہ اپنے ہر کیس کو ذاتی پرابلم بنا کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر منصور نے اسے پوری کیس ہسٹری بھیج دی ہے۔ علاج کے دوران بھی منصور اس سے مسلسل رابطے میں رہے گا۔ don't worry سراج بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔"

صبح جب سائرہ کی آنکھ کھلی تو سرہانے کی طرف کے دریچے سے روشنی چھن چھن کر اندر آ رہی تھی۔ سراج بے سدھ سویا ہوا تھا۔ سائرہ کو اس پر پیار آیا۔ کتنا کم سونے کا عادی تھا یہ شخص... چار پانچ گھنٹے مشکل سے اور اب دواؤں کے اثر میں پندرہ سولہ گھنٹے سویا رہتا ہے۔ اس کا چوڑا چکلا آگے کو ابھرا ہوا سینہ دب گیا تھا۔ شانے اندر کو جھک آئے تھے۔ آدھا رہ گیا تھا اس کا جسم۔ زندگی کیا شے ہے... گورکھ دھندا ہے یا شاید کوئی بھول بھلیاں ہے۔ آدمی سمجھتا ہے، اس اندھے موڑ سے نکل گیا تو آگے اُسے صاف اور سیدھا راستہ مل جائے گا۔ اسے پتا ہی نہیں ہوتا کہ اگلا قدم کس کٹھنائی میں پڑنے والا ہے۔ تقدیر کے ہاتھوں میں انسان کی حیثیت ایک کٹھ پتلی کے سوا کیا ہے؟ جس طرح وہ نچاتی ہے بس ناچتا رہے... ناچار... بے چون و چرا... اس کا سر گھوم رہا تھا۔ کچھ دیر وہ گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی رہی پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔ جب وہ کمرے سے باہر نکلی تو جاوید کچن میں نظر



آیا۔ ایپرن باندھ وہ ناشتے کی تیاری میں مصروف تھا۔ اسے آتا دیکھ کر وہ مسکرایا۔ "صبح بخیر دیدی!"

"صبح بخیر! آج تو اتوار ہے جیدی۔ تم آج بھی صبح جلدی اٹھ گئے۔"

"وہ کیا ہے دیدی کہ مجھے دن چڑھے تک بستر پر پڑے اینڈتے رہنے کی عادت نہیں ہے۔"

"لیکن آج تو..."

"ہاں چھٹی ہے مگر میں اپنی عادت خراب نہیں کرتا۔ دیدی! پردیس میں آدمی سارے نخرے بھول جاتا ہے، کوئی ناز اٹھانے والا جو نہیں ہوتا۔ خیر چھوڑو۔ تم سناؤ کیسی گزر رہی ہے؟"

"جیسی ہے تمھارے سامنے ہے۔"

"سراج بھائی تو ابھی سوئیں گے نا۔"

"ہاں۔"

"میں چائے بنا چکا ہوں۔ اپنے لیے ناشتا بھی تیار کر چکا ہوں۔ تم تھوڑا سا ناشتا میرے ساتھ کر لو، باقی سراج بھائی کے ساتھ کر لینا۔ ہیں دیدی! کیا خیال ہے؟"

"میں ابھی صرف چائے پینے کے موڈ میں ہوں۔"

"چلو یہ بھی ٹھیک ہے۔"

وہ کچن میں چلا گیا اور سائرہ واش بیسن کی طرف بڑھ گئی۔ جب وہ منھ دھو کر واپس آئی تو جیدی ناشتا میز پر سجائے بیٹھا تھا۔

"جیدی! تم ناشتے کے لیے مجھے آواز دے لیا کرو نا۔"

"ارے دیدی! تم چند دن کے لیے مہمان آئی ہو اور یہاں بھی میں تمھیں ہنڈیا چولھا جھونکنے بٹھا دوں۔ یہ تو زیادتی ہوگی۔"

سائرہ نے اسے مامتا بھری نظروں سے دیکھا۔ کیسا لڑکا ہے یہ... بالکل اپنی بڑی بہن کی طرح ہے۔ لیلیٰ بھی کس طرح خیال رکھتی رہی ہے میرا، اس نے سوچا۔ "اس میں زیادتی کی کیا بات ہے؟ جب تک میں یہاں ہوں، یہ چھوٹے موٹے کام دیکھ لیا کروں گی۔" سائرہ نے دھیرج سے کہا۔

''نہیں دیدی! تم براہِ مہربانی ایسا کچھ مت کرو۔ مجھے تو ابھی یہاں اور کئی سال رہنا ہے۔ آدمی آسائشوں کا بڑی جلدی عادی ہو جاتا ہے اور پھر بعد میں اسے ان کی وجہ سے پریشان رہنا پڑتا ہے۔''

''اچھا! یہ بتاؤ تم کتنے عرصے سے یہاں ہو؟''

''تقریباً ساڑھے تین سال ہو گئے۔''

''تمھاری زبان ذرا خراب نہیں ہوئی۔ کیسی صاف اردو بولتے ہو تم۔ ایک لفظ انگریزی کا نہیں آتا تمھاری زبان پر۔''

''دیدی! بات یہ ہے کہ اپنوں سے تو اپنی زبان میں ہی بات کر کے مزہ آتا ہے۔ اپنوں اور اپنائیت کا صحیح معنوں میں مجھے یہاں آ کر اندازہ ہوا ہے۔ جب وہاں تھا تو ان باتوں کا خیال تک نہیں آتا تھا۔ یہاں آ کر ساری باتیں خود بہ خود سمجھ آنے لگیں۔ مجھے جب بھی وقت ملے تو اردو فلم دیکھنا میرے لیے ایک پرلطف تفریح ہوتی ہے۔''

سائرہ نے محبت سے اسے دیکھا... پھر وہی سوال، یہ زندگی آخر کیا شے ہے!

''دیدی! کیا میں سراج بھائی کے حوالے سے کچھ باتیں تم سے پوچھ سکتا ہوں؟''

''ہاں، کیوں نہیں۔''

''یہ بتاؤ دیدی کہ پہلی بار تمھیں کس طرح محسوس ہوا کہ سراج بھائی میں کوئی غیر معمولی بات ہے... کسی تبدیلی، کسی بیماری کے آثار یعنی سب سے پہلے کیا ہوا تھا؟''

''دیکھو، اس وقت تو حقیقت یہ ہے کہ مجھے بالکل اندازہ نہیں ہوا تھا حالاں کہ سراج کے رویے میں اور طور طریقے میں تبدیلی تو ہو رہی تھی لیکن میرا تو دھیان ہی اس طرف نہیں گیا کہ کیا ہو رہا ہے۔ میں اسے عام سا وقتی قسم کا مسئلہ سمجھتی رہی لیکن پھر جب زیادہ گڑبڑ محسوس ہوئی اور مسئلہ سنجیدہ لگا تو ڈاکٹر کو دکھایا... کئی ڈاکٹروں کو دکھایا... پھر ایک دن ہمارے ایک دوست ہیں ڈاکٹر منصور ... تم جانتے ہو انھیں؟''

''ہاں ہاں! سائی کیٹرسٹ نا!''

''ہاں وہی... سراج کی طبیعت کا سن کر وہ ایک دن ملنے گھر آئے۔ خاصی دیر بیٹھے رہے،



جاتے ہوئے مجھے کہنے لگے، کل وقت نکال کر میرے پاس اسپتال چکر لگانا۔ اگلے دن میں اور لیلیٰ اکٹھے گئے۔ وہ تفصیلات پوچھنے لگے، سراج کب سے ایسا ہے، کیسے رہتا ہے، کیا کرتا ہے، کھانے پینے، سونے جاگنے سب باتوں کی تفصیل۔ اب میرے ذہن میں ساری باتیں اس طرح تھوڑی تھیں۔ میں سوچنے اور الجھنے لگی۔ لیکن پھر ڈاکٹر منصور نے خود اپنے سوالوں سے اور اس وقت کے حالات اور سراج کی کنڈیشن کے بعض اشاروں سے اس مسئلے کو سمجھنے میں میری مدد کی۔ بہت دیر باتیں واتیں کرنے کے بعد اس نے جب مجھے یہ کہا کہ سراج کا رویہ اس وقت ایک نفسیاتی مریض جیسا ہے تو میں دھک سے رہ گئی۔''

''یعنی آپ کو ڈاکٹر منصور کے بتانے سے پہلے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ سراج بھائی کسی نفسیاتی الجھن کا شکار ہیں؟''

''نہیں یہ تو میرے فرشتوں کو بھی نہیں پتا تھا۔ بھئی یہ اتنا اچانک ہوا کہ میں کچھ سمجھ ہی نہیں سکی اور سمجھ بھی کیسے سکتی تھی۔ یہ سب کچھ صرف ایک خبر کی وجہ سے ہو رہا ہے، میرے تو گمان میں بھی نہیں آ سکتا تھا بلکہ یہ بات تو مجھے اب تک سمجھ نہیں آئی۔''

''کیا مطلب؟ یہ سب بس ایک خبر سے کیسے ہوا؟''

''جس دن انڈیا کے پانچ ایٹمی دھماکوں کی خبر آئی تھی، یہ اسی دن سے ڈسٹرب تھے۔ پریشان سے، جھنجلائے ہوئے، چڑچڑے سے تھے۔ ان دنوں سراج اپنے اخبار کے ایڈیٹوریل والے صفحے پر بھی لکھ رہے تھے۔ ہماری شادی کو ابھی ایک مہینہ ہی ہوا تھا۔ میں نے اسکول سے دو ماہ کی leave لی ہوئی تھی۔ میرا تو آدھا دن اخباروں کے ساتھ ہی گزرتا تھا۔ سراج کا لکھا ہوا تو میں ایک ایک لفظ پڑھتی تھی اور پھر رات گئے جب یہ دفتر سے واپس آتے تو ہم کھانے کے بعد خبروں کے حوالے سے باتیں بھی کرتے تھے... لیکن ان دنوں یا تو وہ بات کے موڈ میں نہیں ہوتے تھے یا اگر ہوتے بھی تو ذرا سی دیر میں چڑ جاتے کسی نا کسی بات پر۔ میں نے خبروں وبروں کے بارے میں گفتگو کرنا ہی چھوڑ دیا اور سوچا کہ کوئی دفتری مسئلہ وغیرہ ہوگا۔ بھئی آدمی کے ساتھ دس جھنجھٹ ہوتے ہیں۔ اس وقت ان کا پسندیدہ موضوع بس یہ تھا کہ پاکستان جوابی دھماکا نہ کرے۔''

''پاکستان جوابی دھماکا نہ کرے، پسندیدہ موضوع کیا مطلب؟''

''بھئی مطلب یہ کہ جو آدمی یہ کہے کہ پاکستان کو انڈیا کے جواب میں ایٹمی دھماکے نہیں کرنے چاہییں ورنہ یہ مسئلہ ہو جائے گا وہ مسئلہ ہو جائے گا، یہ اس کے ساتھ تو آرام سے اور دیر تک بات کر سکتے تھے باقی کسی سے نہیں۔ اچھا! اُدھر یہ حال کہ پورے ملک میں شور مچا ہوا تھا کہ ہمیں فوراً جوابی کارروائی کرنی چاہیے۔ ایک ہڑبونگ مچی ہوئی تھی۔ عام آدمی سے لے کر بڑی بڑی سیاسی جماعتوں تک جسے بھی دیکھو یہی کہہ رہا ہے کہ پاکستان کو فوراً ایٹمی دھماکا کرنا چاہیے۔ سراج جیسے لوگ بہت کم ہوں گے جو یہ نہیں چاہتے تھے۔ تو جس دن پاکستان نے چھ ایٹمی دھماکے کیے اس دن میں نے سراج کی حالت غیر دیکھی۔ دفتر سے بھی سرِشام واپس آگئے تھے۔ کھانے میں حالاں کہ ان کی پسند کا شلجم گوشت بنا ہوا تھا لیکن ایک روٹی بھی پوری نہیں کھائی۔ میں نے پوچھا طبیعت خراب ہے تو ہوں ہاں کر کے رہ گئے۔ میں نے کہا چلیں ڈاکٹر کے چلتے ہیں تو سنی ان سنی کر کے لیٹ گئے۔ ساری رات بے چینی میں گزاری۔ اگلے دن دفتر جاتے ہوئے دروازے پر رکے اور کہنے لگے، یہ دنیا بہت منحوس ہوگئی ہے، اب رہنے کے قابل نہیں رہی۔ میں جانتی ہوں سراج شروع سے ایک sensitive آدمی ہیں۔ سوچا حالات کی وجہ سے جذباتی دباؤ میں ہیں۔ اس دن خلافِ معمول آدھی رات کو گھر لوٹے۔ میں انتظار میں بیٹھی پریشان ہوتی رہی۔ کھانا گھر آ کر کھاتے تھے اور اگر باہر کھانا ہو تو صبح ہی بتا کر جاتے کہ کھانے پر انتظار نہ کرنا میں کھا کر آؤں گا۔ خیر جب آئے تو میں نے کہا، کھانا کھالیں۔ بولے، بھوک نہیں ہے۔ میں نے کہا، میں تو انتظار میں بیٹھی تھی۔ ایسے ہوگئے جیسے سن ہی نہیں رہے۔ گھر میں رات کے کھانے کے بعد کبھی کبھی ایک آدھ سگریٹ پی لیا کرتے تھے لیکن اب اچانک ایک کے بعد دوسری سگریٹ چلنے لگی۔ جب تک جاگتے سگریٹ ہاتھ میں رہتا۔ تین چار دن تک بس یہی ہوتا رہا۔ میرے تو کچھ پلے نہیں پڑ رہا تھا۔ ایک دن دفتر سے آتے ہی کہنے لگے، اگر میں تم سے کہوں کہ چلو کہیں جنگل میں، کسی ویرانے میں چل کر رہتے ہیں تو تم چل دوگی میرے ساتھ؟ میری تو ویسے ہی عقل ٹھکانے نہیں تھی کہ یہ کیا ہو رہا ہے، اب جو یہ سنا تو بالکل ہی اوسان خطا ہوگئے۔ میں رونے لگی۔ گھڑی بھر کھڑے میری شکل دیکھتے رہے پھر مجھے روتا چھوڑ کر چپ چاپ بستر پر جا کر پڑ گئے۔ صبح اٹھے تو بولے، کوئی بھی آدمی جسے اپنی ہونے والی اولاد سے محبت ہو اسے چاہیے کہ بچے پیدا نہ کرنے کا تہیہ کر لے۔ میں بازو تھام کے بیٹھ گئی۔ سراج آپ کو کیا



ہوگیا ہے؟ کن سوچوں میں گم ہیں؟ کیسی باتیں کرنے لگے ہیں؟ آپ کو بالکل احساس نہیں کہ میں سارا دن گھر میں اکیلی رہتی ہوں۔ آپ کے بارے میں سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی ہوں۔ آخر ہوا کیا ہے آپ کو؟ کہنے لگے، سائرہ! میں بہت سوچنے سمجھنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ دنیا خراب ہو چکی ہے۔ اب یہ کسی امن پسند اور انسان دوست آدمی کے رہنے کے لائق نہیں رہی۔ سیاست دانوں اور ایٹم بموں کے نرغے میں آئی ہوئی اس دنیا میں اولاد پیدا کرنا اپنے ساتھ اور ہونے والی اولاد کے ساتھ بدترین زیادتی ہوگی۔ میں نے کہا، کیا بوجھ ہے آپ کے ذہن پر، آپ مجھے بتائیے، آخر آپ کو ہوا کیا ہے؟ کیسی باتیں کرنے لگے ہیں۔ بولے، نہیں میں تو اب بالکل ریلیکس ہوں اس لیے کہ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ہم بچے پیدا نہیں کریں گے۔ ہم اپنے بچوں کو اقتدار پرستوں اور ایٹم بموں کی بھینٹ نہیں چڑھائیں گے۔ میں تو گم صم ہوگئی، کچھ سوجھا ہی نا کہ کیا بات کروں۔ بس اس دن جب دفتر گئے تو دوپہر بعد فون آیا کہ طبیعت خراب ہوگئی تھی اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ اعصابی دباؤ کا شکار ہیں۔ دو ہفتے اسپتال میں رہے۔ ٹھیک ہو کر گھر آ گئے ...لیکن دن میں کئی بار یہی کہتے کہ بچے پیدا نہیں کرنے۔ پھر جس دن ڈاکٹر منصور گھر آئے تو انھوں نے دیکھا اور پھر پتا چلا کہ اصل مسئلہ کیا ہے ...تو بھیا یہ ہوا تھا۔''

''اچھا کتنے دن ہوگئے اس عارضے کو؟''

''تیرہ مہینے سے کچھ دن اوپر ہوگئے۔''

''میں بھی ویسے تو ڈاکٹری پڑھ رہا ہوں، آپ جانتی ہیں، مگر میرا اس طرح کے امراض سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا ...لیکن میں نے سراج بھائی کے ڈاکٹر سے جو باتیں کی ہیں اس سے کچھ اندازہ ہوتا ہے۔ میں یہ سب باتیں میڈیکل کے حوالے سے پوچھ رہا ہوں ...آپ یہ بتائیے آپ نے اس عرصے میں کوشش نہیں کی کہ آپ کے ہاں اولاد ہو؟''

''میں کیا کر سکتی ہوں ... دیکھو! میرے کرنے سے ... میرا مطلب ہے ایک شخص کے کرنے سے کیا ہوتا ہے؟ ان کی حالت تو میں تمھیں بتاؤں بالکل کم سن بچوں جیسی ہے ...یعنی جنھیں ایسی کسی بات کا بالکل پتا ہی نہ ہو۔ ایسے میں بچے کہاں سے ہوں گے؟''

''آپ کے کہنے پر، initiate کرنے پر بھی کوئی فرق نہیں پڑتا؟''

"نہیں، بالکل نہیں...تم بتاؤ تمھیں ڈاکٹر نے کیا کہا ہے؟"

"ڈاکٹر کہتا ہے کیس پیچیدہ ہے لیکن وہ مایوس نہیں ہے۔ کچھ دن کے لیے پھر اسپتال میں داخل کرنا ہوگا؟"

"دوبارہ داخل کرنا ہوگا؟"

"ہاں۔ وہ کہہ رہا ہے کہ اگلے مہینے پھر انھیں اسپتال میں داخل کریں گے، شاک تھیراپی کے لیے... اب وہ کچھ نیوڈز کے ذریعے، فلموں کے ذریعے، شاک دے کر ٹریٹمنٹ کرے گا... دیکھیں اب جو بھی ہے۔"

فروری کی خوش گوار شام کا سورج ڈھلتا چلا گیا تھا۔ ساحل سے آنے والی ہوا میں ٹھنڈک اور نمی تھی لیکن اس سے اکتاہٹ نہیں ہو رہی تھی۔ جناح پارک والی سڑک پر دائیں بائیں یہاں سے وہاں تک گاڑیاں پارک تھیں۔ پارک سے کافی فاصلے پر ضیغم کو گاڑی کھڑی کرنے کی جگہ ملی۔ آج اُسے دیر ہوگئی تھی۔ گاڑی سے اتر کر اس نے ڈگی میں سے جوگر نکال کر پہنے اور تیز تیز قدموں سے پارک کی طرف بڑھا۔ دروازے پر پہنچ کر اس نے دیکھا سراج حسبِ معمول دائیں ہاتھ کے لان میں کھڑا پیٹ کم کرنے کی ورزش میں مصروف تھا۔ سائرہ وہاں نہیں تھی۔ جوگنگ کرتے ہوئے جب وہ سراج کے قریب سے گزرا تو اس نے وش کیا۔ سراج مسکرایا۔ ضیغم نے اپنی توند پر ہاتھ رکھ کر اشارے سے پوچھا، فرق پڑا کہ نہیں۔ سراج نے بھی اشارے سے کہا، ہاں پڑ رہا ہے۔ ضیغم آگے نکل گیا۔ اگلے چکر میں اس نے پھر اشارے سے کہا راؤنڈ پورے کرلوں پھر آتا ہوں، جانا نہیں۔ سراج نے اثبات میں سر ہلایا۔ سائرہ اب بھی نظر نہیں آرہی تھی۔ ضیغم نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ وہ پارک کے آخری سرے پر کھڑی کسی عورت سے بات کر رہی تھی۔ اگلے چکر میں وہ اسے خراماں خراماں روش پر ٹہلتی ہوئی مل گئی۔

"مادام! شام کا سلام۔ اور ہاں کل جیدی کا ای میل آیا تھا۔ تمھیں یعنی اپنی پیاری دیدی کو اس نے بہت بہت سلام کہلایا ہے۔" ضیغم اس کے برابر سے گزرا۔

"وعلیکم! کیسا ہے وہ، ٹھیک ہے!" سائرہ نے پیچھے سے آواز لگائی۔ "اور یہ آج لیلیٰ



کہاں ہے؟"

"جیدی مزے میں ہے۔ لیلیٰ دیر سے آئے گی، ٹیپو کے اسکول میں فنکشن تھا۔" ضیغم نکلتا چلا گیا۔

سائرہ جب چوراہے والی روش پر پہنچی تو اس نے دیکھا کہ چار پانچ سال کا ایک بچہ سراج کے پاس کھڑا ہوا باتیں مٹھور رہا ہے۔ اسے سخت حیرت ہوئی، سراج اور کسی بچے سے باتیں... لیکن اس کے وہاں پہنچنے سے پہلے بچہ جا چکا تھا۔ "سراج کون تھا یہ بچہ!"

"پتا نہیں کون تھا۔ اچانک آ گیا۔ کہنے لگا، ایکسکیوزمی! انکل آپ روزانہ صرف ایکسر سائز کر کے چلے جاتے ہیں، جوگنگ کیوں نہیں کرتے۔ میں نے پوچھا، بیٹے! آپ کو کیسے پتا کہ میں جوگنگ نہیں کرتا۔ بولا، میں روز آپ کو دیکھتا ہوں۔ آپ یہاں کھڑے ہوکر صرف ایکسر سائز کرتے ہیں اور پھر وائٹ کلر کی گاڑی میں ایک آنٹی کے ساتھ بیٹھ کر چلے جاتے ہیں۔"

سائرہ نے دیکھا، یہ سب بتاتے ہوئے سراج کا چہرہ کھلا ہوا ہے۔ "ارے اُسے کسی محترمہ نے تو تمھارے پیچھے نہیں لگا دیا؟" اس نے سراج کو چھیڑا۔

"بہت مزے کا بچہ تھا... جاتے جاتے رکا پھر پوچھنے لگا، آپ کیا کرتے ہیں؟ میں نے کہا، جرنلسٹ ہوں... اخبار میں کام کرتا ہوں۔ بولا، اگر آپ میری طرح پائلٹ بننا چاہتے ہیں تو پھر جوگنگ بھی آپ کو کرنی پڑے گی... ضروری ہے۔" سراج نے قہقہہ لگایا۔

سائرہ نے بہت دنوں بعد سراج کی یہ کھلکھلاہٹ دیکھی۔ وہ دھیرے سے بولی، "سراج! ہمارے بچے ہوں گے تو وہ بھی ایسے ہی مزے مزے کی باتیں کریں گے۔"

سراج نے ہمدردی اور محبت سے اس کی طرف دیکھا... اس کی آنکھوں میں یقین اور بے یقینی کے سائے ساتھ ساتھ لرز رہے تھے۔

طاہر آفریدی

ترجمہ: مصنف

# گیارہ، اٹھائیس

گزشتہ نصف صدی سے یہ لمبا، طویل اور خار دار تار بچھایا گیا ہے اور میں گزشتہ نصف صدی سے اس لمبے اور خاردار تار پر پڑا ہوں......

اس سے پہلے بھی اسی طرح کا خار دار تار تھا۔ مگر وہ ایک دائرے کی صورت بچھایا گیا تھا...... اس باڑ میں میرے ساتھ اس زمین پر بسنے والے بھی گھیر لیے گئے تھے۔ اس خاردار باڑ میں جب بھی کوئی موقع ملتا تو ہم سب اکھٹے ہو کر اس باڑ کو توڑنے اور اس سے نکلنے کی کوشش کرتے۔ مگر اب......! اب یہ خاردار تار ایک لکیر کی طرح بچھایا گیا ہے اور میں اس تار پر اس طرح پڑا ہوں کہ میرا آدھا وجود ایک طرف اور آدھا دوسری طرف کی ملکیت بن گیا ہے۔ اس خاردار تار کے تیز نوکیلے کانٹے میری کمر میں پیوست ہو کر میرے سینے سے نکل گئے ہیں۔ ان تیز کانٹوں نے میرے وجود پر ایسے زخم لگائے ہیں کہ میرے وجود کے دونوں طرف قطرہ قطرہ بوند بوند خون ٹپک رہا ہے۔ وہ لوگ جو میرے ساتھ کبھی باڑ میں گھیرے گئے تھے اب میرے اردگرد گھوم پھیر رہے ہیں اور مجھے ندیدوں کی طرح تک رہے ہیں۔ عجیب بات ہے کہ میرے وجود کے جس رُخ سے خون ٹپکنے لگتا ہے تو مخالف سمت کے لوگ خوشی سے چیخ اٹھتے ہیں اور مسرت سے ناچنے لگتے ہیں، بالکل اسی طرح جب دوسری طرف کے زخم سے خون رسنے لگتا ہے تو مخالف طرف کے لوگ خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔

میں ان لوگوں کو چیخ چیخ کر بتاتا ہوں اور پچھلے صدیوں کی حالات اور واقعات یاد دلاتا ہوں۔ مگر وہ میری کوئی بات نہیں سنتے، میری فریاد پر کان نہیں دھرتے۔ اگر سن بھی لیتے ہیں تو



مجھے ڈانٹ کر طنزیہ انداز میں کہتے ہیں، ''خاموش اور چپ پڑے رہو...... تو ان باتوں کو نہیں سمجھتے۔ تم ایک دروغ گو افسانہ نگار ہو......''

میں ان لوگوں کو دیکھ کر پہچان لیتا ہوں۔ ان میں بڑے بڑے نامور وکیل، قانون داں بھی ہیں، ان میں کامیاب تاجر بھی ہیں، ان میں بڑی بڑی پگڑیوں والے بھی ہیں، ان میں نیم برہنہ جسم اور بڑے توندوں والے بھی ہیں جن کی پیشانیوں پر مکاری اور فریب کی متوازی لکیریں کھینچی گئی ہیں۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جن کی لمبی لمبی داڑھیوں نے ان کے سینوں پر اس طرح سائے کر رکھے ہیں کہ ان کے دلوں تک حقیقت کی روشنی کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ اور ان لوگوں میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو اونچی اونچی حویلیوں اور جاگیروں سے نکل کر شہروں کے چوک اور بازار میں لوگوں کو جمع کر کے اپنی ساحری سے لوگوں پر ایسا جادو پھونک دیتے ہیں کہ ان کے جذبات سلگ اٹھتے ہیں اور مخالفین کو گالیاں دینے لگتے ہیں...... وہ ہاتھوں میں غلیل لے کر ایک دوسرے پر پتھر، کنکر پھینکتے ہیں...... مگر ان کے غلیلوں اور منجنیقوں سے پھینکے ہوئے سارے پتھر، کنکر مجھ پر ہی ژالے کی طرح گرتے ہیں۔ میں چیخنے چلانے لگتا ہوں اور ان سے فریادی بن کر درخواست کرنے لگتا ہوں۔ مگر وہ میری کوئی بات، کوئی درخواست نہیں سنتا...... وہ تو مجھے جھوٹا، دروغ گو شاعر اور افسانہ نگار کہتا ہے اور کسی دروغ گو پر اعتبار بے وقوفی ہوتی ہے۔

میرے وجود سے ٹپکنے والا خون جب دونوں طرف تھوڑا سا جمع ہوتا ہے تو وہ سب میرے قریب آ جاتے ہیں اور میرا خون چلوؤں میں لے کر اس طرح مزے سے پینے لگتے ہیں جیسے کہیں سے انہیں پرانی شراب مل گئی ہو۔ میں جانتا ہوں کہ میرے خون کا نشہ پرانی شراب کے نشے سے زیادہ ہے۔ اسی لیے تو یہ لوگ پیتے پیتے ایسے بدمست ہو جاتے ہیں کہ میرے سینے پر اچھلنے، کودنے لگتے ہیں...... گزشتہ نصف صدی کے دوران ان لوگوں نے تین مرتبہ بدمست سانڈوں کی طرح ایک دوسرے کے سینگوں میں سینگ دے کر کشتیاں لڑی ہیں اور میری تمام ہڈیاں چور چور کر دی ہیں۔ میری ہڈیاں اب بھی درد کر رہی ہیں...... مگر میں کوئی فریاد نہیں کر سکتا کہ اس طرح اصولوں کے خلاف سمجھا جاتا ہے اور مجھ پر جھوٹے شاعر اور جھوٹے افسانہ نگار

ہونے کا الزام لگایا جاتا ہے۔

میں دونوں طرف ان لوگوں کو دیکھتا ہوں۔ وہ کبھی کبھی لڑتے لڑتے ایک دوسرے کی طرف ایسی میٹھی اور پیاری نظروں سے دیکھنے لگتے ہیں جیسے اخوت، بھائی چارے اور دوستی کے مضبوط، پکے اقرار اور وعدے کرنے والے ہوں، جیسے یہ ارادہ کرنے والے ہوں کہ آئندہ وہ میرے سینے پر کشتی نہیں لڑیں گے، جیسے وہ آئندہ میرا خون نہیں پئیں گے۔ میں ان کی اس ظاہری دوستی اور محبت کو دیکھ کر خوش ہوجاتا ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ شاید ان کی دوستی اور محبت پر صداقت غالب آجائے۔ مگر اس عہد و پیمان کے دوران ہی ان کے چہروں پر قہر اور غصے کے انگارے سلگ اٹھتے ہیں۔ میں سمجھ جاتا ہوں کہ ان کے سینوں میں حسد اور نفرت کی آگ پر پھر کسی نے حیوانیت کا تیل ڈال دیا ہے۔ میں ایک عرصے سے اس کانٹے دار تار پر پڑا کراہ رہا ہوں اس کانٹے دار تار کے لمبے لمبے کانٹے میری کمر میں چبھ کر میرے سینے کے پار نکل گئے ہیں۔ میں اسی کانٹے دار تار کے سبب تن سے برہنہ ہوں، بھوکا ہوں اور بیمار ہوں۔ مسلسل فاقوں اور بیماری سے میری انتڑیاں میرے پیٹ میں جیسے سوکھ گئی ہیں اور اب اندر سے میرے جسم میں چبھ رہی ہیں۔ بیماری اور کمزوری کی وجہ سے میری پسلیوں کی ہڈیاں ایک ایک گنی جاسکتی ہیں......

میں بھوکا ہوں، بیمار ہوں، برہنہ ہوں......

بھوک، پیاس، بیماری، نقاہت اور کمزوری کی سبب جب میری رگوں میں خون کی کمی آجاتی ہے تو اُس وقت یہ لوگ میرے قریب آجاتے ہیں اور میرے دونوں طرف آکر کھڑے ہوجاتے ہیں۔ وہ مجھ سے ہمدردی کرنے لگتے ہیں، میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگتے ہیں اور مجھے مضبوط، پکے وعدوں کا یقین دلاتے ہیں، روٹی کے چند ٹکڑوں کے ساتھ میری پیاسی زبان پر پانی کے چند قطرے ٹپکا دیتے ہیں، میرے زخموں پر کچھ مرہم پٹی کرا دیتے ہیں اور میرے، بیمار اور ناتواں اور برہنہ وجود کے لیے دوا دارو اور کپڑے کا کچھ بندوبست کر لیتے ہیں۔ جس کی وجہ سے میرے کمزور وجود میں توازن آنے لگتا ہے اور میری رگوں میں خون جاری ہونے لگتا ہے میں کچھ قوت پاکر اس خاردار تار سے اٹھنے کی کوشش کرنے لگتا ہوں...... مگر......

میں اونچے اونچے پہاڑوں کی دوسری طرف دیکھنے لگتا ہوں۔ وہاں کے رہنے والے



حسد، نفرت، ذاتی مقاصد اور سیاسی مصلحتوں کی بنا پر خود غرضی اور لالچ کی آگ میں جل بھن گئے۔ میں ان لوگوں اور اُس ملک کے باغوں کو دیکھنے لگتا ہوں جس میں انگور، انار، سیب اور خوبانیوں کی جگہ اب جلانے کی لکڑیاں اور خار دار جھاڑیاں اُگتی ہیں اور اب وہاں بارود بھرے بگولے اٹھ رہے ہیں۔ میں اس زمین کی ان دوشیزاؤں کو دیکھتا ہوں جن کے رخساروں سے خون کے رنگ ٹپکتے ہوئے محسوس ہوتے تھے اور جن کی ٹھوڑیوں کی تل پر شیراز سے کشمیر تک بخشے جاتے تھے۔ مگر اب......

اب اُن کے چہروں پر ٹی بی کا زرد مرض اس طرح پھیل گیا ہے کہ وہ اپنی تمام خوبصورتی، تمام حسن بموں کی آگ اور بارود کے دھویں میں ایسے جھلسا چکے ہیں کہ اب اُن پر رحم آنے کے بجائے ان سے کراہیت محسوس ہو رہی ہے۔

میں جس مقام پر جس خاردار تار پر پڑا ہوں اس کی ایک طرف بڑا، وسیع، خشک، بے آب، ریتیلا صحرا ہے اور دوسری طرف بے آب و گیاہ خشک اور اونچا پہاڑ سر اٹھائے کھڑا ہے۔

میں اس صحرا کو دیکھتا ہوں...... میری نظر جہاں تک جاسکتی ہے وہاں تک مجھے اس صحرا میں کوئی ذی روح دکھائی نہیں دیتا۔ نہ کہیں درخت، جھاڑ، پودے نظر آتے ہیں۔ یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے اس صحرا میں خالی بگولوں کا راج ہو، خشک اور حیات سے خالی صحرا!

مگر مجھے اس خشک اور زندگی سے خالی صحرا میں بھی ایک طرح کی خوبصورتی دکھا دیتی ہے۔ میں اس صحرا کو ایک شاعر کی نظر سے دیکھتا ہوں اور فطرت کے اس فیاضی سے بخشے ہوئے حسن کا تماشہ کرتا ہوں۔ خاموشی، سکوت، وسعت اس صحرا کا فطری حسن ہے، میں محسوس کرتا ہوں کہ قدرت نے اس صحرا پر بھی خوب فیاضی دکھائی ہے اور اسے ایک طرح کی خوبصورتی دے کر یہ ثابت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ حسن اور خوبصورتی کو پسند کرتا ہے،

میں وسیع و عریض صحرا کے حسن اور خوبصورتی کے نظارے میں محو ہوں کہ مجھے دور کچھ سائے نظر آجاتے ہیں۔ میں ان سایوں اور ہیولوں کو دیکھنے لگتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ شاید انسان اس لق دق صحرا میں بھی اپنی عادت سے مجبور ہوگیا ہے۔ میں ابھی تک ان انسانی ہیولوں کو

دیکھ رہا ہوں کہ اچانک ایک زوردار دھماکہ ہوجاتا ہے جیسے ایک زبردست زلزلہ آیا ہو، جیسے زمین کے سینے سے انگاروں میں لپٹی ہوئی ایک چیخ نکلی ہو، جیسے بچوں کی موت پر ایک ماں نے دلدوز آہ کی ہو۔ میں نے صحرا کو دیکھا جس کے سینے سے کالا سیاہ دھواں اٹھنے لگا اور فضا میں اس طرح پھیلنے لگا کہ چمکتا ہوا سورج اندھیرے میں ڈوبنے لگا اور سیاہ کالی رات تیزی سے پھیلنے لگی۔

میں اس سیاہ دھویں کو دیکھ کر پلک جھپکانا بھول گیا۔ ایک ساعت، ایک بہت لمبی ساعت کے بعد میں نے آنکھیں جھپکائیں، گرد وغبار دھواں اسی طرح اُسی طرح سورج پر سایہ کیے ہوئے تھے۔ میں اِس گرد وغبار کو دیکھتے ہوئے محسوس کر رہا تھا جیسے اس غبار میں دو لکیریں دکھائی دے رہی ہوں۔ یہ دونوں لکیریں متوازی اور عمودی نظر آ رہی تھیں۔ جیسے کسی خاص دن کا یا کسی خاص تاریخ کا نشان ظاہر کر رہے ہوں۔

صحرا سے پلٹ کر میں نے اُس اونچے پہاڑ کی جانب دیکھا جو شانِ بے نیازی سے سر اُونچا کیے کھڑا تھا۔ یہ اونچا پہاڑ یوں لگ رہا تھا جیسے بنی آدم کی فطرت، عادت اور عمل سے بے خبر اور لاتعلق ہو۔ میرے دل میں ایک حسرت، ایک خواہش انگڑائی لینے لگی اور میں سوچ رہا تھا کہ۔ مگر ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ پہاڑ کے دامن میں مجھے چند آدمی نظر آئے......"یا اللہ، خیر، یہاں پر بھی......" میں نے ذہن میں آئے ہوئے خیال کو زبردستی روک دیا اور اُن لوگوں کو حیرت اور تعجب سے دیکھنے لگا جن کے چہروں سے جذبات کی آگ کے شعلے اٹھ رہے تھے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اُن کے گرد انتقام کی آگ نے گھیرا ڈال دیا ہو۔

اُونچا پہاڑ خاموش، چپ، لاتعلق کھڑا تھا۔ اس سیاہ، کالے، خشک، خاموش اور بے نیاز پہاڑ کو بھی قدرت نے ایک خوبصورتی عطا کی تھی، مگر شاید......

اچانک پہاڑ کے وجود پر زردی سی چھا گئی اور پلک جھپکنے میں پہاڑ کی دامن سے چوٹی تک پہنچ گئی۔ ذرا سی دیر میں وہ سیاہ پہاڑ ایسا زرد نظر آنے لگا جیسے اپنی فطرت کی موت دیکھ چکا ہو۔ پہاڑ کے زرد رنگ پر ابھی چند لمحے بھی نہ گزرے تھے کہ اُن پر ایک دوسرا رنگ چڑھ گیا۔ خاک اور راکھ جیسا رنگ!

پہاڑ کے رنگ دیکھتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ وسیع صحرا کی طرح پہاڑ کے اندر بھی



ایک ایسا دھماکہ ہوا ہے جس سے اس اونچے پہاڑ کا دِل ریزہ ریزہ ہوگیا ہو اور پہاڑ کا پہاڑ جیسا وجود راکھ بن گیا ہو۔ شاید اب پہاڑ کا وجود محض راکھ کا ایک ڈھیر ہی بن گیا ہو۔ راکھ کا ایک ڈھیر! جو اگر تیز آندھی آئی تو یہ راکھ کا ڈھیر روئی کے گالوں کی طرح اِدھر اُدھر اڑا دے گا......

پہاڑ کے سینے اور چوٹی سے بھی صحرا کی طرح نیلا، سیاہ دھواں آسمان کی طرف یوں اٹھا جیسے اس پہاڑ کے دِل سے ایک آہ نکلی ہو، جیسے اس خاموش، لاتعلق اور بے نیاز پہاڑ نے بھی انسان کی وحشت اور حیوانیت پر ماتم کیا ہو۔

پہاڑ کے رنگ بدلنے اور نیلا، سیاہ دھواں اٹھنے پر پہاڑ کے دامن کے قریب سرنگ کے کنارے سے خوشی کا ایک شور اٹھا اور زور زور سے تالیاں بجنے لگیں اور کچھ اس طرح کی آوازیں آنے لگیں جیسے انسان نے انسان کی کھوئی ہوئی عظمت جیت لی ہو۔ جیسے انسان نے حیوانیت پر قابو پالیا ہو۔

پہاڑ کے دامن میں جمع لوگوں کے چہروں پر جذباتی تناؤ کے ساتھ اب کچھ سکون اور اطمینان کی علامات بھی ظاہر ہو رہی تھیں۔ وہ تالیاں بھی بجا رہے تھے، نعرے بھی لگا رہے تھے اور میری طرف دوڑے بھی چلے آ رہے تھے اور صحرائی لوگوں کی طرح مجھے دور ہی سے مبارکباد دے رہے تھے اور یوں ہاتھ ہلا رہے تھے جیسے مجھ سے کہہ رہے ہوں" مبارک ہو! مبارک ہو۔ ہم نے تمہاری حفاظت کا مکمل بندوبست کر دیا۔ اب تیری طرف کوئی ٹیڑھی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکے گا۔ اب کسی غنیم کا ہاتھ تیری جانب نہیں اٹھ سکے گا۔ اب تم......"

دوسری طرف صحرا کے لوگ بھی میری طرف دوڑے چلے آ رہے تھے اور مجھے مبارک دے رہے تھے اور میری حفاظت کی تسلیاں دے رہے تھے۔

میں خاردار تار پر پڑا ہوں اور اس تار کے تیز نوکیلے کانٹے میری کمر سے سیدھے نکلے ہیں اور میرے سینے میں نیزوں کی طرح کھڑے ہیں۔ میرے وجود سے بوند بوند خون ٹپک رہا ہے اور میں کمزور سی فریاد کر رہا ہوں۔ میری دونوں طرف کے زخم پھٹ گئے ہیں اور صحرا اور پہاڑ سے اڑنے والے گرد کے ذرے نمک بن کر میرے زخموں پر گر رہے ہیں اور میرا چہرا اسی گرم غبار کی تپش سے پھٹتا جا رہا ہے۔ میرے وجود پر دونوں طرف سے دوزخی انگارے برس

رہے ہیں اور میں بڑی بے بسی سے خلا میں تک رہا ہوں۔ مجھے وسیع خلا میں گرد و غبار کے درمیان دو ہندسے نظر آتے ہیں۔ میں ان ہندسوں کو بڑے غور سے دیکھنے لگتا ہوں۔ ہندسے آہستہ آہستہ واضح دکھائی دے رہے ہیں۔ ایک طرف ہندسہ گیارہ کا واضح نشان بتا رہا ہے اور دوسری طرف کا ہندسہ اٹھائیس کی علامت بن گیا ہے۔ اور میں ان گیارہ اور اٹھائیس کے ہندسوں کے درمیان زخموں سے چور چور پڑا ہوں۔

(پشتو سے)

گوہر ملک
ترجمہ
مجید زہیر بادینی

# اور بلوچ نے مجھے دھکا دیا

ہماری گاڑی سرسبز وشاداب باغات اور سبزہ زاروں کے بیچ صاف ستھری اور کشادہ شاہراہ پر دوڑ رہی تھی۔ میں نے ڈرائیور سے پوچھا" یہ کون سا علاقہ ہے؟"

"چاغی کا علاقہ" ڈرائیور نے جواب دیا۔

"کون سا؟ یہ ہمارا اور آپ کا بے آب وگیاہ ریگستانی چاغی ہے؟"

اس نے کہا" ہاں! آخر چاغی تو بڑا چاغی ہے، جو لگنگور سے لے کر افغانستان اور ایران کی سرحدوں تک پھیلا ہوا ہے۔"

"یہ اس کا کون سا علاقہ ہے؟" میں نے پھر پوچھا۔

"تمام چاغی اسی طرح سرسبز اور آباد ہے۔" ڈرائیور نے جواب دیا۔

"یہ خدا کی کیسی مہربانی ہوئی؟ کب ہوئی؟"

ڈرائیور نے ہنس کر کہا،" ماسی، آپ کہاں رہی ہیں؟ میرے خیال میں آپ حضرت نوحؑ کی دادی کی طرح خواب میں رہی ہیں، جو دنیا کے حالات سے بے خبر ہیں۔ یہ سب ایٹم کی کرامات ہیں"۔

"اچھا!!!" میں حیران ہوئی۔" ہم نے سنا اور پڑھا ہے کہ ایٹم بری چیز ہوتی ہے۔ اس نے جاپان کے ہیروشیما اور ناگاسا کی نامی شہروں کو ایک لمحے میں تباہ برباد کر دیا۔"

ڈرائیور خاموش رہا، گاڑی آگے چلتی رہی۔ دالبندین، نوکنڈی، سارا علاقہ پتھریلا اور

ریگستانی تھا۔ پینے کے لیے پانی ٹینکروں میں احمد وال سے آتا تھا۔ لوگ پانی بھی پیسوں سے خریدتے تھے۔ غریب بچوں کے ہاتھوں میں ڈبے ہوتے جو ٹینکروں سے ٹپکنے والی بوند کو بھی نہ چھوڑتے۔ نوکنڈی میں جب ہوا چلتی تھی تو پتھر کی چھوٹی چھوٹی کنکریاں تیر کی طرح انسان کے چہرے پر لگتی تھیں۔ ضرب المثل ہے کہ نوکنڈی کی ہوا نے سواروں کے شلوار تک پھاڑ دیے ہیں اور انہیں گھوڑے سے اتار دیا ہے۔ ہاں! لیکن ماہرین ارضیات کہتے ہیں کہ زیرِ زمین معدنیات سے بھری پڑی ہے اسی لیے یہاں کچھ نہیں اگتا'' میں نے کہا۔

''لیکن اب دیکھو وہی ریتیلی اور پتھریلی زمین ہے'' ڈرائیور نے کہا۔

میں حیران تھی کہ جہاں تک نظر پڑتی، علاقہ سرسبز تھا۔ کشادہ شاہراہ پر گاڑی بالکل بغیر ہلے جا رہی تھی۔ پھل دار درختوں کے باغات تھے۔ سیب اور انگور سے لے کر آم، کیلا اور لیموں تک۔ بادام اور پستہ سے لے کر ناریل تک۔ ''ہر ملک کے، ہر قسم کے میوے ایک ہی مقام اور ایک ہی موسم میں؟''

پارکوں میں بچے کھیل رہے تھے اور بوڑھے خوش گپّی میں مشغول تھے۔ پھولوں کی خوشبو ہر جانب پھیلی ہوئی تھی۔

اسکول، کالج، ہسپتال اور کارخانوں کی بڑی بڑی عمارتیں تھیں جن کی اونچائی آسمان کو چھو رہی تھی۔ کارخانوں میں سنگ مرمر توڑنے، اور سونے اور چاندی کی کشید کی جاتی تھی۔ اسکولوں اور کالجوں میں لڑکے اور لڑکیاں تعلیم میں مشغول تھے لیکن ہسپتال خالی تھے۔ ڈرائیور نے مجھے بتایا کہ آسودگی کی وجہ سے کوئی بیمار نہیں ہوتا۔

''میں تم سے جو بھی پوچھتی ہوں تم کہتے ہو کہ ایٹم کی کرامات ہیں۔ موسم و ماحول کو ایٹم نے تبدیل کیا۔ یہ بڑی بڑی عمارتیں کیسے اتنی جلدی بن گئیں؟ حکومت کے کام تو بہت دیر لگاتے ہیں''۔

ڈرائیور ہنس کر کہنے لگا ''آپ بڑی سادہ ہیں۔ یہ سارے کارنامے قوم پرست اور وطن دوست وزیروں اور ممبروں کے ہیں۔ انہوں نے یہ سب اسلام آباد کی خوش گوار آب و ہوا میں تصورات کے کارخانوں میں بنائے اور ایٹمی کرنوں کی طاقت سے انہیں یہاں لا کر تعمیر کر گئے۔''



''اس تیزی سے؟'' میں نے کہا۔

''کھانے والے لوگوں کے لیے کیا ہے۔ تم جتنا کھاؤ گے اتنی ہی تمہاری طاقت زیادہ ہوگی، تم اتنا بہتر کام کرسکو گے۔ پرانے لوگوں نے کہا ہے 'کھانا کرتا ہے گردن موٹی'۔ اسی کھانے کی طاقت ہے جو یہ دیکھ رہی ہو۔ اب کیا سردار اور کیا نواب کیا ممبر اور کیا وزیر کیا خان اور کیا ملک، ہر ایک اسی کوشش میں لگا ہے کہ کھائے اور طاقت حاصل کرے تاکہ بلوچستان کے عوام کے لیے بہتر کام کرسکے'' ڈرائیور نے کہا۔ گاڑی کشادہ شاہراہ پر جا رہی تھی۔ پانی کے چشمے بہہ رہے تھے۔ جہاں تک نظر جاتی، فصلیں تھیں، گندم، جو، جوار اور چاول سے لے کر تربوز اور خربوزہ تک۔ کوئی فصل ایسی نہ تھی جو وہاں نہ تھی۔

''کیسے!!''

''یہ کیسے کیوں؟'' ڈرائیور مجھ پر غصہ ہونے لگا۔ ''تم اندھی ہو چکی ہو۔ روزانہ اخبارات میں نہیں پڑھتیں کہ ضلع چاغی میں زرعی انقلاب لایا جائے گا؟ زرعی انقلاب اسی کو کہتے ہیں۔''

''مجھے خدا اندھا نہ کرے، اندھے ہوں میرے ملک کے دشمن اور بدخواہ'' بہت دیر تک میں نے ڈرائیور سے بات چیت نہیں کی۔ مگر پھر برداشت نہ کرسکی۔ میں نے پھر پوچھا ''یہ پانی کہاں آتا ہے؟''

ڈرائیور نے آنکھیں نکال کر میری طرف دیکھا اور کہا، ''راسکوہ سے۔''

''راسکوہ جل کر راکھ ہو گیا'' میں نے کہا۔

ڈرائیور کچھ ہل کر خود کو سیٹ پر برابر کرتے ہوئے کہنے لگا ''راسکوہ کیا کوہ طور ہے، جو جل جائے گا۔ اور کالا پڑ جائے گا؟ راسکوہ چاند اور سورج کی طرح روشن ہو چکا ہے۔ اب راسکوہ سے میٹھے پانی کے چشمے بہہ رہے ہیں۔ وہاں فیکٹریاں بنائی گئی ہیں۔ اور وہاں اس پانی کو بوتلوں میں بند کر کے دنیا کے ہر کونے میں فروخت کیا جاتا ہے۔ جو بھی اس پانی کو پیئے وہ کبھی بیمار نہیں ہوتا۔ وزیراعظم صاحب اس پانی کو بطور تحفہ امریکی صدر کے لیے لے جا چکے ہیں۔ کہتے ہیں کہ صدر کلنٹن اس سے بہت خوش ہوئے اور ہمارے حکمران کے سارے قرضے معاف کر دیے۔''

''راسکوہ اور خاران کے دیہاتوں کا پانی اور فصلیں کیسی ہیں؟''

''کیا بات ہے جی۔ وہاں کا انگور، ماش اور پیاز بک رہا ہے۔ ایک نہر جو راسکوہ سے نکلتی ہے سارے خاران کو آباد کرتی ہوئی جاتی ہے۔ اب وہ خاران نہیں ہی جو کہتے تھے کہ ''خاران جائے خوران۔ دست ئے گوں داران ۔ چم ئے گوں استاراں'' اب بنگلے اور محلات دیکھو گی تو حیران رہ جاؤ گی''

''جہنم میں جائے راسکوہ جو جل گیا۔ اور اچھے کام تو بہت سے ہوئے۔''

ڈرائیور نے میری طرف غصے بھری نظروں سے دیکھا لیکن کچھ نہیں کہا۔

گاڑی میں شاید اور لوگ بھی سوار تھے۔ لیکن میری طرح کوئی پوچھ گچھ نہیں کر رہا تھا۔

''مجھ پر غصہ مت کرو۔ میں تم سے ایک اور سوال پوچھنا چاہتی ہوں۔'' ڈرائیور کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔'' غوری نامی میزائل مکران کے سمندر میں پھینکا گیا تھا۔ کیا اس نے بھی اسی طرح کی آبادی کی ہے یا نہیں؟''

وہ خوش ہو گیا ''ہاں۔ وہ بھی زبردست ہوا۔ مکران اب سمندر کی طرح دور نہیں۔ سمندر کی مچھلیاں تڑپ تڑپ کر پانی کی سطح پر آ رہی ہیں کہ آؤ ہمیں پکڑو۔ مقامی ماہی گیر مچھلیاں پکڑنے اور بیچنے سے تھک چکے ہیں۔ اور اب انہوں نے امریکیوں سے کہا ہے کہ وہ چارے کے بغیر آئیں اور اپنے لیے مچھلیاں پکڑیں اور لے جائیں کیونکہ ان کے ملک میں مچھلیاں نہیں ہیں۔ میرانی ڈیم کو دیکھنا ایسا ڈیم ہے کہ اس کے سامنے تربیلا کی کیا مجال۔ یہاں سے بھی زیادہ سرسبز اور شاداب ہے۔ فکر نہ کرو ماسی! ایک دن تمہیں بھی مکران کی سیر کرانے لے جاؤں گا۔''

''کیچ اور شہرک کے دیکھنے کو میرا جی بہت چاہ رہا ہے۔ وہ ماں کی سرزمین ہے۔ لیکن اب میری ضعیف ہڈیاں کہاں گاڑی کے جھٹکوں کو برداشت کر سکتی ہیں۔''

ڈرائیور نے رحم بھری نظروں سے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا '' ارے بے چاری، مکران کو تو اب ریل گاڑی جاتی ہے''۔

''اچھا!'' میں حیران ہوئی اور خوشی سے چلاّ اٹھی۔ تمام سواروں نے میری جانب دیکھا کہ اسے کیا ہو گیا جو پاگل ہو گئی۔

''اپنے بچپن میں جب میں مکران گئی تب راستے میں پہاڑوں پر سفید نشانات دیکھ کر میں



نے اپنے والد سے پوچھا تھا کہ ابا جان، پہاڑوں پر یہ کیسے نشانات ہیں۔ تو انہوں نے جواب دیا تھا، انگریز یہاں سے ریل گاڑی کی لائن کو پسنی تک لے جانا چاہتے ہیں۔ پھر پاکستان بنا۔ اب ہم اپنے حاکم خود ہیں۔

''ہمیں کس کی حاجت ہے، اب ہم خود اپنے حاکم ہیں''۔ ڈرائیور گانے لگا۔

''خود مختاری اسی کو کہتے ہیں۔ ہمارے لیڈر کس طرح عوام کی خود مختاری، آسودگی اور ترقی کے لیے کام کر رہے ہیں۔ کیسی کیسی گاڑیوں میں سوار ہیں''۔

کیسے کیسے محلات میں رہتے ہیں''۔ ڈرائیور نے خوشی اور فخر سے کہا۔

''کاش وہ پرانے لیڈر زندہ ہوتے اور نئے لیڈروں کے کارناموں کو دیکھ لیتے تو کتنے خوش ہوتے کہ بلوچستان کس طرح آباد ہے'' میں نے کہا۔

''ہاں اچھا ہوا کہ وہ لیڈر مر گئے۔ جیل میں بیٹھے اور سرکار کی مفت کی روٹی کھانے کے علاوہ انہیں خاک لیڈری آتی تھی۔ عوام کو تو چھوڑو۔ ان کے اپنے بچے بھوک اور فاقے میں تھے۔ ان میں سے ایک کو میں جانتا ہوں۔ آؤ تمہیں اس کا گھر دکھاؤں'' اس نے کہا اور گاڑی سبزہ زار سے موڑتے ہوئے ایک گرتی ہوئی دیوار اور کھنڈر جیسے گھر کے سامنے روک دی اور کہا، ''اس گھر کو دیکھتی ہو۔ ان میں سے ایک لیڈر مزاج کے اعتبار سے شاعر تھا۔ یہ اس کا گھر ہے''۔

گھر کا آدھا حصہ زمین کے اندر اور آدھا باہر تھا۔ دروازے اور کھڑکیاں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ تین کمرے تھے اور سامنے برآمدہ۔ برآمدے میں بھڑوں کا شور تھا۔ جو کسی کو قریب آنے نہیں دیتی تھیں۔ اردگرد کچھ اور گھر بھی تھے لیکن ان کی حالت اس سے بہتر تھی۔

''کیا اس کے بچے ہیں اور اولاد ہے؟''

ماتھے پر شکنیں ڈالتے ہوئے تلخ لہجے میں اس نے کہا'' مجھے کیا معلوم؟''

''اس نے کہا تھا کہ بلوچ میرے بچے ہیں، بلوچ میری اولاد ہیں۔''

''مگر میں کیوں اس کی اولاد بنوں؟ اس نے میرے لیے کون سا اچھا کام کیا ہے؟ بلکہ مجھے اور بھی بدنام کیا ہے کہ بلوچ تیر ہے۔ بلوچ زہر ہے۔ بلوچ آسمانی بجلی ہے۔ بلوچ آگ ہے۔ بلوچ طوفان ہے اور جو بھی بلوچوں کی سرحدوں کو بری نظر سے دیکھے اس کی آنکھیں

چھوڑ دوں گا۔ یوں نہیں کہا کہ بلوچ طوطی ہے، بلوچ بھرا جام ہے۔ بلوچ سنگ مرمر کا محل ہے۔ بلوچ فائیو اسٹار ہوٹل میں سینگار پلنگ ہے۔ طلائی تاج کا بکنے والا ''دُر'' ہے۔

''تم بلوچ ہو؟''

''ہاں میں بلوچ ہوں'' اس نے غصے سے جواب دیا۔ میں نے آہستہ سے گاڑی کا دروازہ کھول کر کہا ''مجھے یہیں اتار دو۔'' اور آہستہ آہستہ اپنی پیر گاڑی سے نیچے لٹکا دیے۔

''ماسی! تم پاگل ہو۔ یہاں کیوں اترتی ہو؟''۔

''میں ان کھنڈرات کے مالک کی اولاد ہوں۔ یہ میرا گھر اور بسیرا ہے۔''

میرا یہ کہنا تھا کہ ڈرائیور نے مجھے دونوں ہاتھوں سے یوں دھکا دیا کہ میرا منہ مٹی سے بھر گیا اور میں چلا اٹھی۔

''ہائے کہ میں ٹوٹ گئی'' اور خواب سے جاگ گئی۔

میرے ہائے کہنے سے میری بھانجی حوراں خواب سے چونک پڑی اور پوچھنے لگی۔ ''ماسی آپ کو کیا ہو گیا؟''۔

''سو جاؤ! مجھے کچھ نہیں ہوا۔ میں نے ایک تلخ اور شیریں خواب دیکھا تھا۔''

(بلوچی سے)

محسن حامد

ترجمہ

آصف فرخی

# پروانے کا دھواں

(۱)

میں بستر میں لیٹا ہوا ہوں، میرے منہ میں پیناڈول کا ذائقہ ہے اور میں کوشش کر رہا ہوں کہ اپنی جگہ سے بالکل نہ حرکت کروں کہ اتنے میں اوزی اندر آتا ہے اور اس سے پہلے کہ میں اس کی غیر متوقع آمد پر اپنی حیرت سے باہر آسکوں، وہ مجھے بتاتا ہے کہ پڑوسی ''نیوکلیئر'' ہو گئے۔

''SHIT'' میں کہتا ہوں۔

''تم ابھی تک بستر میں کیوں ہو؟''

''میری کمر میں چک آ گئی ہے۔''

''بری طرح؟''

میں سر ہلاتا ہوں۔

''افسوس ہوا'' وہ کہتا ہے اور بیٹھ جاتا ہے۔ فوم کا گدا اس کے بوجھ تلے تن جاتا ہے اور میری کمر کو کھینچنے لگتا ہے جیسے کوئی اذیت رساں اپنی گرفت مضبوط کر رہا ہو۔

---

پاکستانی نژاد مصنف محسن حامد کا انگریزی ناول ''MOTH SMOKE'' دسمبر ۱۹۹۹ء میں نیویارک سے شائع ہوا۔ نڈائن گورڈیمر اور دوسرے مبصرین نے اس کی اشاعت کو ایک اہم ادبی واقعہ قرار دیا۔ یہاں اس ناول کے ان اقتباسات کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے جو اس مجموعے کے موضوع سے متعلق ہیں۔

"تمھیں کیسے پتا؟"

"ہر ایک کو پتا ہے۔ باہر حشر برپا ہے۔ مجھے یہاں آنے کے لیے جلوس کے بیچ میں سے گاڑی نکال کر لانا پڑی۔"

"تو ہوا کیا؟"

"انہوں نے تین دھماکے کیے۔ سرحد سے کوئی سو کلومیٹر دور۔"

"کتنی علامتی بات ہے!"

اوزی نے سر ہلا دیا۔ مگر وہ ہنس رہا ہے۔ اور کمر کو خاموشی کے ساتھ چیرتے ہوئے جھٹکے کے باوجود، میں نے اندازہ لگایا کہ میں بھی ہنس رہا ہوں۔

"ہم مسکرا کیوں رہے ہیں؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"مجھے معلوم نہیں۔ بڑی دہشت ناک بات ہے۔"

"تم سمجھ لو کہ جس جگہ سب سے پہلے ایٹم بم ماریں گے، وہ لاہور ہو گی۔"

"اسلام آباد۔"

"نہیں، لاہور۔ اگر انہوں نے اسلام آباد پر ایٹم بم مارا تو پھر کوئی اسے روک نہیں سکے گا۔"

"کسے روک نہیں سکے گا؟"

"ہمیں۔ جواب میں ان پر بم مارنے سے۔"

"ہم بھی ان پر بم ماریں گے اگر انہوں نے لاہور پر بم مارا۔"

"نہیں، ہم ان پر بم ماریں گے اس سے پہلے کہ وہ ہم پر بم مار سکیں۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

میں کوشش کرتا ہوں کہ ہنسنا بند کر دوں مگر ہنسی روک نہیں سکتا۔ "ہم پہلے ان پر بم مار دیں گے۔ وہ زیادہ بڑے ہیں۔ انہیں ضرورت نہیں ہے ہم پر بم مارنے کی۔ کوئی نہ کوئی جھڑپ بڑھ کر قابو سے باہر ہو جائے گی، وہ فوجیں لیے ہماری طرف بڑھتے چلے آئیں گے اور پھر ہم ان پر ایٹم بم مار دیں گے۔ بس ایک بم۔ اپنے دفاع کے لیے۔"

"اور پھر وہ لاہور پر ایٹم بم ماریں گے؟"



"اور کہاں مار سکتے ہیں؟"

"کراچی کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"بہت زیادہ اہم ہے۔ اگر انہوں نے کراچی پر بم مارا تو ہم ان کے دو چار شہروں کا صفایا کر دیں گے۔"

"پشاور؟"

"مذاق مت کرو۔"

"شاید فیصل آباد؟"

"یہ سچ ہے، ہو سکتا ہے وہ فیصل آباد پر بم مار دیں۔"

وہ میری طرف دیکھتا ہے اور ہنسنے لگتا ہے۔ "بے چارہ فیصل آباد۔"

میں ہنسی روکنے کی کوشش کرتا ہوں مگر میں خود بھی ہنس رہا ہوں، درد کو سنبھالنے کے لیے پسلیاں پکڑے ہوئے ہوں، ہر قہقہے کا گلا گھونٹ کر اسے کھانسی میں بدل دیتا ہوں جو میری کمر سے یوں پھسل جاتی ہے جیسے چپٹا پتھر جھیل کی سطح کو کاٹتا چلا جائے......

میں سگریٹ ختم کر کے اسے میز پر رگڑ دیتا ہوں۔ جلے ہوئے داغوں کی کہکشاں میں ایک اور داغ۔

اوزی اپنی ٹھوڑی کی نوک کو چٹکی سے دبا رہا ہے جیسے اسے کوئی ایک مقام مل گیا ہو جو صبح داڑھی مونڈتے ہوئے چھوٹ گیا ہو۔

"تم سمجھو" میں اس کا دِل بہلانے کے لیے کہتا ہوں، "وہ لوگ واقعی لاہور پر ایٹم بم مار سکتے ہیں۔"

وہ اپنی ٹھوڑی سے کھیلنا بند کر دیتا ہے۔ "ہم بھی دھماکا کریں گے۔"

"کب؟"

"کون جانے۔ امید تو یہ ہے کہ بس جلدی کر لیں۔"

"کیوں؟ ہمیں پتا تو ہے کہ ہمارے پاس بم ہے۔"

''ہم چاہتے ہیں کہ انہیں پتا چل جائے۔''

''نہیں پتا ہے۔'' میں رواروی میں کہہ دیتا ہوں۔ جتنی رواروی سے کہہ سکتا ہوں۔ اس لیے کہ اوزی کے اور میرے درمیان ایک ان کہی بات ہے، ان کہی اس لیے کہ کہی نہیں جاسکتی، ایک امکان، ایک شبہ۔ اگر ہمارے بم نے کام نہ کیا تو؟

اوزی کو پسینہ آرہا ہے۔ اس کا چہرہ چمک رہا ہے اور وہ چار انگلیوں کو موڑ کر ان کی نوک سے پسینہ پونچھ لیتا ہے۔ ''کیسی منحوس گرمی ہے۔ بجلی کتنی دیر سے گئی ہوئی ہے؟''

''دو گھنٹے ہوئے ہیں'' میں جھوٹ بول دیتا ہوں۔

''لوڈشیڈنگ ہے یا خرابی؟''

میں کندھے اُچکا دیتا ہوں۔

''تمھیں جنریٹر کی ضرورت ہے'' وہ مجھے بتاتا ہے۔

''ارے اوزی۔ تم سے رہا نہیں جاتا، ہیں نا؟'' تمھیں پتہ ہے کہ میں جنریٹر نہیں خرید سکتا۔ ''واقعی؟''

''ظاہر ہے۔ تمہارا اس کے بغیر گزارا کیسے ہوتا ہے؟''

''زیادہ تر لوگوں کا ہوجاتا ہے۔''

''میں سوچ رہا ہوں کہ شاید ہمارے پاس وہ پرانے گھر والا چھوٹا جنریٹر پڑا ہو۔ اگر ہوا تو تم ہی لے لینا۔''

''شکریہ، میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔'' مجھے تمہارے پرانے جنریٹر کی ضرورت نہیں اور میرے پاس اس کو چلانے کے لیے ایندھن کے پیسے بھی نہیں ہیں۔

''مجھے حیرت ہے کہ میں نے اب تک گرمی پر غور نہیں کیا تھا۔''

''بس جوہری گرما گرمی جیسی کوئی چیز نہیں کہ اس کے بعد لوگ اپنے مسائل بھول جائیں۔''

وہ آنکھ مارتا ہے۔ ''اور اسی بات پر میں رخصت ہوجاؤں۔ ہم میں سے کچھ لوگوں کو کام پر بھی جانا پڑتا ہے۔''



وہ اس طرح کہہ رہا ہے جیسے مجھے بے روزگار رہنا پسند ہے۔

میں اپنے آپ کو غصے میں آتے ہوئے محسوس کر رہا ہوں اور ہم دونوں کے درمیان کا رابطہ خاموشی سے ٹوٹ جاتا ہے۔ ''اگر انھوں نے لاہور پر بم مار دیا تو پھر کوئی ضرورت نہیں'' میں زیرلب کہتا ہوں۔

وہ جھکتا ہے اور سگریٹ کی ڈبیا میرے بستر کے ساتھ والی میز پر رکھ دیتا ہے۔ مجھے اب اس کی خواہش نہیں۔ لیکن اس کے سارے تحفوں کی طرح میں پھر بھی لے لیتا ہوں۔

(۲)

اگلی صبح معمول جتنی گرمی نہیں ہے، اس لیے میں بستر ہی میں ہوں کہ اتنے میں مانوچی میرا دروازہ پیٹنے چلا آتا ہے۔

''کیا بات ہے؟'' میں چیختا ہوں۔

''صاب، آندھی آرہی ہے،'' وہ کہتا ہے۔

میں اٹھ جاتا ہوں اور پردے کھینچ دیتا ہوں۔ باہر اندھیرا ہے جیسے شام گئے ہوتا ہے۔

''ساری کھڑکیاں بند کردو'' میں اس سے کہتا ہوں۔ ''میں باہر جارہا ہوں۔''

لاہور کو آندھی کی ضرورت بھی تھی، خاص طور پر اگر اس کے ساتھ بارش کا چھینٹا پڑجائے۔ چاروں طرف خاک اڑ رہی ہے اور اس سال اتنے پہلے سے اس قدر نحوست زدہ گرمی ہونے لگی ہے۔

میں گھر کے سامنے والے برگد کی طرف جاتا ہوں۔ میں ایڑیوں کے بل چل رہا ہوں کیونکہ گھاس کے اس مردہ قطعے میں لکڑیاں اور پتھر میرے پاؤں میں چبھ رہے ہیں۔ ساکت ہوا میں بسی ہوئی خاک کی بو مجھے اپنے بچپن کے طوفانوں کی یاد دلاتی ہے جب یہ لان سرسبز اور شاداب تھا اور میں اس برگد کے پیچھے چھپ جاتا تھا کیونکہ میری امی مجھ سے اندر آنے کے لیے کہتی تھیں، وہاں چھپا رہتا یہاں تک کہ طوفان امڈ آتا کیونکہ برگد مجھے تیز ہوا اور اس کے ساتھ اُڑتی ہوئی مٹی سے بچائے رکھتا۔ یہاں تک کہ بارش ہونے لگتی جو پھر ایسا لگتا کہ ہر چیز کو ٹھنڈا اور صاف چھوڑ جاتی، کئی دنوں کے لیے۔

یہ لان اس کے بعد سے مر چکا تھا مگر برگد ابھی تک زندہ ہے، اپنے ہی چاروں طرف لوہے کے تاروں کی طرح لپٹا ہوا۔ اس کی شاخیں جھکی آتی ہیں، ان کا سائبان جڑوں پر سایہ کیے رہتا ہے جو زمین کو تھام لیتی ہیں، مٹی کو اکھاڑ ڈالتی ہیں، ہر سمت ٹٹولتی بڑھتی رہتی ہیں۔ یہ درخت پرانا ہے، اس گھر سے اس چار دیواری سے بھی پرانا جو یوں لگتا ہے کہ بنائی صرف اس لیے گئی تھی کہ اسے اندر ہی روک لے۔ اور درخت اب اس کے ساتھ زور لگا رہا ہے۔

کسی نامعلوم وجہ سے میں نے اپنے آپ کو وہی کرتے ہوئے پایا جو بچپن میں کیا کرتا تھا، حالانکہ اب تو کوئی ایسا نہیں ہے جس سے چھپا جائے۔ میں نے اس تناؤ کو اپنے چاروں طرف بڑھتے ہوئے پایا، اپنے بازوؤں کے بالوں اور کھال کے درمیان محسوس کیا، اپنی گدی پر اور کندھے کی ابھری ہوئی ہڈی پر محسوس کیا۔

سورج کو ملگجے آسمان نے بالکل ہی چھپا کر رکھ دیا ہے۔ میں آنکھیں بند کر لیتا ہوں جب ہوا تیز ہونے لگتی ہے، درخت کی شاخوں میں سے چابک برساتی ہوئی اور چنگھاڑ کی طرح بلند ہوتی ہوئی خاک میرے اوپر سے گزر جاتی ہے، نرم خراش ڈالتی ہوئی۔ آندھی کا زور بڑھ جاتا ہے، مجھے ایک قدم پیچھے دھکیل دیتی ہے، میرے کانوں میں چیختی ہے، میں اپنی جگہ قائم رہتا ہوں تو میرے دونوں کھلے بازو جھکا دیتی ہے۔ وہ مجھ پر خاک اچھالتی ہے، کھڑکھڑاتے ہوئے پتے میری طرف بھیجتی ہے مگر درخت ان کا زور توڑ دیتا ہے اور میں بس اپنی کھال پر ان کا مختصر لمس محسوس کرتا ہوں۔

بارش کی بوندیں میرے پپوٹوں پر پڑ کر ٹوٹنے لگتی ہیں اور میرے کانوں پر، میرے گلے پر، میرے پیٹ پر۔ آندھی اب غرّا رہی ہے، آمادہ بہ تشدد ہے اور پوری طرح زندہ، اور اس انتظار میں کہ یہ تھم جائے، میں اپنی آنکھیں بند کیے رکھتے ہوں۔

اچانک کوئی چیز میرے سینے سے ٹکرا جاتی ہے۔ میری آنکھیں کھٹ سے کھل جاتی ہیں اور خاک مجھے فوراً ہی اندھا کر دیتی ہے۔ میں مڑ کر اپنی پیٹھ آندھی کی طرف کر لیتا ہوں، جلتی ہوئی آنکھوں میں مٹھیاں رگڑنے لگتا ہوں۔ میں اپنا توازن برقرار رکھنے کے لیے جدوجہد کرتا ہوں، ہانپ جاتا ہوں کہ طوفان نے مجھے مغلوب کر دیا ہے۔



آندھی اچانک تھم جاتی ہے، زیادہ بارش برسائے بغیر۔

میری آنکھیں بھیگ رہی ہیں اور انہیں کھول دیتا ہوں، پلکیں جھپکتے ہوئے کہ خاک باہر نکل آئے۔ میرے سینے پر چھوٹی سی خراش آئی ہے، غالباً برگد کی کسی ٹوٹی ہوئی ٹہنی کی وجہ سے۔ میرے چاروں طرف ہر چیز خاک آلودہ ہے اور پھوار کی وجہ سے بعض ٹکڑے نم ہیں۔ سورج زنگ آلودہ بادلوں کو جلا کر سوراخ کر رہا ہے۔

میں خاک سے اٹ گیا ہوں اور پھر دوبارہ گرمی ہوگئی ہے۔ برگد کی ٹہنیوں میں سے گزرتی ہوا، اس پیاسی دھرتی کی بو لیے ہوئے ہے جو دو گھونٹ پانی کے لیے بہت دیر سے انتظار کرتی رہی ہے۔ آنکھوں کے گوشے میں جمع خاک کو رگڑتے ہوئے اور سینے کی خراش کو مسلتے ہوئے، میں نہانے کے لیے اندر چلا جاتا ہوں۔

لوگ کہتے ہیں کہ ایٹمی دھماکوں نے فضا میں تاب کاری نہیں کی ہے۔ ان میں سے ہر ایک ایک وسیع ہچکی ہے جو تسکین نہ پا کر گھٹ کر رہ گئی۔

(۳)

ممتاز کے جانے کے ذرا دیر بعد جشن شروع ہوگیا۔ ہر ایک کو پتا کیسے چل جاتا ہے، یہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ سائیکل کی گھنٹیوں کی پُر جوش ٹرررنگ مجھے دروازے تک لے آئی کہ میں فتح کے اس جلوس کو دیکھ سکوں جو آدھے درجن مالیوں نے نکالا تھا، لمبی لمبی قینچیاں سہراب سائیکلوں کے پچھلے حصے پر باندھے ہوئے، فتح مندی کے عالم میں پیڈل چلاتے ہوئے، ڈگمگاتے ہوئے اور تالیاں بجاتے ہوئے، جس حد تک توازن اور ہمت اجازت دیں۔

پڑوس کے نوکروں کے ہاں سے مانوچی یہ خبر لے کر بھاگتا ہوا آتا ہے، اس کوشش کے مارے دوہرا ہوا جا رہا ہے۔

''یہ کیا تماشا ہے؟''

''ہم نے کر ڈالا'' وہ ہانپتا ہے۔

''کیا؟''

''ہم نے اپنے بم کا دھماکا کر لیا ہے۔''

میں نے کسی چیز کے ذریعے اپنی کمر کو سیدھا ہوتے ہوئے پایا، ایک عجیب جوش، فخر کی قوت جو آدمی کے اٹھنے بیٹھنے کے انداز بدل دے۔ مانوچی میری طرف دیکھتا ہے، اس کا چہرہ، پسینہ پسینہ اور میلا ہو رہا ہے اور وہ مسکرا رہا ہے۔ ہم پرانے ساتھیوں کی طرح ہاتھ ملاتے ہیں، دو جنگ آزما جو آخر کار گھر لوٹ آئے ہیں اور میں کچھ کہنے والا ہوں، خود کو شاباش دینے والی تقریر کے لیے تیار ہوں کہ ایک آواز میری اس بلند پروازی کے بہاؤ کو روک دیتی ہے۔

سڑک کے اگلے حصے سے کہیں سے ہم جشن کی بندوقوں کی پہلی آواز سنتے ہیں، کوئی سخت آتش گیر مادہ جسے آٹومیٹک پر رکھ دیا گیا ہے، گولیوں کو آسمان کی طرف خالی کیے جا رہا ہے اور میں اپنی ماں کے بارے میں سوچنے لگتا ہوں، خوبصورت، تنگ پیشانی والا چہرہ، گال کی ہڈیاں ابھری ہوئی اور گال پچکے ہوئے، چہرے پر دُرشتی اور سختی کا تاثر، جسے ان کی اداس آنکھوں اور مختصر سی مسکراہٹ نے نرما دیا ہے۔ زیور کا نشان بھی نہیں، کان جہاں سے چھدے تھے وہ سوراخ کب کے سکڑ گئے، بال جواب بھی کالے تھے، جوڑے میں بندھے ہوئے۔ وہ ہمیشہ کتنی کم عمر لگتی تھیں، جس سال ان کا انتقال ہوا اس سال بھی اتنی کم عمر لگتی تھیں کہ ان پر میری بہن کا دھوکا ہو سکتا تھا۔ مگر جس دن ان کو دفن کیا گیا ہے، اس دن نہیں: خون سے عاری، چہرے کے سارے رنگ نچڑ گئے تھے، پیلی جلد پر جھریاں اس طرح ابھر آئی تھیں جیسے مروڑے ہوئے کاغذ پر شکنیں۔

مانوچی نے ہوا میں انگلیاں اٹھائیں اور فی الفور بھنگڑا ڈالنے لگا۔ کلاشنکوف دوبارہ گولیاں اگلتی ہے۔ میں اندر کا رُخ کرتا ہوں۔

(۴)

مراد بادشاہ کے رکشا ڈپو کا دو مرتبہ چکر لگانا پڑا تب کہیں جا کر وہ ہاتھ لگا...... وہ ہاتھ ملانے کے بجائے کہنی میری طرف بڑھا دیتا ہے کیونکہ اس کے ہاتھ پر گریس لگی ہوئی ہے۔

''تم میرے ساتھ کھانا کھانے چلو گے؟'' وہ پوچھتا ہے۔ ''آج ہم خاص دعوت اُڑا رہے ہیں۔ لکشمی چوک سب سے اچھا ہے۔''

میں نے یہ طے تو نہیں کیا تھا مگر مفت کا کھانا پھر مفت کا کھانا ہے اور لکشمی پر میری جان بھی جاتی ہے۔ ''بہت شوق سے'' میں کہتا ہوں۔



بڑی دریا دلی کے ساتھ مراد بادشاہ کے برابر میرے لیے جگہ صاف کر دی جاتی ہے۔ میں بیٹھ جاتا ہوں، آستینیں چڑھا کر نان سنبھالتا ہوں اور کام سے لگ جاتا ہوں۔ میں بہت بھوکا ہوں اور جب کھانے کی نوبت آئے تو میں اپنی جگہ ڈٹ جاتا ہوں اور مراد بادشاہ کے ایک ایک نوالے کا مقابلہ کرتا ہوں یہاں تک کہ وہ اپنا پیٹ تھپتھپاتا ہے، زوردار ڈکار لیتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ وہ ٹھسا ٹھس ہو گیا۔

ایک لڑکا ''مکس'' چائے پینے لا کر دیتا ہے جس میں دودھ اور چینی وافر مقدار میں پڑا ہوا ہے اور مراد بادشاہ ایک نازک سی چسکی لیتا ہے، اس کے الٹے ہاتھ کی چھنگلی پیالی سے الگ اٹھی ہوئی ہے۔

سندھی ٹوپی پہنے ہوئے ایک ڈرائیور گوشت کی اس مچھلی کو پکڑ لیتا ہے جو اس کی کمر کے گرد پھیلی ہوئی ہے اور کہتا ہے ''میرا تو اب دھماکا ہونے والا ہے۔''

''میں نے کل رات ٹی وی پر دیکھا تھا'' ایک اور آدمی کہتا ہے جس کی ناک کی پھننگ پر پسینے کی بوند ٹپک پڑنے کو ہے۔ ''وہی دھماکا۔''

''کیسا تھا؟'' ایک مکینک پوچھتا ہے۔

''ایک پہاڑ کی تہہ میں کیا گیا تھا'' پسینہ بھری ناک والا سمجھاتا ہے۔ ''پہاڑ ایسے کانپا جیسے زلزلہ آ رہا ہو۔ خاک اڑ کر آسمان تک گئی۔ اور چٹان گہری سُرخ ہو گئی، جیسے خون کا رنگ ہوتا ہے۔''

''تمہیں کیا پتا؟'' سندھی ٹوپی نے پوچھا۔ ''تمہارے پاس تو خالی سیاہ اور سفید ٹی وی ہے۔''

''وہ بہت اچھا ہے۔ بس رنگ نظر آنے ہی کو ہوتے ہیں۔''

''بے وقوف۔ وہ سیاہ اور سفید ہے۔''

''نہیں، مگر کبھی کبھار آپ بتا سکتے ہیں کہ کون سے رنگ ہیں۔ میں قسم کھاتا ہوں۔''

''بکواس۔''

پسینہ بھری ناک بحث نہیں کرتا۔ ''دھماکا بڑا شان دار تھا'' وہ مکینک سے کہتا ہے۔

''کتنا شان دار ہو سکتا ہے؟'' مراد بادشاہ پوچھتا ہے۔ ''وہ تو زمین کی تہہ میں تھا۔''

"وہ کپکپاہٹ، خاک دھول۔ بہت اچھا تھا۔"

مراد بادشاہ زور سے ہوا خارج کرتا ہے۔ "یہ،لو۔ کپکپاہٹ۔ خاک دھول۔ یہ بھی بہت اچھی تھی؟"

سندھی ٹوپی چٹکی سے ناک بند کرلیتا ہے۔ "یہ تو بہت بری تھی، مراد بھائی۔"

"میری اس بری والی سے پٹرول کے دام نہیں بڑھیں گے۔ یہ ٹماٹر کو سو روپیہ کلو تک نہیں پہنچادے گی۔ مگر ہماری یہ ایٹمی پاد ضرور ایسا کرے گی۔"

"ٹماٹر دو سو روپے کے ہوجائیں" سندھی ٹوپی کہتا ہے۔ "مجھے ٹماٹروں سے یوں بھی نفرت ہے۔ اور اگر پٹرول کی قیمت دوگنی ہوگئی، تو کیا؟ ہم بھی دام بڑھا دیں گے۔ ہم نے پہلے بھی ایسا کیا ہے۔"

"یہ دام ادا کون کرے گا؟"

"ٹماٹر اگانے والے کسان، جن کو دو سو روپیہ فی کلو مل رہا ہے۔"

اس پر قہقہہ پڑتا ہے۔

"اچھی رہی، یار" پسینہ بھری ناک کہتا ہے۔

مراد بادشاہ سر ہلاتا ہے۔ "یہ ایٹمی دوڑ مذاق نہیں ہے۔ غریب لوگ مصیبت میں ہیں۔"

"ہم کو رہنے دو مصیبت میں" سندھی ٹوپی کہتا ہے اور باقی لوگوں سے سر کی تائیدی جنبش حاصل کرتا ہے۔

"عیسائیوں کے پاس بم ہے۔ یہودیوں کے پاس بم ہے۔ ہندوؤں کے پاس بم ہے۔"

"بدھ مت والوں کے پاس بم ہے" پسینہ بھری ناک دخل انداز ہوتا ہے۔

"ٹھیک" سندھی ٹوپی بات جاری رکھتا ہے۔ "ہر ایک کے پاس بم ہے۔ اور اب مسلمانوں کے پاس بھی بم ہے۔ ہم ہی کیوں بم کے بغیر رہیں؟"

"اور جب قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں، اسکول بند ہوجائیں، اسپتالوں میں دوانہ ہو، تب کیا ہوگا؟"



"تو پھر ہم پہلے سے دوگنا کام کریں گے اور آدھے پیٹ کھائیں گے۔"

"ہم گھاس کھائیں گے" پسینہ بھری ناک نے وزیراعظم کی ایک تقریر کا حوالہ دیا۔

"اور تم سمجھتے ہو کہ جو لوگ گھاس کھائیں گے وہ پھر بھی رکشا پر سواری کریں گے؟" مراد بادشاہ نے چڑ کر پوچھا۔

"کم از کم ہم زندہ تو رہیں گے" سندھی ٹوپی کہتا ہے۔

"زندہ تو ہم پھر بھی ہوتے۔ ساری دُنیا کو پتا تھا کہ ہمارے پاس ایٹم بم ہے۔"

"مجھے تو نہیں پتا تھا" پسینہ بھری ناک نے کہا۔

"ہاں، یہ کہنا ایک بات ہے کہ آپ کے پاس بم ہے اور پہاڑوں کو ہلاتے پھرنا اور بات ہے" سندھی ٹوپی نے کہا۔

مراد بادشاہ خرخراتا ہے۔ "پہاڑ ہلانا۔ ہم دیکھ لیں گے کہ پہاڑ ہلانے سے فرق کس کو پڑتا ہے جب ہم اس ڈپو کا کرایہ ادا نہیں کرسکیں گے اور ہمارے رکشے ٹوٹ جائیں گے اور لکشمی چوک میں کھانے کے لیے ایک ہی چیز ملے گی، اور وہ ہوگی اُبلی ہوئی پیاز۔"

"ہمیں اپنی حفاظت کرنا تھی۔"

"میری چھت میری حفاظت کرتی ہے" مراد بادشاہ کہتا ہے۔ "میرا بھرا ہوا پیٹ مجھے محفوظ رکھتا ہے۔ تم لڑکے بالے یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے بڑا کام دکھایا ہے۔ مگر تم دیکھ لوگے۔ آگے بڑا مشکل وقت آنے والا ہے۔"

سندھی ٹوپی اور پسینہ بھری ناک نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا۔ لیکن پھر کچھ اور کہا نہیں گیا۔ مکینک کھانا صاف کر دیتے ہیں اور رکشا چلانے والے اپنے اپنے رکشاؤں کا رُخ کرتے ہیں کہ رات کی دیہاڑی شروع کریں۔

مراد بادشاہ اور میں بیٹھے رہ جاتے ہیں۔

جب ہم اکیلے رہ جاتے ہیں تو میں اس سے کہتا ہوں کہ مجھے پانچ سو روپے کی ہیروئن چاہیے......

(انگریزی سے)

انتظار حسین

ترجمہ

مبین مرزا

# یہ خاکی اپنی فطرت میں

ایسے میں جب کہ سب لوگ مل کر بڑے زور شور سے اپنا ایٹمی ہیرو تلاش کر رہے ہیں، انور سجاد نے بھٹو کے بجائے منٹو کو عظمت کی اس مسند کا حق دار ٹھہرایا ہے۔ اس وقت سارا ملک ایٹم بم ہی کے موضوع کی لپیٹ میں ہے۔ چھ ایٹمی دھماکوں کی سبقت کے احساس کے ساتھ ہم اپنے ایٹمی ہیرو کے سر اس خوشی کا سہرا باندھنا چاہتے ہیں، لیکن سوال یہی تو ہے کہ ہیرو کسے قرار دیا جائے؟ ڈاکٹر عبدالقدیر کی خدمات اپنی جگہ، لیکن ہوا یہ کہ ان دھماکوں کے فوراً بعد ان کی برتری کو چیلنج کر دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بونے ایٹمی ہیروز کی ایک پوری کھیپ یکا یک سامنے آگئی۔

پاکستانی بھی ایسے گئے گزرے لوگ نہیں کہ ان باتوں میں آسانی سے آجائیں اور اصل قصے سے ان کا دھیان ہٹ جائے۔ اب وہ دراصل اس بڑے دماغ کی تلاش میں ہیں جس نے سب سے پہلے پاکستانی ایٹم بم کی بابت سوچا تھا۔ اس سلسلے میں صاف طور سے پہلی نظر ذوالفقار علی بھٹو ہی کے نام پر پڑتی ہے کہ جس نے روٹی، کپڑا اور مکان کے نعرے سے شروعات کی اور پھر آگے چل کر کہا تھا کہ اگر ایٹم بم حاصل کرنا ہے تو ہمیں گھاس کھانی ہوگی۔ لیکن انور سجاد نے اس سلسلے میں ہمارے سامنے ایک اور نام پیش کیا ہے، یہ نام ہے منٹو کا۔ انور سجاد کا کہنا ہے کہ پاکستان میں منٹو وہ پہلا آدمی تھا جس نے ایٹم بم حاصل کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔

انور سجاد نے یہ نکتہ اپنے اُس مضمون میں اٹھایا ہے جو لاہور کے ایک انگریزی روزنامے



کے زیراہتمام منعقد کیے گئے جلسے میں پڑھا گیا۔ اپنے اس خیال کی سند میں وہ منٹو کی ان افسانوی تحریروں کا حوالہ دیتے ہیں جو انہوں نے چچا سام کے نام خط کی صورت میں لکھی تھیں۔ یہ خط پچاس کی دہائی میں لکھے گئے تھے۔ انور سجاد کے بہ قول ان میں سے ایک خط میں جس پر ۱۵ر مارچ ۱۹۵۴ء کی تاریخ پڑی ہے، منٹو نے ایٹمی توانائی کے حصول کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ دیکھا جائے تو کہانی کار کی حیثیت سے منٹو خواب بننے والا آدمی تھا۔ لیکن اس کے بعد ہمارے یہاں ایک اور آدمی آیا جس کا تعلق سیاست سے تھا اور جو انور سجاد کے بہ قول مردِ عمل تھا۔ اس نے منٹو کے فکر و خیال سے تحریک حاصل کی اور اس کے خواب کو حقیقت کا روپ دینے کے لیے تگ و دو کی۔ انور سجاد کی کوشش ہے کہ وہ ان دونوں آدمیوں کے ساتھ انصاف کا سلوک کریں۔ لہٰذا انہوں نے پاکستان کے ایٹمی طاقت بننے کا سہرا دونوں کے سر باندھ دیا ہے۔ لیکن میں انور سجاد کی باتیں سن کر بہت چکرایا۔ میں نے سوچا، کیا واقعی ایسے اعزازات بہ حیثیت ادیب منٹو کی عزت اور شہرت میں کوئی اضافہ کرتے ہیں؟

مجھے تو یہ لگتا ہے کہ انور سجاد خود بھی بم دھماکوں کے اثرات میں ہیں اور ان ایٹمی دھماکوں نے انہیں اندر سے اتنا ہلا دیا ہے کہ وہ چاغی کے پہاڑوں کی طرح رنگ بدل رہے ہیں۔ انہوں نے اب مارکسی انقلاب کی بات کرنا چھوڑ دی ہے۔ اپنے اس مذکورہ بالا مضمون میں وہ نظام محمدی کے وکیل نظر آتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ پاکستانیوں کو ایٹمی طاقت حاصل کرنے کے بعد اس پر تکیہ کر کے نہیں بیٹھ رہنا چاہیے بلکہ سرزمین وطن کو محمدیؐ فلاحی ریاست بنانے کے لیے دوڑ دھوپ کرنی چاہیے۔ انور سجاد کے ان خیالات کے حوالے سے اس کے ایک ہم عصر نے رائے دیتے ہوئے کہا کہ ''میرا خیال ہے، مولانا طاہر القادری کو اپنی جماعت میں انور سجاد کا سواگت کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔'' لیکن میرے حسابوں وہاں بھی انور سجاد اکیلا نہیں ہوگا بلکہ اس کے مارکسی دوست پروفیسر اعجاز الحسن بے نظیر بھٹو کی پہرے داری کرتے ہوئے اس کے ساتھ سبھا جمانے کے لیے پہلے سے وہاں موجود ہوں گے۔ انور سجاد اگرچہ ایٹمی دھماکے کے سیاسی اور معاشی اثرات کی بابت خاصے فکرمند ہیں لیکن دیکھا جائے تو پاکستان کے ایٹمی دھماکوں کے حوالے سے ان کا ردِعمل ادیبوں کے عام رویے کو ظاہر کرتا ہے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ انور سجاد کی حد سے

بڑھی ہوئی تشویش ہی اسے ایک سیاسی تجزیہ نگار کی طرح صورت حال کا جائزہ لینے پر مجبور کرتی ہے۔ چناں چہ اس حوالے سے وہ نظام محمدؐ کی وکالت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

پاکستان کے ایٹمی طاقت بننے پر ویسے اپنی ادیب برادری عام طور سے خوش ہے۔ سبھی ادیب اس موقعے پر شکرے بنے نظر آتے ہیں۔ ان دنوں بس دو چار ہی ایسے ہوں گے جو کہ بی فاختہ دکھائی دیتے ہیں۔ البتہ زاہد ڈار جو کہ پرانا داعیِ امن ہے، ان دنوں کچھ بے کل ہے اور تابکاری اثرات کی شکایت کرتا ہے۔

میں نے ایک دن پوچھا، ''تمھیں کیسے پتا چلا کہ تم پر تابکاری کے اثرات ہوئے ہیں؟''

وہ بولا، ''مجھے یہ بات اپنی ناک سے معلوم ہوئی کیوں کہ آج کل میری ناک سے خون آرہا ہے اور تابکاری اثرات کی یہ پہلی علامت ہے۔''

''کیا یہ اس شدید گرمی کی وجہ سے نہیں ہوسکتا جو آج کل پڑ رہی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے جواب دیا، ''یہ گرمی تو خود ان ایٹمی دھماکوں کا براہ راست اثر ہے۔ میری ناک سے ہندوستان کے پہلے دھماکے کے بعد ہی سے خون آرہا ہے، حالاں کہ اس وقت تو مجھے ان دھماکوں کی خبر بھی نہیں تھی۔ میری ناک سے بہنے والا یہ خون صاف بتا رہا تھا کہ برصغیر میں کہیں نہ کہیں دھماکا ہوچکا ہے۔'' یہ سن کر میں چونکا کہ زاہد ڈار کی ناک تو راجستھان کے موروں سے زیادہ حساس ہے۔ راجستھان سے اچھا خاصا دُور رہنے کے باوجود اس کی ناک وہاں کے موروں کی طرح ہی کام کر رہی تھی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ تابکاری اثرات صرف اس پر کیوں ہوئے ہیں؟ اس کے پاس اس سوال کا بھی جواب ہے۔ وہ کہتا ہے، ''ہندوستان پاکستان کے لوگوں نے ان ایٹمی دھماکوں کے بارے میں ایک رومانی رویہ اختیار کیا ہے۔ لہٰذا انھیں ان کے مہلک اثرات کا احساس ہی نہیں ہورہا، حالاں کہ یہ اثرات ان پر مرتب ہورہے ہیں۔ لیکن عدم احساس کی وجہ سے وہ اس حوالے سے کچھ جاننا ہی نہیں چاہتے۔''

منحنی جسم اور حساس دماغ کی وجہ سے زاہد ڈار پر ویسے بھی زیادہ اثرات کا امکان ہے۔ چناں چہ اسی لیے وہ اپنے ایٹمی آزار کا اظہار کرتا ہے۔ گویا یوں ایٹمی تجربوں پر وہ ایک خاص انداز سے احتجاج کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کا یہ رویہ شکروں کو بھی فاصلے پر رکھنے کا معقول



ذریعہ ہے۔ چوں کہ پاک ٹی ہاؤس میں کتنے ہی دانش ور شکرے اس کی میز کی طرف لپکتے ہیں لیکن وہ یہ کہہ کر آسانی سے اپنی جان چھڑا لیتا ہے، ''مجھ پر تابکاری اثرات ہوئے ہیں۔ میری ناک سے خون آرہا ہے، بہتر یہ ہے کہ آپ مجھ سے دُور دُور ہی رہیں۔''

(انگریزی سے)

تحریروں سے جو معانی اخذ کیے ہیں، اُن کا تو اِن میں کہیں کوئی سراغ تک نہیں ملتا۔

ادب کا کوئی بھی ذرا سا ذہین قاری منٹو کی تحریروں میں طنز کی کاٹ کو فراموش نہیں کرسکتا۔ خاص طور سے انور سجاد جیسے آدمی کو تو اس اسلوب کو بہ خوبی سمجھنا چاہیے جو منٹو نے ان خطوں میں اختیار کیا ہے۔ رہی بات ایٹم بم کی تو اس معاملے میں منٹو مجھے اپنے ہم عصر ترقی پسندوں سے کچھ ایسا زیادہ مختلف نظر نہیں آتا جو اس زمانے میں جوہری ہتھیاروں کے حوالے سے ان خطرات اور ہلاکتوں کی بابت سخت تشویش کا اظہار کرتے تھے جو یہ ہتھیار اپنے ساتھ لے کر آرہے تھے۔

اُس وقت اِس حوالے سے امریکی شہنشاہیت پسندوں کی اجارہ داری نے تشویش پیدا کی تھی۔ امریکا نے ہیروشیما اور ناگا ساکی میں ان ہتھیاروں سے ہلاکت کا جو نقشہ پیش کیا تھا اس کی دہشت اور خوف اُس وقت تک دلوں میں بیٹھا ہوا تھا۔ اسی خوف اور تشویش کا تواتر سے اظہار ہمیں اس زمانے کے ترقی پسند لکھنے والوں کی کہانیوں میں نظر آتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی کی کہانی ''ہیروشیما سے پہلے، ہیروشیما کے بعد'' ایسی ہی ایک شدید تاثر والی کہانی ہے۔ یہاں مجھے ایک غیر ترقی پسند شاعر عظیم قریشی کی ایک نظم بھی یاد آرہی ہے جو کچھ یوں شروع ہوتی ہے:

اور انسان کی توہین کریں

اور انسان کی توہین کریں

اور انسان کی توہین کریں

منٹو کو بھی اس ہلاکت خیزی اور تباہی کی شدت کا حقیقی معنوں میں اندازہ تھا جو اس جوہری ہتھیار کا لازمہ تھی۔ لیکن اس کا بات کہنے کا انداز ترقی پسندوں سے بالکل مختلف تھا۔ وہ اپنے غیر جذباتی طریقۂ کار کے حوالے سے اِن سب لوگوں سے بالکل مختلف ہو جاتا ہے۔ اپنے خاص اسلوب کی وجہ سے، جو کہ طنز و مزاح کے ادبی سانچے میں ڈھل کر آتا ہے، ہمیں اس کے ہاں کبھی کبھی ایک طرح کی بے حسی یا سنگ دلی کا تاثر بھی ملتا ہے۔ اُس نے انکل سام کے نام جو خطوط لکھے ہیں، ان میں اُس کا اسلوب یہی ہے۔ ان خطوط میں وہ ایک بھتیجے کے طور پر بڑے معصوم انداز میں الٹے سیدھے اور آڑھے ترچھے سوال اٹھاتا ہے۔ صحیح معنوں میں دیکھا جائے تو

انتظار حسین

ترجمہ

مبین مرزا

# ...کس آن میں دیکھا

میرا جو کالم ۲۱رجون کو چھپا ہے اگر وہ کسی کے لیے بارِ خاطر ہوا ہے تو اسے درگزر کیا جائے۔ اس کالم میں، میں نے لکھا تھا کہ انور سجاد کہتے ہیں کہ بھٹو کے بجائے منٹو وہ پہلا آدمی ہے جس نے پاکستان کے ایٹمی طاقت بننے کا خواب دیکھا تھا۔ لیکن خود ان کے بہ قول منٹو صرف ایک خواب بننے والا تھا۔ اس کے اس خواب کو ایک مردِ عمل ذوالفقار علی بھٹو نے شرمندۂ تعبیر کیا۔ اس مردِ عمل نے منٹو کے خواب کو حقیقت کا جامہ کچھ اس طرح پہنایا کہ آج پاکستان ایٹمی طاقت بن کے ابھرا ہے۔

یہ واقعی انور سجاد کی منٹو پر عنایت ہے کہ وہ اسے آگے بڑھا کر بھٹو کے ساتھ اس اعزاز میں شریک ٹھہراتے ہیں جسے آج ہم اسلامی بم کا نام دیتے ہیں۔ لیکن ان کی گراں قدر تحقیق نے منٹو کے کتنے ہی مداحوں کو چکمے میں ڈال دیا ہے۔ وہ یہ سوچ سوچ کر چکراتے ہیں کہ ایٹم بم کے لیے یہ جوش و خروش جو ہمارے زمانے میں نظر آتا ہے، کیا واقعی اس کی جڑیں پیچھے منٹو تک جا کر تلاش کی جاسکتی ہیں؟ لیکن میں سوچتا ہوں کہ آخر اس میں تردد کی ایسی کیا بات ہے؟ ہم سیدھے سبھاؤ خود لکھنے والے سے رابطہ کر کے یہ جاننے کی کوشش کیوں نہ کریں کہ آیا اس کا موقف درست طور پر ہم تک پہنچایا گیا ہے کہ نہیں۔ بس اسی خیال سے میں نے منٹو کی وہ تحریریں جو اس نے انکل سام کے نام خط کی صورت میں لکھی ہیں، ڈھونڈ ڈھانڈ کر نکالیں۔ یہ سارے خط میں نے ایک بار پھر پوری توجہ اور تفصیل سے پڑھے، لیکن یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ انور سجاد نے ان

وہ ان خطوط میں اُس زمانے کی امریکی پالیسیوں پر کڑی نکتہ چینی کرتا ہوا ملتا ہے۔

یہ بھتیجا بڑی معصومیت سے اپنے چچا سے ٹیڑھے ٹیڑھے سوالات پوچھتا ہے مثلاً ہائیڈروجن بم کے بارے میں کچھ پوچھتا ہے اور پھر کہتا ہے، میں سن چکا ہوں کہ آپ نے صرف دنیا میں امن قائم کرنے کے لیے ہائیڈروجن بم بنایا ہے۔ مجھے آپ پر پورا اعتماد ہے، اور کیوں نہ ہو؟ پہلی بات تو یہ کہ میں نے آپ کی بھیجی ہوئی گندم کھائی ہے۔ دوسرے یہ کہ میں آپ کا بھتیجا ہوں۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ بچوں سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنے بڑوں کی باتوں کا یقین کریں گے۔ لیکن میں آپ سے ایک سوال ضرور پوچھنا چاہوں گا۔ کیا میرا یہ گمان درست ہے کہ آپ جس دنیا میں امن قائم کرنے میں کامیاب ہوں گے، وہ ایک چھوٹی سی اور صاف ستھری دنیا ہوگی؟ میرا مطلب یہ ہے کہ بہت سے ملک صفحۂ ہستی سے مٹ جائیں گے۔ میری بھتیجی جو اسکول میں پڑھتی ہے، ایک روز مجھ سے دنیا کا نقشہ بنانے کی فرمائش کر رہی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ کچھ دن انتظار کرو۔ میں ذرا پہلے اپنے چچا سے پوچھ لوں کہ کون کون سے ملکوں کا صفایا ہوجائے گا اور کون کون سے بچ رہیں گے؟ اس کے بعد آسانی سے مطلوبہ نقشہ بنایا جاسکتا ہے۔

یہ بھتیجا اپنے چچا سے خاص طور پر فرمائش کرتا ہے کہ جن ملکوں کو ملیامیٹ ہونا ہے، ان میں سوویت یونین کا نام سرِفہرست ہونا چاہیے۔ اسی طرح کے موڈ میں وہ ایک بار چچا سے ایک چھوٹے بم کی فرمائش بھی کرتا ہے۔ لیکن کس لیے؟ وہ اپنے پیارے انکل کو بتاتا ہے کہ وہ مولوی حضرات پر یہ بم پھینکے گا جو سرِعام استنجا کرتے نظر آتے ہیں۔ یہاں میں یہ بات صاف طور پر بتا دوں کہ میں نے منٹو کا یہ حوالہ باقاعدہ اقتباس کے طور پر نہیں دیا بلکہ میں نے یہ باتیں جن میں چھوٹے بم کا ذکر بھی شامل ہے، حافظے کی بنیاد پر نقل کی ہیں کہ مجھے تو صرف اس خیال کا حوالہ دینا تھا جو اس نے چچا سام کے نام خطوط کی شکل میں پیش کیا تھا۔

میں حیران ہوں کہ انور سجاد نے بم کی مخالفت میں لکھی جانے والی ان تحریروں سے پاکستانی ایٹم بم کا سراغ کہاں سے پالیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ سرِعام استنجا کرنے والوں کے بارے میں منٹو کے جذبات سے اس نے پاکستانی بم کی کھوج لگائی ہو۔ بھئی بہت خوب، یعنی یہ بھی ایک ہی رہی کہ ایک طرف تو منٹو ایٹم بم کی ہلاکت خیزی کا یہ نقشہ کھینچتا ہے کہ اس کے



ذریعے دنیا کے نقشے سے ملکوں کا صفایا ہوجائے گا، دوسری طرف اسے ایک ایسی شخصیت کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے جو اس بات کی خواہش مند ہے کہ پاکستان کے پاس جوہری ہتھیار ہونے چاہییں۔ میرا خیال ہے کہ ایسی دو باتیں جن کے درمیان کسی طرح کی کوئی مناسبت نہ ہو، انھیں جوڑنے کا ہنر انور سجاد کو خوب آتا ہے۔

مجھے اس وقت بمبئی کی ایک فلم ''آٹھ دن'' بھی یاد آرہی ہے جس میں خود منٹو نے ایک نیم پاگل شخص کا کردار بھی ادا کیا تھا۔ یہ شخص ہر وقت ہاتھ میں ایک چھوٹا سا گولا لیے پھرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ اس کے پاس ایٹم بم ہے۔ وہ لوگوں کو دھمکاتا پھرتا ہے کہ وہ اس بم سے پوری دنیا کو ہلاک کر دے گا۔ اس فلم کا اسکرپٹ بھی خود منٹو نے لکھا تھا۔ اس فلم سے بھی ہمیں ایٹم بم کے خلاف منٹو کے ردِعمل کا باآسانی اندازہ ہوتا ہے۔

اصل میں کہنے کی جو بات ہے وہ کچھ یوں ہے کہ ایٹم بم جاہ طلب اور اقتدار پسند سیاست دانوں کا اور ان لوگوں کا مسئلہ ہے جن کے دلوں میں سپر پاور کی عظمت اور قوت حاصل کرنے کے خواب پروان چڑھتے ہیں۔ رہی بات لکھنے والوں کی یا شعور پسند اور حساس لکھنے والوں کی، تو میرا خیال ہے کہ خود مغرب میں بھی شاید ہی کوئی ادیب یا دانش ور ہوگا جو اس خواب کے اثر میں ہو۔ کیوں کہ یہ خواب جس عظمت اور قدرت کا نقشہ کھینچتا ہے اس سے کہیں زیادہ ہولناکی اور دہشت کے سائے اس پر منڈلاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انور سجاد نے اپنے لیڈر کے ساتھ بڑی ناانصافی کی کہ ایٹمی قوت کے حصول کے اعزاز میں ان کے ساتھ ایک ادیب کو بھی شریک کر دیا۔ بھئی میری دانست میں کم سے کم منٹو تو کسی طرح اس اعزاز کا مستحق نہیں ہے۔

(انگریزی سے)

امر جلیل

ترجمہ

آصف فرخی

# عجیب و غریب موت

ہمارا دوست ''غریب عوام'' نتھیا گلی کے مقام پر اس دنیا سے گزر گیا۔ کسی نے اس کو مرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اس کی لاش ہمیں ''ہوٹل خاص برائے خواص'' کے خستہ حال شاگرد پیشہ والے حصے میں ملی، جسے وہاں باقاعدگی سے آنے والے سیاح اس نام کے مخفف ''خ خ'' کے نام سے پکارتے ہیں۔ اس کا منھ اور آنکھیں کھلے ہوئے تھے اور اس کے ہاتھ اس طرح سینے پر رکھے تھے جیسے وہ دعا مانگ رہا ہو۔ ایسا لگتا تھا کہ اس نے خدائے ازل و ابد سے اپنی زندگی میں آخری مرتبہ بات کی ہے اور اس کے بعد اس دنیا سے آگے والی دُنیا کے اس سفر پر روانہ ہوا ہے جو اٹل ہے۔

ہوٹل خ خ میں ٹھہرنے والے سیاحوں میں سے ایک ڈاکٹر نمودار ہوا، ہمارے دوست ''غریب عوام'' پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی اور اس کی موت کا اعلان کر دیا۔

''کیا وہ دل کے دورے سے ہلاک ہوا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ اصراف سے مرا ہے۔'' ڈاکٹر نے بے توجہی سے کہا اور واپس جانے کے لیے مڑ گیا۔

''ڈاکٹر صاحب، مہربانی کر کے یہ تو بتا دیجئے کہ یہ اصراف ہوتا کیا ہے؟'' میں نے پوچھا

''اچھا!'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''جب آپ بہت سے انڈے، مچھلی، مرغی، مکھن، ڈبل روٹی، دودھ، پھل اور پھلوں کا رس صرف نہیں کر سکتے تو اصراف کی وجہ سے مرنے کا خطرہ مول لے لیتے ہیں۔''



''آدمی وہی کھا سکتا ہے جو آسمانوں میں اس کے مقدر میں لکھ دیا گیا۔'' ایک مولوی نے ڈاکٹر کو ٹوک دیا، اور کہا ''مزدوروں میں بے چینی مت پھیلاؤ۔''

ڈاکٹر نے مولوی کے ساتھ کوئی بحث نہیں کی اور وہاں سے چلا گیا۔

ہم نے ''غریب عوام'' کے رشتے داروں سے اس پتے پر رابطہ کرنے کی کوشش کی جو اس نے ہوٹل کی انتظامیہ کو دیا تھا۔ ہمارے دوست کی عرفیت ''غریب'' تھی۔ اس کے باپ کا نام ''مسکین''، اس کے دادا کا نام ''فقیر'' اور اس کے پر دادا کا نام ''غلام'' تھا۔ ہم اس کے رشتے داروں سے رابطہ کرنے میں ناکام رہے۔ تاریخ نے اندرونِ سندھ واقع اس کے آبائی گاؤں کے جغرافیے کو اتھل پتھل کر دیا تھا۔ اس کے گاؤں کا بپتسمہ کر کے اس کو ایک نیا نام دے دیا گیا تھا مگر کسی کو نہیں معلوم تھا کہ یہ نیا نام کیا ہے۔

''غریب'' نتھیا گلی میں ہمارا ساتھی تھا۔ کئی برس سے ہم سیاحوں کی آمد کے موسم میں ہوٹل خ خ میں ساتھ کام کرتے رہے تھے۔ ہر سال تقریباً چار مہینے، ہم ہوٹل کے خستہ حال شاگرد پیشہ میں چوہوں، چھپکلیوں اور مکڑیوں کے ساتھ رہتے مہمانوں سے بچ جانے والا کھانا کھاتے۔ ہم اس ہوٹل کے بیرے تھے۔ ہم گھنٹی کی آواز پر دوڑنے والے خدمت گار تھے۔ ہم بار بردار تھے۔ ہم میلے کپڑے دھوتے، گندے برتن مانجھتے اور غسل خانے صاف کرتے۔ سیاحوں کے واپس چلے جانے کے بعد ہوٹل کی انتظامیہ ہمیں برخاست کر دیتی۔ کوئی آٹھ مہینے کے بعد جب سیاحت کا موسم دوبارہ شروع ہوتا تو ہم ہوٹل خ خ میں ایک دوسرے کو پھر دیکھتے، پہلے سے زیادہ درماندہ، شکستہ اور بدحالی میں گرفتار۔ مگر ایک ساتھ مل کر ہم خوش تھے۔ ہم مطمئن تھے۔ ہم اپنے اُجڑے چہروں پر وہ مسکراہٹ دوبارہ سجا لیتے جو ہمارے لیے ممنوعہ تھی۔ اس موت نے پھر ایک بار ہمیں غم زدہ کر دیا، ''غریب'' کی موت، جو مسکین کا بیٹا تھا، فقیر کا پوتا اور غلام کا پڑپوتا۔

ہم نے ایک چھوٹی گاڑی کرائے پر لی اور ''غریب'' کی لاش اسلام آباد لے آئے۔ تاریخ اور جغرافیہ میں اتھل پتھل کے دوران اس کی جڑیں اکھڑ چکی تھیں۔ اب وہ کسی صوبے کا باشندہ نہیں تھا۔ وہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دارالحکومت کا شہری تھا۔ اس لیے ہم نے سوچا

کہ اسے اسلام آباد ہی میں شایانِ شان تدفین کا موقع فراہم کیا جائے۔ وہ پاکستان کے تمام وزرائے اعظم میں بہت مقبول تھا۔ اپنی تقریروں میں وہ لامحالہ اس کا ذکر بہت زور دے کر کیا کرتے، وہ ''غریب عوام'' کے لیے اپنی محبت کا واشگاف اعلان کرنے سے ذرا نہ جھجکتے۔

ہم کہ ''غریب عوام'' کے فلاکت زدہ دوست تھے، ہم نے یہ سوچا کہ اس کے سانحۂ ارتحال کی خبر پاکستان کے زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچائی جائے۔ وہ کوئی بے کار وجود نہیں تھا۔ اس کی بھی اپنی ہستی تھی۔ اس کے دوستوں نے اس ناوقت موت کی خبر کو زیادہ سے زیادہ تشہیر دینے کی ذمہ داری مجھے سونپ دی۔ میں نے سب سے پہلے پی ٹی وی کے ایم ڈی سے رابطہ کیا۔ ان کے بجائے ایم ڈی کے اسسٹنٹ پرائیویٹ سیکریٹری کے پرسنل اسسٹنٹ کے ایک اسسٹنٹ نے ایک محفوظ فاصلے سے مجھ سے بات کی جو اربابِ اقتدار کے بھی اربابِ اختیار کے دفتر سے بہت دور تھا۔

''تم ایم ڈی، پی ٹی وی سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''ایک بہت اہم آدمی مرگیا ہے۔'' میں نے اسے ''غریب عوام'' کی تصویر دکھائی اور کہا ''میں چاہتا ہوں کہ اس کی یہ تصویر ٹی وی کی اسکرین پر آئے اور خبریں پڑھنے والے ساری قوم کو اطلاع دیں کہ ''غریب عوام'' آخر کار رحلت فرما گیا۔''

کم از کم تین اسسٹنٹوں کے اسسٹنٹ نے میری طرف شک کے ساتھ دیکھا۔ ''کیا اس نے پاکستان کی تعمیر میں خاطر خواہ حصہ لیا تھا؟''

''ارے!'' میں نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔ ''وہ تو بس ۴۳ سال کا تھا۔''

''اچھا، تو کیا وہ وفاقی حکومت میں سیکریٹری تھا؟''

''جی نہیں۔''

''کیا وہ ایم این اے یا ایم پی اے تھا اور اس کا تعلق حکمراں جماعت سے تھا؟''

''جی نہیں، جناب!''

''کیا وہ معروف صنعت کار تھا؟''

''نہیں!''



''تاجر؟''

''مجھے افسوس ہے، وہ تاجر نہیں تھا۔''

''کیا وہ سماجی مصلح، گلوکار یا اداکار تھا؟''

''نہیں''

''کیا وہ مشہور کھلاڑی تھا؟''

''دیکھیے'' میں پریشان ہوکر کہنے لگا ''اس کی پاکستان کے تمام وزرائے اعظم سے ذاتی طور پر ملاقات تھی۔''

''سارے وزرائے اعظم؟'' اس نے پوچھا۔

''سارے تو نہیں'' میں نے کہا۔ ''ذوالفقار علی بھٹو سے محمد نواز شریف تک، سب ہی اس کا ذکر نہایت اچھے الفاظ میں کرتے تھے، اور بار بار یہ جتاتے تھے کہ یہ ملک اصل میں اسی کا ہے۔''

''اسی کا؟'' اس نے طنزاً پوچھا۔

''میرا مطلب ہے 'غریب عوام کا'' میں نے کہا۔ ''قوم کا حق ہے کہ اسے معلوم ہو کر ''غریب عوام'' فوت ہوگیا ہے۔''

اس نے کہا ''ہم بے وقعت لوگوں کے بارے میں خبریں نشر نہیں کرتے۔''

''غریب عوام کی وقعت تھی'' میں نے کہا۔ ''وہ بے وقعت نہیں تھا۔''

کم از کم تین اسسٹنٹوں کا اسسٹنٹ کچھ کہے سنے بغیر وہاں سے رخصت ہوگیا۔

اس کے بعد میں نے اسلام آباد کے کم از کم چار اخباروں کے دفتروں کے چکر کاٹے اور وہاں جا کر بھی اسی مخمصے کا شکار رہا۔ ''غریب عوام'' کتنا اہم تھا؟ کیا وہ پی آئی اے کا ایم ڈی تھا؟ کیا وہ ایف آئی اے کا سابق ڈی جی تھا؟ کیا وہ کبھی پہلے آئی ایس آئی کا چیف رہا تھا؟ کیا وہ ریٹائرڈ آئی جی پولیس تھا؟ کیا وہ کسی بینک کا چیف ایگزیکٹو تھا؟ کیا وہ پرانا دھرانا سفارت کار تھا؟

ایک نوجوان نامہ نگار میری مدد کو آیا۔ اس نے کہا ''میں خود آؤں گا ''غریب عوام'' کی نمازِ جنازہ کی خبر بنانے کے لیے، اگر اس موقعے پر صدر، وزیرِ اعظم، دو چار وزراء، جرنیل، میجر جنرل اور بریگیڈیئر آ گئے۔''

ایوان صدر میں مجھے ایک اسسٹنٹ نے روک دیا جو صدر کے اسسٹنٹ پرنسپل اسسٹنٹ کا دسواں اسسٹنٹ تھا۔ وہ بڑا خوش اخلاق تھا۔ اس نے بڑے تحمل سے میری بات سنی۔

''تمہارے سامنے تین راستے ہیں۔ ایک تو یہ کہ تم انٹیلی جنس ایجنسیوں کے سامنے تفتیش کے لیے پیش ہو جاؤ۔ دوسرے یہ کہ میں خود تمہیں پاگل خانے بھجوائے دیتا ہوں۔ تیسرے یہ کہ تم یہاں سے پھوٹ لو اور رفو چکر ہو جاؤ۔''

میں نے آخری راستہ اختیار کیا۔ میں ایوانِ صدر کی حدود سے رفو چکر ہو گیا۔

وزیراعظم کے سیکریٹریٹ میں ایک اسسٹنٹ مجھ سے ملا جو وزیراعظم کے اسپیشل اسسٹنٹ کے دسویں اسسٹنٹ کا پچیسواں اسسٹنٹ تھا۔ وہ ٹھگنا، موٹا اور گنجا تھا۔ میں نے اسے بتایا ''غریب عوام'' مر گیا ہے۔

''کبھی نام بھی نہیں سنا'' اس نے کہا۔

''وزیراعظم صاحب اسے جانتے ہیں'' میں نے پچیسویں اسسٹنٹ سے کہا۔ ''جائیے، جا کر انہیں بتا دیجئے کہ مرحوم ''غریب عوام'' کا ایک دوست ان سے ملنے آیا ہے۔''

''وہ ۲۰۱۰ء تک آپ سے مل نہیں سکتے'' اس نے کہا۔ ''اسی طرح آپ بھی ان سے ۲۰۱۰ء تک نہیں مل سکتے۔ اگر آپ انہیں دیکھنا ہی چاہتے ہیں تو اپنے ٹیلی وژن کی اسکرین پر روزانہ دیکھ سکتے ہیں، بلا ناغہ۔ آپ کو پتا ہوگا کہ وہ دھماکے کے بعد بہت مصروف ہو گئے ہیں۔''

''بہت اچھا!'' میں نے اس سے کہا۔ ''مہربانی کر کے ان سے کہہ دیں کہ ''غریب عوام'' کی نمازِ جنازہ میں ضرور شرکت فرمالیں۔ یہ ان کے قیمتی وقت میں سے پانچ منٹ سے زیادہ نہیں لے گی۔''

''ناممکن!'' پچیسویں اسسٹنٹ نے کہا۔ ''۲۰۱۰ عیسوی کے بعد ہی وزیراعظم صاحب ''غریب عوام'' کی نمازِ جنازہ میں شرکت کے لیے وقت نکال سکیں گے۔''

ہم نے اپنے دوست ''غریب عوام'' کی تدفین ۲۰۱۰ عیسوی تک کے لیے ملتوی کر دی ہے۔

(انگریزی سے)

امر جلیل

ترجمہ

آصف فرخی

# عین قاف خان مشکل میں

ہم نے اس دبلے پتلے اجنبی کی طرف شک بھری نظروں سے دیکھا۔ وہ بوسیدہ کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ بکھرے، الجھے بالوں نے اس کی شخصیت کو پُراسرار بنا دیا تھا۔ وہ شاید کئی مہینوں سے نہایا نہیں تھا۔ اس کی گہری آنکھوں میں موجود بے چینی نے ہمیں اس کی طرف سے خائف سا کر دیا۔ سب ایڈیٹر ابوبکر میری طرف جھکا اور میرے کان میں کہنے لگا، ''یہ یا تو بہروپیا ہے یا دشمن کا ایجنٹ۔ یہ عین قاف خاں نہیں ہے۔''

''میرے خیال میں اس کا ذہنی توازن بگڑا ہوا ہے۔'' میں نے اجنبی کا جائزہ لیا اور پھر اتنے آہستہ کہ بمشکل سنا جا سکے، کہا ''یہ پاگل معلوم ہوتا ہے۔''

''دشمن کے ایجنٹ اور جاسوس اس بات کو ترجیح دیتے ہیں کہ ذہنی طور پر ماؤف نظر آئیں،'' ابوبکر بڑبڑایا۔ ''ہمیں خفیہ ایجنسی کو خبردار کرنا چاہیے۔''

''میرے پاس وقت محدود ہے'' اجنبی مضطرب ہو رہا تھا۔ اس نے پہلو بدلا اور کہا ''آپ مجھے چیف ایڈیٹر سے بات کیوں نہیں کرنے دیتے، یا پھر ایگزیکٹو ایڈیٹر سے یا پھر اخبارات کے مالک سے! میرے پاس ان کے سامنے ظاہر کرنے کے لئے بڑی اہم بات ہے۔''

ابوبکر نے کہا ''آپ وہ اہم بات ہمارے سامنے ظاہر کر سکتے ہیں۔''

اس نے دوٹوک جواب دیا ''یہ ناممکن ہے!''

میں نے اسے دفتر کا قاعدہ قرینہ سمجھانا چاہا اور کہا ''دیکھئے جناب!''

اس نے مجھے بیچ میں روک دیا اور کہا ''میرا نام عین قاف خان ہے۔''

''ذرا ٹھہریئے'' میں نے اپنی دراز سے عین قاف خان کی تصویر نکالی اور کہا ''یہ اصلی عین قاف خان ہے۔''

''میں بھی اصلی عین قاف خان ہوں۔''

''آپ سائنس داں ہیں؟''

''جی ہاں، میں سائنس داں ہوں۔''

''آپ بم بنا سکتے ہیں؟''

''جی ہاں، بنا سکتا ہوں'' پھر اچانک وہ بول اٹھا ''دراصل میں ایک بم بنا بھی لیا ہے۔''

ہکا بکا ہو کر میں نے دوبارہ پوچھا ''آپ نے کیا بنالیا ہے؟''

اس نے جواب دیا ''بم۔''

''بم!'' ابوبکر پکار اٹھا۔

''جی ہاں'' وہ کہنے لگا۔ ''میں نے ایک بم بنالیا ہے۔''

ہم مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔ میں نے اس سے پوچھا ''کیا آپ کا بم اس قابل ہے کہ دس ملین عورتوں، بچوں اور مردوں کو دس سیکنڈ میں ختم کر ڈالے؟''

مخبوط الحواس اجنبی نے اپنا دبلا پتلا بازو میز پر پھیلا دیا اور کہا ''نہیں۔ یہ بم دس ملین عورتوں، بچوں اور مردوں کو مار نہیں سکتا۔''

''پھر!'' میں نے پوچھا۔ ''تو پھر تمہارے بم میں ایسی کیا خاص بات ہے جو تم ایگزیکٹو ایڈیٹر یا چیف ایڈیٹر ہی کے سامنے ظاہر کرنا چاہتے ہو؟''

مخبوط الحواس اجنبی نے اِدھر اُدھر دیکھا اور کہا ''یہ بہت خاص قسم کا بم ہے۔''

''کیا یہ پچاس سیکنڈ میں پچاس ملین لوگوں کو ہلاک کر سکتا ہے؟''

''نہیں۔''

''کیا یہ سو سیکنڈ میں سو ملین انسانوں کو موت کے گھاٹ اُتار سکتا ہے؟''

''نہیں۔'' اس کا جواب پُر زور نفی میں تھا۔



''تو پھر؟''

دبلا پتلا اجنبی اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ وہ کھڑکی کے پاس گیا، پردے کھولے، باہر جھانکا اور ہمیں وہاں بلایا۔ ''ادھر آؤ''۔

ہم اس کے پاس گئے۔ ہم نے کھڑکی کے باہر جو منظر دیکھا اس نے ہمیں حیران کر دیا۔ ہمیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ سڑک کے بچوں کی بہت بڑی تعداد کوڑے کے بدبودار ڈھیر میں سے غذا تلاش کر رہی تھی۔ ان کے تن بدن پر چیتھڑے تھے۔ یہ بات ناقابل یقین تھی اس لیے کہ ہمارے اخبار کے عالی شان دفتر کے آس پاس کوڑے کا کوئی ڈھیر نہ تھا۔ کھڑکی ہمیشہ گلاب کے باغ میں کھلتی جو اخبار کے سلسلۂ عمارات کی حدود میں واقع تھا۔

حیرت زدہ ہو کر ہم نے اس سے پوچھا، ''کیا تم جادوگر ہو؟''

''نہیں، میں جادوگر نہیں ہوں'' وہ اپنی کرسی پر واپس آ گیا، اور کہنے لگا ''مگر میرے پاس بم موجود ہے۔''

ابوبکر نے پھر میرے کان میں کہا ''ہمیں ضرور خفیہ ایجنسیوں کو اطلاع دینی چاہیے۔ مجھے تو یہ بہت خطرناک آدمی معلوم ہوتا ہے!''

''میرے بم میں یہ صلاحیت ہے کہ سڑک کے آوارہ بچوں کو غذا اور حفاظت کی جگہ فراہم کرے،'' اجنبی نے کہا۔ ''پھر وہ اسکول جائیں گے۔ وہ پڑھیں گے اور سیکھیں گے کہ اس ملک کو اعلیٰ درجے کی قیادت فراہم کریں۔''

ابوبکر نے میرے کان میں سرگوشی کی ''اب مجھے یقین آ گیا کہ اس کا ذہنی توازن دُرست نہیں۔''

''ہمیں کل کے شہریوں کے لیے آج سرمایہ کاری کرنی چاہیئے۔'' اس نے ہماری طرف دیکھا اور پوچھنے لگا ''آپ کو پتہ ہے کہ کسی بھی قوم کا سب سے بڑا سرمایہ کیا ہوتا ہے؟''

''جی ہاں'' ہم نے جواب دیا۔ ''ایٹم بم ہوتا ہے۔''

''جاپان کے پاس ایٹم بم نہیں ہے!'' وہ پاگل کہنے لگا۔ ''سنگاپور، برونئی، ملائیشیا، عرب امارات اور سعودی عرب کے پاس بھی ایٹم بم نہیں ہے۔ لیکن وہ معاشی طور پر طاقت ور ہیں۔

آپ مضحکہ خیز معلوم ہوتے ہیں جب آپ کے ایک ہاتھ میں ایٹم بم ہو اور دوسرے ہاتھ میں بھیک مانگنے کا کشکول۔''

میں ابوبکر کی طرف جھک گیا اور اس کے کان میں کہا ''اس دیوانے سے پیچھا چھڑانا چاہیے۔''

''کوئی بھی صلاحیت معاشی استحکام سے بڑھ کر نہیں ہے'' خبطی کہہ رہا تھا۔ ''میرا بم ملک میں دوبارہ معاشرتی خوش حالی لے کر آئے گا۔''

ابوبکر کے اور میرے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ بلکہ ہم ابھی تک اس بھیانک منظر کے اثر سے نہیں نکل سکے تھے۔ جو ہم نے کھڑکی سے دیکھا تھا۔ اجنبی آہستہ سے اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا اور بولا ''میرے ساتھ آؤ۔''

ہم اس کے پیچھے پیچھے گئے۔ وہ کھڑکی کے پاس آیا اور پردے کھول دیے۔ کھڑکی دو کمروں کے ایک دفتر میں کھلی۔ ہم نے جو دیکھا، اس نے ہمیں صدمے میں مبتلا کر دیا۔ ایک آدمی آیا، اس نے بندوق نکالی اور ایک عورت کے سر میں گولی مار دی۔ عورت فوراً ہی پھڑک کر مرگئی۔

''اس کا نام سمیعہ ہے'' اجنبی نے پردے بند کردیے۔ ''میرا بم یہ نہیں ہونے دے گا کہ جن عورتوں پر کوئی الزام لگایا گیا ہے انہیں کاری قرار دیا جائے اور ان کا خون کر دیا جائے۔''

اس نے پھر کھڑکی کے پردے ہٹا دیئے۔ اب ہم نے جو کچھ دیکھا وہ بھیانک تھا۔ دو آدمی کلہاڑے اور قصائی کے بغدے لیے ہوئے ایک کچے مکان میں داخل ہوئے اور آناً فاناً تیرہ افراد کے پورے خاندان کو ہلاک کر ڈالا، اور فوراً ہی غائب ہوگئے۔ جن لوگوں کو قتل کیا گیا ان میں ستر سالہ بوڑھی دادی تھی اور سب سے چھوٹی، ایک سال کی دودھ پیتی بچی۔

''جب میں اپنا بم پھینکوں گا، قاتل اس طرح دندناتے نہیں پھر سکیں گے۔ مایوس نوجوان خودکشی نہیں کریں گے۔'' اجنبی نے کہا۔ ''مجھے حیرت ہے کہ پھر بھی یہ لوگ مجھے بم مارنے کیوں نہیں دیتے؟ انہیں کیوں یقین نہیں آتا کہ میں عین قاف خان ہوں۔''

اب میرے اوسان بحال ہوگئے تھے۔ میں نے کہا ''اس لیے کہ تم عین قاف خان نہیں



ہو۔''

''میں عین قاف خان ہوں'' اس نے اصرار کیا۔ وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا ''میرا نام عبدالقدوس خان ہے اور میں معاشرتی علوم کا سائنس دان ہوں۔''

وہ چلا گیا اور ہمیں ہکا بکا چھوڑ گیا۔

(انگریزی سے)

ڈاکٹر اسلم فرخی

## حرفِ دُعا

حضورؐ! آج کا انساں فنا کی راہ میں ہے
حصار بند ہے اشرار کی نگاہ میں ہے

نہ ہے پناہ نہ سایہ کہیں محبت کا
ہر ایک سمت سے تہدید و اشتباہ میں ہے

حضورؐ! آج کا انساں ہے درپئے آزار
یہ مشتِ خاک بکھرنے کی رسم وراہ میں ہے

یہ اپنی عقل پہ نازاں ہلاکتوں کا نقیب
ہنوز جستجوئے نورِ مہر و ماہ میں ہے

تمام عالمِ انساں کو اپنی زد میں لیے
یہ تاب کاری کے اک سیل بے پناہ میں ہے

کہیں یہ عالمِ ایجاد ہی کو پھونک نہ دے
یہ ایک عمر سے ایٹم کی سجدہ گاہ میں ہے

عجب وقت ہے کتنا مہیب ہے لمحہ
سُراغِ دشتِ عدم بوئے گرد راہ میں ہے

حضورؐ! فخرِ دو عالم میں سرِ امکاں ہیں
جہانِ کہنہ و نو آپ کی پناہ میں ہے

حضورؐ! موت کے نرغے میں آدمیت ہے
حضورؐ! حرفِ دُعا کی بڑی ضرورت ہے

# کتاب کہانی

۲۸ مئی ۱۹۹۸ء کو ہم کرۂ ارض کی ساتویں قوت کی طرح ابھرے۔ ۱۳ اگست کے ''نوائے وقت'' میں الطاف گوہر کے ہفتہ وار کالم میں ایک نظم دفن تھی۔ اس کا پہلا ہی بند پڑھا تھا کہ ماتھا ٹھنکا۔ عنوان تھا ''عرض داشت''، اور شاعر تھے ضیا جالندھری۔ نظم مکمل کی، دوسری بار، تیسری اور پھر چوتھی بار..... نظم کا موضوع تھا پاک و ہند میں جوہری دھماکے۔ دوسروں کی رائے سے اختلاف کی عادت نے ایک خرابی یہ پیدا کر دی ہے کہ کبھی کبھی اپنی رائے سے بھی اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ ٹیلی فون اٹھایا کہ عالمانِ ادب سے رجوع کیا جائے۔ پہلا فون مکرم و محترم حمید نسیم مرحوم کو کیا۔ بیماری اور نقاہت کے باوجود فون پر بات کی۔ ان سے استدعا کی کہ ''نوائے وقت'' منگوائیں اور اپنے دو قدیم دوستوں، الطاف گوہر اور ضیاء جالندھری سے کچھ دیر گفتگو کا لطف اٹھائیں۔ اس کے بعد چار اور دوستوں سے یہی استدعا کی۔ حیرت ناک امر یہ ہے کہ ہر شخص نے اس حقیر فقیر کی رائے سے اتفاق کیا۔ ۲۰ اگست کو راقم الحروف کا بیٹا اپنے بیوی بچوں کے ساتھ سرحد پار جا رہا تھا۔ سنہری موقع تھا۔ ''عرض داشت'' کو کمپیوٹر پر سیٹ کروایا اور کوئی بیس کاپیاں ہندوستان کے دوستوں کے لیے بھجوائیں۔ دو ردِعمل ہوئے۔ گیارہ اخبارات و رسائل میں نظم شائع ہوئی اور جتنے دوستوں کو نظم کی کاپی بھجوائی تھی، سب نے پسندیدگی کا اظہار کیا۔ سب سے دلچسپ تبصرہ کالی داس گپتا رضا کا تھا۔ لکھتے ہیں: ''ضیا ہی ایسی نظم لکھ سکتے ہیں، میرے ہم وطن جو ٹھیرے''۔ (ضیا جالندھری سے نہ تو کبھی ملاقات کا شرف حاصل ہوا اور نہ خط و کتابت)۔

کچھ عرصے بعد انتظار حسین کا ایک مضمون اور مورنامہ نے بس اس کتاب کا بیج بویا۔ لیکن اپنی بھی تو کچھ مجبوریاں تھیں۔ مواد تک رسائی۔ جس کے لیے دوڑ دھوپ کی ضرورت تھی یہاں یہ حال کہ چار دیواری میں محبوس۔ اسی سوچ بچار میں ''پہلی سالگرہ'' بیت گئی اور ''دوسری سالگرہ''

سر پر کھڑی تھی کہ اپریل کے پہلے ہفتہ میں اس سارے منصوبہ کا ذکر جواں سال و جواں فکر، باہمت اور باصلاحیت، ساتھ ہی محنتی جواں دوست آصف فرخی سے کیا۔ اس کام کے لیے یہی موزوں ترین شخص ہوسکتا تھا۔ کتاب پیش خدمت ہے، خود ہی فیصلہ کرلیجیے۔ اس میں جتنی خوبیاں ہیں یا کوئی افسانہ، مضمون یا نظم پڑھ کر آپ محظوظ ہوں تو داد کے مستحق آصف اور صرف آصف ہیں۔ پھر یاروں کو جب علم ہوا تو ڈھیروں افسانے اور نظمیں (تازہ بہ تازہ اور بقول ایک دانشور، ''شرکت منظور تھی'') لکھے گئے۔ بڑی مشکلات پیدا ہوئیں۔ واضح رہے کہ یہ سارا کام انتہائی عجلت اور تیز رفتاری سے اختتام تک پہنچا۔ کوئی پانچ سو صفحات سے زائد...... انتخاب در انتخاب...... نتیجہ دو باتیں ہوئیں کچھ کمزور تخلیقات شامل ہیں، غلطیاں بھی بہت در آئی ہیں۔ اور خامیاں بھی بہت ہیں۔ اس بے داد کے لیے صرف اور صرف یہ حقیر فقیر ہی ذمہ دار ہے۔ داد کے مستحق آصف ہیں۔ بے داد کے لیے جھولی پھیلائے ہوئے ہوں۔ تو پھر کتاب پر مرتب کا نام؟ یہ زیب داستاں کے لیے ہے۔

اظہار تشکر: یہ کتاب آپ تک نہ پہنچتی اگر بہت سے دوست دستِ تعاون دراز نہ کرتے۔ فرداً فرداً سب کا شکریہ ادا کرنا تو مشکل ہے، لیکن چند احباب کا ذکر ضروری ہے جس میں کرم فرمائے دیرینہ خلیق ابراہیم خلیق کا نام سرفہرست ہے۔ اس کے علاوہ انور احسن صدیقی، واحد بشیر، حسن عابدی، حسن عابد، زہرہ یوسف، زبیدہ مصطفیٰ، عائشہ اظفر، ڈاکٹر فہیم اعظمی، محمود واجد، مصدق سانول، مسعود احمد، خدا بخش ابڑو، عباس جلبانی، محمد صدیق یہ اور بہت سے دوسرے احباب شکریہ کے مستحق ہیں۔ رضی عباس زیدی خصوصی شکریے کے مستحق ہیں۔ موصوف کے تعاون اور رہنمائی کے بغیر ''ذرّہ اور آدم خاکی'' کا باب حقیر فقیر کے بس کی بات نہیں تھی۔ ان تمام مصنفین کا شکریہ جنھوں نے اس کتاب میں اپنی تحریروں کی شمولیت کی اجازت دی۔ خاص طور پر حسن منظر، جن کی اجازت سے ان کے افسانے پر اس کتاب کا نام رکھا گیا ہے۔ کتاب کی بروقت کمپوزنگ احمد گرافکس کے اقبال احمد کے خلوص و لگن کا نتیجہ ہے۔ اس کے علاوہ دو نوجوان دوست طارق رحمٰن فضلی اور عرفان احمد کا خصوصی تعاون حاصل نہ ہوتا تو یہ کتاب آج آپ کے ہاتھ میں نہ ہوتی۔

۱۱؍مئی ۲۰۰۰ء

سعادت حسن منٹو احمد ندیم قاسمی انتظار حسین شیخ ایاز احمد فراز کشور ناہید
ضیاء جالندھری حبیب جالب شان الحق حقی فہمیدہ ریاض اسد محمد خاں
ڈاکٹر اسلم فرخی حسن منظر محمد سلیم الرحمان امر جلیل زاہدہ حنا
انور احسن صدیقی رحمت اللہ مانجھوٹھی سوزوکی تاکیشی خلیق ابراہیم خلیق
سحر انصاری محسن بھوپالی ہلال نقوی شاہد نقوی مسلم شمیم محسن بھوپالی
سعیدہ گزدر حسن عابدی عذرا عباس ن م دانش ذیشان ساحل تنویر چغتائی
مصطفیٰ ارباب علی محمد فرشی عثمان قاضی رحیم بخش آزاد زاہد حسن
حارث خلیق عطیہ داؤد شاہ محمد پیرزادہ ڈاکٹر شیر شاہ سید فردوس حیدر
صبا اکرام مبین مرزا محسن حامد طاہر آفریدی گوہر ملک آصف فرخی ضمیر نیازی

# زمین کا نوحہ

PRICE Rs. 200/-